جوھر جوشاندہ
EXTRA STRENGTH
دور رکھے...
زکام، کھانسی، نزلہ!
آپ بھی عادت بنالیں!
Dr. Uffaira Anis Saad
Nutritionist
www.qarshi.com
JoharJoshandaOfficial
www.qarshihealthshop.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 51 • شمارہ 11 نومبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021)35895313 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ
... جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ...

بوجھ بنتے چلے گئے۔ انجم فاروق ساحلی کی "ڈبے کا راز" کچھ خاص نہیں لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر "مہدی سوڈانی" میں انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی شخصیت مہدی سوڈانی کے حالات زندگی پڑھنے کو ملے۔ اچھی تحریر تھی۔ رزق اور نصیب کے مابین پُراسرار اور عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال شبیہ گل کی تحریر "ابتلا" میں پڑھنے کو ملا۔ اچھی تحریر تھی۔ مکر و فریب کے جال میں پھنسنے والی حسینہ کے عجیب و غریب انتقام کی کہانی نشور ہادی کی تحریر "پلان بی" میں پڑھنے کو ملی۔ تحریر پسند آئی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب بھی خوب رہا۔ کترنیں بھی پسند آئیں۔ مجموعی طور پر ماہ اکتوبر کا پرچہ بہترین رہا۔"

⊕ مہتاب احمد حیدرآباد سے چلے آ رہے ہیں۔ "اس ماہ کا سسپنس ہاتھوں میں آیا تو ٹائٹل حسینہ کے خوبرو چہرے کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے مبہوت ہو گئے۔ ساتھ میں گلاب کا پھول۔ مصور نے کیا خوب امتزاج پیدا کیا ہے۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ اس کے بعد فہرست پر نگاہ دوڑائی اور ذہن میں کہانیوں کو ترتیب دیا کہ پہلے کون کون سی کہانیاں پڑھنی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے صرف اتنی گزارش کریں گے کہ کچھ عرصے سے فہرست میں طاہر مغل کا نام نظر نہیں آ رہا۔ برائے مہربانی ان کی کوئی کہانی شائع کریں کیونکہ لوگ انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کی کہانی میں کچھ جادو سا اثر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہے اور خود کو کہانی کا کردار ہی سمجھتا ہے۔ سب سے پہلے "شہ زور" پڑھی۔ زبردست جا رہی ہے۔ معاذ کی مشکلات کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔ سونیا نے بھی تنظیم سے بغاوت کر دی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد "جنگ باز" پر پہنچے۔ کہانی میں ایکشن تو ہے لیکن کہانی وہ مزہ نہیں دے رہی جو ایک سلسلے وار کہانی کا خاصہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کہانی مضبوط ہو جائے۔ پھر پہنچے نشور ہادی کی "پلان بی" پر۔ کہانی ٹھیک لگی۔ اتنا مزہ نہ آیا پڑھ کر۔ چھوٹی کہانیوں میں توانا معذور، احسان، آخری قتل عمدہ کہانیاں تھیں۔ مرزا امجد بیگ کی "زنگار" اچھی تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی "عشق و ستاں" پڑھ کر تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ عمدہ انداز تھا۔ ویلڈن۔ کترنیں اچھی لگیں۔ محفل شعر و سخن نے بھی محظوظ کیا۔ مجموعی طور پر رسالہ عمدہ تھا۔"

⊕ ملک وحید کا مختصر خط کراچی سے۔ "ماہ اکتوبر کا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ اچھا لگا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی "جنگ باز" سسپنس اور مار دھاڑ سے بھرپور واقعات کے ساتھ جاری ہے۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اے آر راجپوت کی کہانی "عشق و ستاں" تاریخ کے آئینے میں لکھی گئی اچھی تحریر تھی۔ خالد شیخ طاہری کی کہانی "آخری قتل" بھی پسند آئی۔ عائشہ نصیر کی کہانی "احسان" کچھ خاص نہیں لگی۔ مرزا امجد بیگ کی "زنگار" بہترین کہانی تھی۔ عیوق بخاری کی "توانا معذور" پسند آئی۔ فاطمہ حسام کی تحریر "تماشا گاہ" بہترین رہی۔ انجم فاروق ساحلی کی "ڈبے کا راز" اچھی تحریر تھی، پسند آئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر "مہدی سوڈانی" اچھی تحریر تھی۔ شبیہ گل کی تحریر "ابتلا" کچھ خاص نہیں لگی۔ نشور ہادی کی تحریر "پلان بی" اچھی کہانی تھی۔ پسند آئی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب بہترین رہا۔"

⊕ امجد اقبال خان کی خوشی ساہیوال سے۔ "یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ تقریباً تمام مختصر کہانیاں عمدہ ہیں۔ معیاری مختصر کہانیوں کے انتخاب کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سلسلہ وار کہانیوں میں "شہ زور" بہتر جا رہی ہے۔ اگرچہ یہ کہانی بے تحاشا اتار چڑھاؤ کا شکار رہی ہے اور کئی دفعہ اس نے مایوس بھی کیا ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ یہ کہانی لڑکھڑا کر پھر سنبھل جاتی ہے۔ جہاں تک بات ہے "جنگ باز" کی تو سوری تو سے...... یہ کہانی پہلی قسط ہی سے مایوس کر رہی ہے۔ انتہائی بورنگ اور فضول کہانی ہے۔ اس لیے آئندہ ماہ سے اس کہانی کو نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاریخی کہانی اس بار بھی منفرد ہے۔ مشورہ ہے کہ تاریخی کہانیاں صرف ایک ہی لکھاری سے ہر ماہ لکھوانے کے بجائے مختلف اہل قلم سے لکھوائیں۔ جیسا کہ اس ماہ لکھوائی گئی ہے۔ مزاح ناپید ہو چکا ہے سسپنس سے۔ اس کے لیے بھی کچھ کریں۔"

⊕ نامعلوم مقام سے ابراہیم مجید گزشتہ سے گزشتہ شمارے پر دلچسپ تبصرہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ "ستمبر کا ماہنامہ بروقت موصول ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ اس دفعہ سرورق پر بلوری آنکھیں اور حجاب۔ کیا خوب امتزاج ہے۔ جون ایلیا بہت دردمند اور سچ لکھتے ہیں۔ پتھریلی، کھردری جگہ پر خوبصورت الفاظ۔ یہ سب تو اپنی جگہ مگر اس وقت تو یہ عذاب جو سیلاب کی شکل میں آیا ہے، بہت مشکل وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میری ناراضی کی نشانی یہ ہے کہ موسم کے ذریعے دیتا ہوں۔ بے وقت موسم، خشک سالی کا سیلاب، یہ عذاب الٰہی ہے لیکن امیر حکمران مصیبت میں ملک سے باہر ٹھکانا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہم سب کو عذاب سے توبہ کرنے کا وقت ہے۔ اللہ سب کو معاف کرنے والا ہے۔ خط تفصیلی اور مکمل لکھنا ہوتا ہے لیکن دن بھر میں 12 سے 13 گھنٹے بجلی کی لوڈشیڈنگ، پورا دن بلکہ رات گئے تک۔ ذہن ماؤف۔ دل برداشتہ، اپنی تحریر جو ان حالات میں لکھتے ہیں، پڑھ کر خود مزہ نہیں دیتی۔ تشنگی سی رہتی ہے۔ نہ لکھیں مگر اس محفل سے دور رہنے کے لیے "دل ہے کہ مانتا نہیں"۔ اس دفعہ بھی محفل آذین رضوان بھی ہمارے کورنگی سے ہیں۔ تبصرہ بہت مدلل اور عمدہ ہے۔ کہانیوں میں "گمشدہ" ملک صفدر کی بات کی جائے۔ یہ اپنوں کی ہوس اور بے راہ روی جس میں اپنے ہی بھائی کا خون اس بے دردی سے لیکن اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس نے انسپکٹر کے روپ میں کیسا انجام کیا۔ "عتاب آب" تاریخ کے وہ صفحات جو ہم نہ پڑھ سکے، وہ سب اس مضمون کے پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوا اور مزہ بھی آیا۔ "رونگ نمبر" فون پر دھوکے بازی عام ہے۔ اب ہمارا ملک بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ جہاں آدمی اپنی حد سے باہر ہو کر گناہ کی طرف بڑھ جاتا تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جہاں فون ضرورت ہے، وہاں فریب اور گناہ کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ "سرنگ میں" ماورائی کہانیوں میں ایک اچھی کہانی۔ یہ جن بھوتوں کی نہیں بلکہ ایک شخص کی ذہنی کہانی یا کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک کوفت اور پشیمانی جو اس شخص نے اپنے اوپر طاری کر لی اور اس کا اظہار ایک شخص کو گواہ بنا گیا۔ ایک اچھوتی کہانی لیکن پڑھنے اور سمجھنے کے لیے۔ "تماشا گاہ عالم" یہ دنیا ہمیشہ ہی امیر، غریب، بادشاہ اور رعایا کے اوپر قائم ہے۔ یہ کارخانۂ قدرت ہے۔ یہ ایک آزمائش ہے۔ اس کہانی میں دولت مند کی عیاشی اور پڑوسی کی غربت اور محرومی کا بڑا تال میل بہت عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ "جنگ باز" بہت لاجواب داستان۔ بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کہاں سے شروع ہوئی کہاں پہنچ گئی۔ غریب آبادی سے نکل کر پورے پاکستان پر چھا گئی۔ طوالت بہت ہو گئی لیکن لکھاری ڈاکٹر عبدالرب کے قلم کا جادو کہانی سے نظر ہٹنے نہیں دیتا ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا عمدہ تال میل ہے۔ "انگوٹھی" بڑی عمدہ کہانی۔ غیر ارادی طور پر پھنس جانے والے شخص کی حیرت انگیز چالاکی۔ ایک معمولی انگوٹھی سے مصیبت میں پھنس جانے اور اسی انگوٹھی کی وجہ سے بچ جانے والی دلچسپ داستان۔ بہت اچھی لگی۔ "انہونی" تقسیم پاکستان و ہندوستان کے وقت کی ہزاروں داستانوں میں سے ایک دلدوز داستان۔ پڑھ کر دل مغموم ہو گیا۔ اس دفعہ کا شمارہ اور اس کے چیدہ چیدہ مضامین۔ کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ کاوش صدیقی نے بڑی کاوش سے "مجھے چاندنی نواز دو" لکھ دی۔ بہترین کہانی بلکہ یادگار رہنے والی بہترین کہانی۔ جملوں کا چناؤ بہت ہی عمدہ۔ آخری پیرا تو جان ہے۔ اشعار کی محفل بھی اچھی رہی۔ دوستوں کے خطوط بھی دل سے لکھے گئے۔ سیلاب کی تباہ کاری پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مہنگائی نے ہم پر مکمل قابو پا لیا ہے۔ اس پر کچھ بھی لکھنا بے سود ہے۔ ہم زندہ ہیں پر بہت شرمندہ ہیں۔ اللہ نے ہم پر ظالم حکمران مسلط کر دیے ہیں۔ یہ قوم کی بداعمالیوں کی سزا ہے جس کا اللہ نے قرآن میں اشارہ فرمایا ہے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
سکان علی، سکھر۔ غلام حسین، لیہ۔ اسامہ خان، نواب شاہ۔ اشعر علی، ملتان۔ عمران احمد، چنیوٹ۔ نادیہ خان، پشاور۔ سنبل، حیدرآباد۔ ریاست علی خان، کوئٹہ۔ ندیم کمال، سبی۔ راجا توقیر، جہلم۔ نورالدین، گوجرانوالہ۔ نرا نعیم، کراچی۔

کارزار الفت

اے آر راجپوت

عشق کے جذبات اتنے اندھے ہوتے ہیں
جنہیں کسی کی بادشاہت یا عسرت...
امیری فقیری... خوبصورتی یا بدصورتی
سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو بس اپنی
ہی روانی میں رواں رہتے ہیں... جیسے یہاں دو
انجانے دلوں کا ایک ہی تال پر دھڑکنا گویا تاریخ
میں رقم کیے جانے والا قصہ بن گیا۔ یہ امتیاز بھی
قسمت والوں کے حصے میں آتا ہے سو... ان کے حصے
میں بھی آگیا... جنگ و جدل کے بادلوں میں گھرنے کے
باوجود فقط ایک لمحے کا نظروں کا ملنا ان کے ملن کا سبب
بن گیا... اگرچہ جانتے تھے کہ کارزار الفت کا یہ سودا
انہیں کتنا مہنگا پڑے گا... اس کے باوجود کوئی پیچھے ہٹنے کو
تیار نہ تھا... یہ اور بات کہ سرپھرے لوگوں کے لیے مہنگا سستا
کچھ نہیں ہوتا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جعفر نے اعظم خان کو فکرمند پایا تو پوچھا۔
''کیا بات ہے آقا! آج آپ پریشان اور فکرمند سے نظر آرہے ہیں؟'' جعفر، اعظم خان کے والد کا غلام تھا۔ اس نے اعظم خان کو اپنی گود میں کھلایا تھا اور اس سے بےحد محبت کرتا تھا۔
''میرا خیال ہے جو ہونے جارہا ہے، وہ ٹھیک نہیں۔'' اعظم خان نے اسی فکرمندی سے کہا۔
''کیا ہونے جارہا ہے آقا؟ کچھ بتائیں تو۔'' جعفر نے سوال کیا۔
''تمہیں نہیں معلوم کہ شاہ جہاں نے شاہی قاصد کو کہاں بھیجا ہے؟''
''معلوم ہے، مگر اس میں فکرمندی کی ایسی کون سی بات ہے۔ یہ تو خیر سگالی کا پیغام ہے۔'' جعفر بولا۔
''نہیں جعفر! تم نہیں سمجھو گے۔ یہ خیر سگالی کا نہیں، درپردہ ایک بہت بڑی گڑبڑ کا پیغام ہے۔''
''گڑبڑ؟ کیسی گڑبڑ آقا؟'' جعفر الجھ کر بولا پھر ذرا ہی معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ ''بلکہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ مالوہ (برہان پور) سے معزز مہمان آرہے ہیں اور ان مہمانوں میں ایک حسین مہمان بھی ہے۔''
جعفر، اعظم خان کے دل کا حال جانتا تھا۔ وہ ایک رازداں تھا۔ بھلا ہوتا بھی کیوں نہ، آخر کو اعظم خان اس کی گود میں کھیلا تھا۔
اس کی بات پر اعظم خان کی چشمِ تصور میں واقعی ایک ''حسین مہمان'' کا چہرہ آ کر رقص کرنے لگا۔ یہ عزیزہ تھی۔ مالوہ کے حاکم خان جہاں کی خوبصورت بیٹی۔
اب اعظم خان، جعفر کو کیا بتاتا کہ اس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی تھی۔
بظاہر یہ واقعی ایک خیر سگالی کا پیغام تھا۔ شاہ جہاں نے چند دن پہلے اپنے وزراء، امراء اور سرداروں سے صلح مشورہ کرنے کے بعد مالوہ اپنا ایک قاصد روانہ کر دیا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ مالوہ کا حاکم اس کے دربار میں مہمان کی حیثیت سے آئے۔
شاہی قاصد جیسے ہی شاہ جہاں کا یہ پیغام لے کر مالوہ کے حاکم خان جہاں کے سامنے پیش ہوا اور شاہ جہاں کا پیغام پڑھ کر سنایا تو اس نے فوراً اسے باعثِ سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔
عزیزہ بھی اپنے دو جوان بھائیوں عظمت خان اور [illegible]

رہ گئی کہ اس کا دل بھی بے طرح دھڑکنے لگا۔
آتشِ الفت برابر لگی ہو تو وہ فرزانوں کو ضرور ملاتی ہے۔ محبت کو وہ آشنا بناتی ہے۔ عزیزہ کی نگاہ خواب میں بھی بہادر، جری اور شریف سپہ سالار اعظم خان کا تصور کرنے لگی۔
گو دونوں دیوانے ایک دوسرے کے دیدار کے لیے ترستے ہوئے تھے تاہم ان کے دلوں میں ایک بےچینی سی گھر کیے دیتی تھی۔ اس کے حسین تصور میں وہ واقعہ گھوم گیا جو ان کی پہلی ملاقات ہی نہیں، پہلی نظر کی محبت کا بھی امین رہا تھا۔
اس وقت اعظم خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہوا دریا کے جنگل کے کنارے جا پہنچا تھا۔ پھر ایک سانبھر کا تعاقب کرتے ہوئے ساتھیوں سے بچھڑا اور حادثے کا شکار ہو کر دریا کے کنارے جا گرا۔
سوئے اتفاق وہیں مالوہ کے حاکم خان جہاں کی بیٹی عزیزہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ سیر و تفریح کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔ اس نے جو ایک بانکے سجیلے نوجوان کو زخمی اور بےہوش ہو کر دریا میں گرتے دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے گھوڑے سمیت دریا میں کود گئی۔
وہی اسے بچا کر دوسرے کنارے پر لائی۔ اعظم خان کو چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بےہوش تھا۔ وہ اسے اپنے محل میں لے آئی۔
تھوڑی دیر بعد ہی اعظم خان کو ہوش آگیا۔ اس نے ایک ماہ لقا کو اپنے سامنے پایا۔ وہ مسکراتا اور حسین چہرہ اس کی تیمارداری میں مصروف تھا۔
''میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''آپ بالکل خیریت سے اور ٹھیک جگہ پر ہیں۔'' عزیزہ نے مسکرا کر کہا۔ وہ غور سے اس پیکرِ وجاہت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی گہرائی میں کچھ ایسا تھا جسے اعظم خان نے صاف محسوس کیا تھا۔ اب وہ بھی مسکرا کر بولا۔
''اتنی تو مجھے بھی تسلی ہے کہ میں کم از کم دشمنوں کے درمیان نہیں ہوں۔''
''تو کیا آپ جنگ پر نکلے تھے؟'' عزیزہ نے شوخی سے پوچھا۔
''شکار پر نکلا تھا۔ ایک سانبھر دکھائی دیا اور قابو نہیں آ رہا تھا۔ بس اس کے تعاقب میں۔۔۔''
''یہاں تک آن پہنچے۔'' عزیزہ نے جیسے اس کا جملہ مکمل کیا۔ [illegible]

دونوں کے درمیان تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک دل نشین سا ماحول بن گیا تھا۔ ایسا ماحول جسے پہلی ملاقات اور پہلی نگاہ سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔
دونوں ہی ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ جی سیر ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسی وقت ایک غلام نے آ کر مطلع کیا۔
''آقا اس نوجوان کی طبیعت اور خیریت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔''
''ابا جان سے کہو ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔'' عزیزہ نے غلام سے کہا۔ وہ واپس لوٹ گیا۔
''جی جی۔ اب ابا حضور کے ہاں چلتی ہے۔'' مسکرا کر بولی۔ اعظم خان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی گوشۂ عافیت میں رہے۔ اس حسینِ دلربا پری پیکر کو نگاہوں سے اوجھل بھی نہ ہونے دے، مگر مجبوری تھی۔
وہ اٹھا۔ دونوں حاکم مالوہ خان جہاں کے سامنے پیش ہو گئے۔ اعظم خان نے باادب سلام کیا اور اپنے بارے میں بتایا۔ عزیزہ کے دونوں بھائی عظمت خان اور حسین خان بھی وہاں موجود تھے۔
والد اور بیٹے یہ جان کر خوش ہوئے تھے کہ اعظم خان کا تعلق شاہ جہاں کی افواج سے تھا اور وہاں وہ ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔
یوں ان کی ملاقاتیں پروان چڑھنے لگیں۔
بہرکیف، اگر آج شاہ جہاں کا قاصد مالوہ کی طرف مہمان داری کا پیغام لے کر گیا تھا تو اعظم خان کے خوش ہونے کے بجائے پریشانی کی ایک ٹھوس وجہ تھی۔
یہ پیغام جسے بظاہر خیر سگالی کا پیغام کہا جا رہا تھا، درحقیقت اس وقت بنایا گیا تھا جب اس سے دو روز قبل ہی دربار میں شاہ جہاں اپنی ایک خصوصی نشست میں اپنے امراء، وزراء اور سرداروں کے ساتھ آس پاس کی کمزور ریاستوں میں اپنی عمل داری کے سلسلے میں صلح مشورے کر رہا تھا۔ ان میں فوج کے چند سالار بھی تھے جن میں خود اعظم خان بھی تھا۔ اسی لیے اسے دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا تھا۔
خیر، مالوہ کا حاکم خان جہاں اپنے تین جواں سال بچوں عظمت خان، حسین خان اور عزیزہ کے ہمراہ شاہی محل پہنچا تو ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔
عزیزہ کی بےتاب نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں اور [illegible]

کا بےچینی سے منتظر تھا۔
''تمہیں میرے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی؟'' عزیزہ نے اعظم خان کو خلافِ توقع فکرمند پا کر پوچھا۔
''تم میری دنیا ہو، میرا جہاں ہو عزیزہ! میری پہلی اور آخری خوشی ہو تم۔'' اعظم خان فرطِ جذبات سے بولا۔
''تو پھر مجھے دیکھ کر یہ زردی اور تفکر کیسا؟'' عزیزہ نے اپنی گھنیری پلکیں جھپکا کر سوال کیا۔
''مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ محض میرا وہم ہو۔''
''اس سے زیادہ ملنے والی مسرت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' وہ دل نشیں مسکراہٹ سے بولی۔
''کاش! یہ وہم ہی ہو۔'' اعظم نے ہولے سے کہا۔
''یہی ہوگا۔ اب ذرا ایک خوشی کی خبر تو سن لو۔'' عزیزہ نے اٹھلا کر کہا۔
''کیسی خوشی کی خبر؟'' اعظم خان نے چونک کر اس کے حسین چہرے پر نظر ڈالی تو عزیزہ نے سرخ پڑتے چہرے سے بتایا۔
''ابا جان آپ کو میرے لیے پسند کرنے لگے ہیں۔'' اعظم خان کو وقت نے اس لیے ڈس لیا تھا جب اسے کسی خطرے کی بو محسوس ہوئی تھی ورنہ اس کے لیے یہ خوشی کی خبر ہی تھی۔

☆☆☆

اگلے ہی دن اعظم خان کو اپنی نامعلوم اور تشویش آمیز بےچینی کا پتا چل گیا جب ایک بھرے دربار میں عظمت خان نے ایک معزز شاہی عرض بیگی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔
دراصل عرض بیگی نے مالوہ کے حاکم خان جہاں کے جواں سال بڑے بیٹے عظمت خان کے سامنے یہ کہہ دیا تھا کہ بہت جلد مالوہ ہمارے قبضے میں آنے والا ہے۔ اسی لیے ابھی سے ہماری اطاعت تسلیم کر لینے میں ہی مصلحت اندیشی اور دانشمندی ہے۔
''جری، جنگجو اور باغیرت قوم اپنے لہو سے اپنے وطن کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کا سودا نہیں کیا کرتی۔'' عظمت خان نے نہایت غصے اور طیش میں آ کر جواب دیا تھا اور ایک تھپڑ بھی جڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ عرض بیگی کیا، کوئی بھی شاہی فوجی افسر دوبارہ مالوہ کے بارے میں ایسی کسی بات کی

یہ گویا موقع فراہم کرنے والی بات تھی۔۔۔ سستا نگ ت پہنچی تو اس نے بھی اپنے شاہی درباری کی حاشیہ میں یہ بات کہہ ڈالی کہ مالوہ کو ولی نعمت کی عملداری میں دے دیا جائے۔

پھر تو جیسے طوفان کھڑا ہو گیا۔ مالوہ کا حاکم خان جہاں غصے میں بھر گیا۔ میزبان اور مہمان دشمن بن کر اس روز جدا ہوئے۔ خان جہاں کو شاہ جہاں نے باغی کہا اور دربار میں ذلیل کر ڈالا۔

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد شاہی لشکر نے مالوہ کے خلاف طبل جنگ بجا دیا۔

☆☆☆

شاہی لشکر کو مالوہ ۔۔ کی طرف روانہ کرنے کے بعد اعظم خان ایک درخت کے سہارے پریشان کھڑا رہ گیا۔ وہ گھبرایا ہوا ہر طرف نظریں اٹھاتا۔ شاید وہ کسی اہم نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر وہ کھڑا سوچتا رہا اور پھر اپنے مکان کی طرف چل دیا۔

یوں جعفر نے اعظم خان کو لشکر میں پا کر کہا۔

''آج آپ اداس کیوں ہیں میرے آقا؟''

جواب میں اعظم خان نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''میں نہ کہتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دیکھو جعفر! مجھ پر آج ایک آزمائش کا وقت آن پڑا ہے اور اس کے لیے قربانیوں کی ضرورت ہے۔''

یہ سن کر جعفر ۔۔۔ نے جنبش بولا۔ ''بندہ حاضر ہے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس حکم کیجیے۔'' یہ کہتے ہوئے جعفر کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔

''ہاں جعفر! تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔'' اعظم خان نے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''تم ایسا کرو کہ فوراً برہان پور روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایک خط لکھ کر دیتا ہوں۔ یہ خط خان جہاں کے ہاتھوں میں دینا۔ تم راستے میں کہیں نہ ٹھہرنا کیونکہ شاہی لشکر اس کے تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤ۔''

اعظم خان نے اسے بڑی صراحت سے سمجھاتے ہوئے مزید کہا۔ ''۔۔۔ سنو، تمہیں وہاں تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ ہونے پائے۔'' کہتے ہوئے اعظم خان نے بڑے ۔۔۔ انداز ۔۔۔ میں جعفر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ فدویانہ لہجے میں خم ہو کے بولا۔

''جیسا آپ کا حکم آقا! آپ خط لکھ دیں۔ میں تب تک روانگی کی تیاری کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

[illegible] ایک ریشمی رومال میں لپیٹ کر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب جعفر روانہ ہونے کے لیے تیار ہو کر آیا تو اعظم خان اسے خط دے کر بولا۔

''یاد رکھو جعفر! لشکر تمہیں نہ دیکھنے پائے۔''

''آپ اطمینان رکھیں آقا!'' جعفر نے اطمینان دلایا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

عرش بیگ نے بھی اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جس وقت ارادت خان مالوہ کے حاکم خان جہاں کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر لے کر روانہ ہو رہا تھا، اس نے اپنے دو خاص جری سپاہیوں ملوک اور شاہی کو خاص انعام کا لالچ اور ہدایت دے کر شامل کیا تھا کہ وہ اس جنگ میں کسی کو ہلاک کریں نہ کریں، خان جہاں کے بڑے بیٹے عظمت خان کو ضرور مار ڈالیں۔

ان دونوں سپاہیوں نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

ادھر خان جہاں آگرہ سے نکل کر تیز رفتاری سے مالوہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شاہ جہاں اس سے ضرور انتقام لے گا اور اس کے تعاقب میں ایک بھاری لشکر روانہ کرے گا۔ اس لیے وہ جلد از جلد برہان پور پہنچ کر خاطر خواہ تیاری کرنا چاہتا تھا۔

یوں وہ برابر آگے بڑھتا رہا مگر دریائے چنبل کے کنارے آ کر اسے ٹھہرنا پڑا کیونکہ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے دریا میں طغیانی تھی۔ دریا میں کوئی کشتی بھی نہیں تھی۔ پل پہلے ہی سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ وہ گھوڑے سے اترا۔ اسے اترتا دیکھ کر عظمت خان، حسین خان اور عزیزہ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور پھر سارے لشکر کو اترنا پڑا۔

خان جہاں نے اپنے بیٹے عظمت خان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''فرزند اب ہم دریا کو کس طرح عبور کر سکتے ہیں؟''

عظمت خان نے جواب میں باادب کہا۔ ''ابا حضور! دریا گھوڑوں سے تو عبور نہیں کیا جا سکتا۔''

''تو پھر؟'' باپ نے بیٹے کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''ابا حضور! میں نے ٹھیک کہا۔ اگرچہ ہمارا برہان پور پہنچنا بھی بے حد ضروری ہے۔'' عظمت خان بولا۔ ''اور ہمارے لیے ایک ایک لمحہ بھی قیمتی ہے مگر بات وہی ہے کہ ایک حالت میں کیا کیا جا سکتا ہے۔'' عظمت خان مایوس

لہجے میں یہ کہہ کر خاموش ہوا پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ آج کی رات تو یہیں گزار لیتے ہیں لیکن ہے صبح تک طغیانی کچھ کم ہو جائے۔'' اس نے اپنی بات ختم کی تو عزیزہ بولی۔

''یہ مناسب ہے۔'' خان جہاں نے کہا پھر بیٹے کو ہدایت دی۔ ''تم جاؤ بیٹے حسین ۔۔۔ اور لشکر والوں کو بتا دو کہ رات یہیں گزارنی ہے لیکن وہ ہوشیار رہیں اور چند سواروں کو پڑاؤ کی نگرانی پر مقرر کر دو۔'' حسین چلا گیا۔

اب سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جانے لگا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریائے چنبل کے کنارے ایک شہر سا آباد ہو گیا۔ یہاں درندے بھی خوف کی وجہ سے بھی پانی پینے نہیں آتے تھے۔ آج وہاں ہر طرف روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ناگاہ پہاڑی کے دامن سے گرد اٹھتی ہوئی دکھائی دی۔ سارے لشکر کی نظریں اسی سمت کو اٹھ گئیں۔

سپاہیوں نے غور سے دیکھا تو ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا اسی طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹاپوں کی آواز سن کر خان جہاں، عظمت خان، حسین خان اور عزیزہ بھی اپنے خیمے سے باہر آ گئے۔

پڑاؤ کے نزدیک پہنچ کر سوار نے اپنے گھوڑے کی رفتار سست کر دی۔ وہ شاید شاہی خیمہ پہچاننے کی سعی کر رہا تھا۔

خان جہاں نے رومال ہلایا اور اجنبی سوار اسی طرف چل پڑا۔ اب وہ لشکر کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ سارے لشکر کی نگاہیں اجنبی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر سپاہی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اجنبی سوار اب شاہی خیمے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ پہریدار اسے قریب آتا دیکھ کر آگے بڑھا اور گھوڑے کی لگام پکڑی۔ سوار گھوڑے سے نیچے اتر پڑا اور بڑھ کر خان جہاں کو سلام کیا۔

خان جہاں نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

اجنبی سوار نے جواب میں باادب کہا۔ ''میں آگرہ سے آ رہا ہوں۔ مجھے اعظم خان سپہ سالار نے آپ کی خدمت میں یہ خط دے کر بھیجا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے خط نکالا۔

اعظم خان کا نام سنتے ہی عزیزہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر یکدم شگفتگی آ گئی۔

خان جہاں نے سوار کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

''شاہی لشکر تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔ شاہی لشکر کا سردار ارادت خان ہے۔ ویسے میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے لیکن پھر بھی خیر ہی ہوتا ہے۔ اس سے کسی قسم کی امید نہیں کی جا سکتی۔ آپ سے ہو سکے تو قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ناکام و نامراد واپس جائے گا۔''

خان جہاں نے خط پڑھنے کے بعد عزیزہ کو دے دیا۔ یوں بھی اس کی پُراشتیاق نگاہ بار بار خط پر جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہی تحریر وہ عمر بھر دیکھا کیے رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس تحریر کو حرف زبان بنا کر اپنے سینے سے لگائے رکھے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد خان جہاں نے پوچھا۔ ''شاہی لشکر کب روانہ ہوا ہے؟''

''پرسوں ۔۔۔ میں لشکر کی روانگی کے بعد ہی آگرہ سے چلا تھا۔ وہ عنقریب یہاں پہنچنے والا ہی ہوگا۔'' اجنبی جو جعفر ہی تھا، نے مختصر اً صراحت بتائی۔

''اچھا اب تم جا کر ذرا آرام کرو۔'' خان جہاں نے کہا۔

جعفر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں سردار! میں مجبور ہوں اور اسی وقت واپس جانا چاہتا ہوں۔ میرے آقا میرا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔''

خان جہاں نے قدرے تفکر سے جعفر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اندھیاری رات ہے پھر تم ان راستوں سے بھی ناواقف ہو۔ اس لیے یہی مناسب ہے کہ آج رات یہیں آرام کرو۔ صبح ہوتے ہی روانہ ہو جانا۔''

جعفر نے کہا۔ ''مجھے قیام کرنے پر مجبور نہ کیجیے سردار! میں کسی بھی صورت میں نہیں ٹھہر سکتا۔''

اب آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ پہاڑی نشیب سے ایک سوار تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ خان جہاں اور عزیزہ کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ آسمان پر ستارے البتہ چمک رہے تھے۔

سوار رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن عزیزہ کی نگاہیں ابھی تک اسی طرف تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر نے لگے۔

یوں خان جہاں، اس کے بیٹوں اور عزیزہ نے ساری رات اضطراب مسلسل میں گزار دی۔ صبح ہوتے ہی عظمت اپنے والد کے خیمے میں آیا۔

عظمت سلام کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ اسے شاید اپنے والد سے مشورہ کرنا تھا۔ آخر اس نے سوال کیا۔
"ابا جان! اگر دشمن پہنچ جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
باپ نے بیٹے کا چہرہ دیکھا اور بولا۔ "ہاں، فرزند! خدا کا شکر ہے کہ ہمیں وقت سے پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ شاہی لشکر ہمارے تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا ورنہ بے خبری میں خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔"
"ہاں، ابا جان! سردار اعظم خان نے اس سلسلے میں ہماری بڑی مدد کی ہے۔" عظمت بولا۔
ایک دو لمحہ سکوت کے بعد خان جہاں نے کہا۔ "اگر بعض سیاسی پیچیدگیاں نہ ہوتیں تو میں ضرور عزیزہ کی شادی اعظم خان کے ساتھ کر دیتا۔ وہ بڑا بہادر اور شریف نوجوان ہے۔"
خان جہاں نے جیسے ہی اپنا جملہ مکمل کیا حسین اور عزیزہ خیمے میں داخل ہوئے۔ خان جہاں انہیں آتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ دونوں نے باپ کو سلام کیا اور خاموشی سے عظمت خان کے پاس بیٹھ گئے۔ عزیزہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ساری رات روتی رہی تھی۔
خان جہاں اس کی اداسی کا سبب جانتا تھا اس لیے اس نے موضوع بدلتے ہوئے حسین سے پوچھا۔ "بیٹے! دریا کا کیا رنگ ہے؟"
"ابھی تک وہی کیفیت ہے ابا جان!" حسین نے جواب دیا اور آگے بولا۔ "بلکہ پانی اور چڑھ گیا ہے۔"
"اگر یہ کیفیت ہے تو ہم دریا عبور نہیں کر سکتے۔ تم لشکر کو تقسیم کر دو۔" خان جہاں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ ایک سپاہی گھبرایا ہوا آیا اور بولا۔
"حضور! دشمن کا لشکر سر پر آن پہنچا ہے۔"
عظمت خان نے حیران ہوتے ہوئے سپاہی کی طرف دیکھا۔
"گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عظمت! تم جاؤ اور لشکر کو تیار کرو۔ ہمیں ہر صورت میں دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔" خان جہاں نے عظمت کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
اپنے والد کی ہدایت پر عظمت خان اور حسین خیمے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

خان جہاں کا لشکر پہلے ہی سے مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ شاہی لشکر کو دیکھ کر اس پر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔
[illegible]
[illegible] رہا تھا۔

عزیزہ، عظمت اور حسین برابر دشمن پر حملے کر رہے تھے۔ میدان جنگ لاشوں سے پٹ گیا تھا اور بڑا گھمسان کا رن تھا۔
شاہی لشکر سفر کی وجہ سے نڈھال تھا اور مغل سپاہی ابھی آرام بھی نہ کر پائے تھے کہ انہیں جنگ میں جھونک دیا گیا تھا لہٰذا وہ خان جہاں کے لشکر کے اچانک اور شدید حملوں کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے۔
اب سورج غروب ہو رہا تھا اور فضا تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ یوں رات ہوتے ہی دونوں لشکر اپنے اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ گئے اور جنگ کا فیصلہ آنے والے کل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔
شاہی لشکر کے دس ہزار سپاہیوں میں سے بیشتر کام آ چکے تھے۔ رات کی تاریکی میں ہر طرف آگ روشن تھی۔ خان جہاں نے نماز سے فارغ ہو کر عظمت کو بلا کر کہا۔
"بیٹے! یہ غفلت کا وقت نہیں ہے۔ اس نازک وقت میں دشمن ہر مکر و فریب سے کام لے گا۔ اپنے لشکر کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر دو اور رات کو تم خود بھی نگرانی کرتے رہو۔"
"بہت بہتر ابا جان.....!" عظمت خان نے سعادت مندی سے کہا اور باہر چلا گیا۔
اب میدان میں ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خان جہاں اس وقت بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ گو آج تک کی جنگ میں اس کا پلہ بھاری رہا تھا مگر اس کے سپاہی گھبرا گئے تھے۔ پھر مغلوں کو مزید کمک ملنے کا بھی امکان تھا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا انجام بہت خراب ہوگا۔
اس وقت اس کے پاس کل دو ہزار سپاہی باقی بچے تھے۔ تین ہزار آج کی لڑائی میں کام آ چکے تھے۔ وہ انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اذان کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ اٹھا اور وضو کر کے..... نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھا عظمت کے خیمے میں پہنچا اور اسے بیدار کیا۔ وہ جب نماز پڑھ چکا تو خان جہاں نے پوچھا۔
"بیٹے! لشکر والوں کے حوصلوں کا کیا عالم ہے؟"
"ابا جان! ان کے حوصلے بلند ہیں۔" عظمت نے جواب دیا۔
"اللہ کا شکر ہے۔ اچھا، اب تم جا کر لشکر کو باہر نکالو اور میرے پہنچنے کا انتظار کرو۔"
یہ کہہ کر خان جہاں اپنے خیمے میں واپس آ گیا اور عظمت لشکر کی طرف روانہ ہو گیا۔
[illegible] لشکر [illegible] اور جب سارا لشکر

میدان میں جمع ہو گیا تو طبل جنگ بجانے کا حکم دیا۔ طبل جنگ کی آواز نے لشکر میں ایک نئی روح پھونک دی۔
اتنے میں خان جہاں بھی پہنچ گیا۔ اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اپنا گھوڑا میدان جنگ کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔ لشکر والوں نے جب یہ دیکھا تو وہ بھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور میدان جنگ میں کود پڑے۔ مغل لشکر ان کے انتظار میں تیار کھڑا تھا۔
ادھر عزیزہ بھی اپنا گھوڑا بڑھاتی ہوئی میدان جنگ کی طرف بڑھی تھی پھر وہ اپنے والد کے قریب پہنچ کر بولی۔
"ابا جان! ہمارے لیے یہ وقت بڑا نازک ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی جان بچا کر بھاگ نکلیں۔ ہم دشمنوں کو روکتے ہیں اور آپ اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیجیے۔ آپ کا دریا عبور کرنا از بس ضروری ہے تاکہ برہان پور پہنچ کر مغلوں کے مقابلے کے لیے لشکر کو تیار کر سکیں۔"
خان جہاں کو اپنی بیٹی کی یہ تجویز پسند آئی۔ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کا برہان پور پہنچنا کس قدر ضروری ہے لہٰذا اس نے ایک نظر عزیزہ پر ڈالی اور ایڑ لگا کر اپنا گھوڑا دریائے چمبل کی لہروں میں ڈال دیا۔
اس کا لشکر پہلے ہی سے شکستہ حال تھا۔ اپنے سردار کو دریا میں کودتے دیکھ کر لشکر والے بھی لہروں میں تیرنے لگے۔ صرف چند جاں نثاروں کے ساتھ حسین خان دشمن کو روکے رہا۔
عزیزہ بھی میدان جنگ کی طرف بڑھی اور سہمے ہوئے سپاہیوں کو جوش دلا کر دشمن پر حملہ کرنے کی ترغیب دی لیکن اب نقشۂ جنگ اور پانسۂ جنگ پلٹ چکا تھا۔
طوک اور شاہی بدستور عظمت خان کے تعاقب میں تھے۔ وہ لڑتے لڑتے بالآخر اس کے گھوڑے کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ تھک کر سب ہی چور ہو رہے تھے لیکن مکار عرش بیگی نے ان دونوں کو یہی ہدایت کی تھی کہ انہوں نے صرف عظمت خان کو ہلاک کرنے میں اپنی توانائی کا مظاہرہ کرنا ہے اسی لیے وہ دونوں تازہ دم تھے۔
انہوں نے عظمت کے گھوڑے کو گھیرے میں لے لیا۔ عظمت اس وقت بڑی بہادری اور جرأت کے ساتھ دشمنوں پر اپنی تلوار سے ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ جب ہی طوک اور شاہی یک لخت اس پر عقب سے ٹوٹ پڑے۔
شاہی نے تلوار کا ایک وار کیا۔ عقب سے وار میں بہادر بھی ڈھے جاتے ہیں، سو وہی حال جری اور جنگجو عظمت
[illegible]

پھوٹ کر گر پڑی۔
ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شاہی نے اپنے نیزے سے عقب سے حملہ کیا۔ نیزہ عظمت کے پہلو میں گھسا اور وہ اپنے ہی گھوڑے پر جان کنی کے عالم میں ڈولنے لگا۔
ادھر عزیزہ نے حسین خان کو بھی دریا عبور کرنے کا مشورہ دیا اور خود اپنے چند سواروں کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑی۔ جب خان جہاں دریا کے پار پہنچ گیا تو عزیزہ بھی اپنے سواروں کو ساتھ لے کر دریا میں کود پڑی۔
خان جہاں، حسین خان اور عزیزہ اپنے سواروں کے ساتھ دوسرے کنارے پر جا رکے۔ انہوں نے دشمن کو دیکھا اور سامنے برہان پور کی بلند اور عالیشان عمارتوں پر نظر ڈالی اور [illegible]
اب شام ہو چکی تھی۔ خان جہاں اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر قلعے کی طرف بڑھا اور مغل لشکر اپنے شکار کو حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔
اس جنگ میں شاہی لشکر کا سپہ سالار ارادت خان بھی مارا جا چکا تھا۔ اسے عزیزہ اور حسین خان نے ہلاک کیا تھا لہٰذا شاہی لشکر کی باگ اب دوسرے سالار نیابت خان کے سپرد تھی۔

☆☆☆

شاہ جہاں اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ سارے امراء اور وزیر حسب مراتب سرنگوں بیٹھے تھے۔ شاہ جہاں آج بے حد فکر مند اور اداس تھا۔ وہ پریشان تھا کیونکہ ارادت خان کو گئے ہوئے تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا لیکن اس کی اب تک خیر و عافیت معلوم نہ ہو سکی تھی اور نہ ہی یہ معلوم ہوا تھا کہ خان جہاں کا کیا ہوا؟
شاہ جہاں نے دربار پر ایک نظر ڈالی اور آصف جاہ سے مخاطب ہو کر بولا۔
"آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟"
"ہم حضور کے اک اشارۂ جنبش پر اپنی جانیں نثار کرنے پر تیار ہیں۔" آصف جاہ نے ادب سے جواب دیا۔
"یہ سب باتیں ہیں۔ جب تم اب تک ایک باغی سردار کو گرفتار نہ کر سکے تو آئندہ تم سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے؟" شاہ جہاں نے کہا۔
"آپ اطمینان رکھیں جہاں پناہ! ارادت خان ضرور اسے گرفتار کر کے آپ کے سامنے حاضر کرے گا۔"
آصف جاہ نے پُر تیقن لہجے میں بادشاہ کو [illegible]
[illegible] آصف جاہ!

میں چاہتا ہوں کہ دس ہزار کا ایک اور لشکر اس کی مدد کے لیے بھیجا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ اس لشکر کی قیادت کس سردار کے سپرد کی جائے؟'' شاہ جہاں نے آخر میں دریافت کیا۔

اس پر عرش بیگ اپنی نشست سے اٹھا اور ادب سے بولا۔

''جہاں پناہ! غلام اس خدمت کے لیے حاضر ہے۔ خان جہاں نے بھرے دربار میں مجھے ذلیل کیا ہے۔ میں اس سے ضرور انتقام لوں گا۔''

شاہ جہاں نے عرش بیگ کی طرف غور سے دیکھا اور ایک خلعت عطا کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے عرش بیگ! تم اس ذلیل شخص سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوگے۔ جاؤ، اب زیادہ وقت ضائع نہ کرو اور اپنے ساتھ پانچ ہزار مسلح سوار لیتے جاؤ۔'' شاہ جہاں نے اسے ہدایت کر دی۔

عرش بیگ نے ادب سے کہا۔ ''ولی نعمت! اس بزدل انسان کے لیے اتنے بڑے لشکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے ساتھ ایک مختصر سا لشکر لے جانا چاہتا ہوں۔''

''نہیں، میں جو کہتا ہوں وہی کرو۔'' شاہ جہاں جلال میں آ کر بولا۔ ''طوفان کی طرح جاؤ اور اسے غرق کر دو۔ ایسا غرق کہ وہ قیامت تک سر نہ اٹھا سکے۔''

''ایسا ہی ہوگا جہاں پناہ!'' عرش بیگ نے جھکتے ..... ہوئے کہا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

جمنا کی ساکن لہروں پر پھیلی ہوئی خاموش فضا میں لشکر کی روانگی کے لیے بجنے والے بگل نے ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ عرش بیگ اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا اور لشکر اشارے کا منتظر تھا کہ شام کے دھندلکے میں دور ایک سوار، گھوڑا دوڑائے آتا دکھائی دیا۔

عرش بیگ نے اپنے لشکر کو اشارے سے روکا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھے آخر یہ آنے والا کون ہے اور کہاں سے آ رہا ہے؟ جب سوار قریب آیا تو عرش بیگ نے پہچانا کہ وہ سپہ سالار اعظم خان تھا۔

عرش بیگ احتراماً گھوڑے سے اتر پڑا۔ سارے لشکر نے اس کی پیروی کی اور سارے سوار اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔

اعظم خان نے لشکر کا جائزہ لیا اور عرش بیگ کو اشارے سے ایک طرف بلا کر کہا۔ ''ہمیں معلوم ہے عرش بیگ کہ تم کہاں جا رہے ہو۔''

''جی حضور! میں اپنی عزت پر قربان ہونے جا رہا ہوں۔ [illegible]''

''مگر دانستہ طور پر موت کے منہ میں جانے سے کیا فائدہ۔'' اعظم خان نے کہا۔

''میں ایسی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتا ہوں حضور کہ جس میں بے عزتی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں پاگل ہو جاتا ہوں جب یہ سوچتا ہوں کہ عظمت خان یہ کہتا ہوگا کہ اس عرش بیگ کو بھرے دربار میں ذلیل کر دیا۔''

اعظم خان کو عرش بیگ کے سینے میں سلگتی آتش انتقام اور جوش غیظ کا اندازہ تھا، تاہم بولا۔ ''عرش بیگ! وہ وقت کی بات تھی۔ ہر شخص کنارے تک پہنچنے کی کوشش میں ہاتھ پیر مارتا ہی ہے۔ کبھی بکری بھی شیر پر حملہ کر دیتی ہے۔ وہ اس وقت موت کی آغوش میں تھا اور اگر.....''

کہتے کہتے اعظم خان رک گیا تو عرش بیگ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تو آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ میں تو تمہیں نشیب و فراز سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ یاد رکھو جہاں پناہ تمہیں موت کے منہ میں دھکیل کر اپنی ناموری چاہتے ہیں۔ اگر تم میدان جنگ میں مارے گئے تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اگر تم نے خان جہاں پر فتح پالی تو بھی ان کا ہی نام ہوگا۔'' اعظم خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور حضور جہاندیدہ و گرگ باراں دیدہ بھی ہیں اور ہر ایک کے خیر خواہ بھی۔ آپ صاف صاف فرمائیں کہ کیا چاہتے ہیں؟'' عرش بیگ نے دریافت کیا۔

''میں کیا چاہوں گا عرش بیگ ..... کہ تمہاری موت سے نہ مجھے کوئی افسوس ہوگا اور نہ تمہاری کامیابی پر کوئی خوشی۔ میں فقیر قسم کا آدمی ہوں۔ سپہ سالار نہ سہی، سپاہی ہی سہی مگر تمہیں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تم جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہے ہو۔'' اعظم خان نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں معزز سردار!'' عرش بیگ با ادب بولا۔ ''مگر میں اس سے زیادہ اپنے متعلق سوچنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میں اس لیے نہیں جا رہا ہوں کہ جہاں پناہ مجھے کوئی عہدہ دیں گے، صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ عظمت خان نے مجھے بھرے دربار میں ذلیل کیا تھا۔ میں اس سے اپنی بے عزتی کا انتقام [illegible]

اب اعظم خان اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا اور اشارے سے عرش بیگ کو جانے کی اجازت دے دی۔

عرش بیگ نے جھک کر سلام کیا اور لشکر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اعظم خان دیر تک اسے جاتا دیکھتا رہا اور جب لشکر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے ایک سرد سی ہنکاری بھرتے ہوئے خود کلامی سے کہا۔

''آہ..... میری قسمت کے چاند (عزیزہ)، تجھ پر دشمنوں کی کالی گھٹائیں چھائی جا رہی ہیں۔ تمہاری طرح میں بھی رحمت کی اس ہوا کا شدت سے منتظر ہوں جو انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے منتشر کر دے۔ میں نے تجھے (عزیزہ) خدا کے حوالے کیا۔''

اعظم خان نے حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا اور واپس لوٹ آیا۔

☆☆☆

برہان پور کے شاہی محل پر آج اداسی برس رہی تھی۔ نہ کوئی پہریدار تھا، نہ کوئی خادم۔ خان جہاں، اس کا بیٹا حسین خان اور شہزادی عزیزہ، عظمت کی جواں موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

خان جہاں کی کمر خم ہو چکی تھی اور وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور پھر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

''تم سب غلط کہتے ہو۔ حسین! میرا عظمت زندہ ہے۔ میرا شیر ان گیدڑوں کے ہاتھوں کبھی نہیں مر سکتا۔''

غمگسار عزیزہ اپنے باپ کے قریب آئی اور تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''ابا جان! اب افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ موت ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اب ہمیں اپنی فکر کرنا چاہیے۔ بے شک بھائی عظمت شہید ہو گئے لیکن وہ بہادری کی موت مرے ہیں۔''

غمگسار باپ نے کہا۔ ''بیٹی! اب مجھے نہ سلطنت کی ضرورت ہے، نہ کسی اور چیز کی۔ میں اب میدان جنگ میں جا کر.....'' خان جہاں فرط رقت سے جملہ پورا نہ کر سکا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''نہیں ابا جان! ہم ان بھوکے کتوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ عظمت کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ جب ہم موت کی تلاش میں میدان جنگ میں نکلیں گے تو موت ہم سے دور بھاگے گی اور ہم موت کے تعاقب میں دشمنوں کی صفوں کو چیر کر رکھ دیں گے اور [illegible]''

عزیزہ جوش سے مغلوب الغضب ہوتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔

''بیٹی! تمہارا باپ موت سے خائف نہیں بلکہ تمہارے بھائی کی موت نے اسے بزدل بنا دیا ہے۔'' خان جہاں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا کے لیے ایسا نہ سوچیے ابا جان! ابھی آپ کو زندگی کی ضرورت ہے۔ ہمیں ابھی بھائی عظمت خان کے خون کا انتقام لینا ہے۔'' عزیزہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

''بیٹی عزیزہ! ہم اس وقت دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور رہائی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔'' خان جہاں نے کہا۔

''گھبرائیے نہیں ابا جان! ہم سپاہی زادے ہیں۔ آپ کی یہ مایوسانہ گفتگو ہمارا دل بھی خون خون کیے دیتی ہے۔ ہم مرنے کے طلبگار ہیں اور مر جائیں گے مگر بزدلوں کی موت نہیں مریں گے۔ ہم تلواروں کی چھاؤں میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ آپ یہاں رہیے مگر ہمیں اجازت دیجیے۔'' آخر میں عزیزہ نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

''میں سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں اور دشمنوں سے جنگ بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔ میری بیٹی! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں بھی اب اس جنگ میں حصہ لوں گا۔ جاؤ حسین! تمہیں یہ خدمت مبارک ہو۔ مالوہ کے پہاڑوں کے ذرے ذرے کو، مکانوں کی اینٹ اینٹ کو مادر وطن کا یہ پیغام پہنچاؤ کہ مادر وطن اس وقت غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جا رہی ہے۔ بڑھو اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاؤ، پھر یہ وقت نہ آئے گا۔ آج آزادی ہمیں پکار رہی ہے۔ کل تمہارے خون کے دریاؤں میں طوفان کی آوازیں بھی اسے تمہاری طرف نہ لاسکیں گی۔''

خان جہاں جوش میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ حسین اور عزیزہ اپنے باپ کی باتیں سن کر خوش ہو رہے تھے۔ حسین نے تلوار سنبھالی اور باہر نکل گیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور دشوار گزار راستوں میں روپوش ہو گیا۔

خان جہاں اپنی آرام گاہ کی طرف چلا گیا۔ وہ جاتے ہی بستر پر لیٹا اور سو گیا۔ عزیزہ نے مردانہ لباس پہن کر چہرے پر نقاب ڈالی، گھوڑے پر سوار ہوئی، گرد و پیش کا جائزہ لیا اور ایک طرف روانہ ہو گئی۔

عزیزہ نے سیدھا رتی منا کے جنگل کا رخ کیا۔ اس کی [illegible]

ایک خفیہ جنگی کمین گاہ بنائی ہوئی تھی۔ ریتی چنا کا مغربی حصہ موجودہ میدانِ جنگ سے زیادہ دور نہ تھا۔

اپنی ریتی چنا والی خفیہ جنگی کمین گاہ میں اس نے پورا ایک دن گزارا تھا اور اگلے ہی دن اس کے ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ آگرہ سے ایک نیا اور تازہ دم شاہی لشکر آ کر نیابت خان کے پاس فروکش ہوا ہے اور اس کا سردار عرش بیگی ہے۔

میدانِ جنگ میں خیمہ زن دشمن لشکر کے بارے میں یہ خبر اس کے لیے دھماکے سے کم نہ تھی۔ اسے فکر ہونے لگی کہ تازہ دم کمک ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑ جائے گا، اگر اس کا جلد کوئی سدِباب نہ کیا گیا تو......

تب ہی... سوچ بچار کے بعد اس نے ایک صندوق سے بھڑکیلا لباس نکالا اور اسے زیبِ تن کرنے لگی۔

☆☆☆

اگرچہ نیابت خان نے فتح ضرور پائی تھی مگر دس ہزار میں سے صرف بن[...] سو اس کے پاس زندہ بچے تھے۔ ان میں سے اکثر زخمی اور بیمار تھے۔ جو تندرست تھے، وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹنا چاہتے تھے۔ اس موسم میں مالوہ کی آب و ہوا ان کے لیے مہلک تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔

نیابت خان نے ایک اونچی سی پہاڑی پر خیمے لگوائے تھے۔ پہاڑی ندی نالے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ دریا میں سخت طغیانی تھی۔ نیابت خان اس صورتِ حال سے سخت گھبرایا ہوا تھا۔ وہ کہیں جا بھی نہ سکتا تھا اور نہ کوئی قاصد کو شہنشاہ تک بھیجا جا سکتا تھا۔

ایک مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا مگر اس طوفان میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف وہ اس مصیبت میں گرفتار تھا تو دوسری طرف اسے یہ خوف تھا کہ خان جہاں ایک لشکرِ جرار کے ساتھ اپنے نوجوان بیٹے کے خون کا انتقام ضرور لے گا۔

ان کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی ختم ہو رہا تھا۔ نیابت خان نے واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اپنے جوانوں کے ساتھ واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ شمال کی جانب سے ایک لشکر آتا ہوا دکھائی دیا اور نیابت خان کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لشکر اب پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔

[...] آنے والے لشکر کی طرف بڑھا۔

لشکر اب گھوڑوں سے اتر چکا تھا۔ عرش بیگی اپنے گھوڑے سے اترا اور اپنا گھوڑا ایک غلام کو دے کر پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

نیابت خان نے عرش بیگی کو دیکھا بلکہ دونوں ہی ایک سکتے کے سے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"تم کیا دیکھنے لگے عرش بیگی؟" آخر نیابت خان نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"میں حیران ہوں نیابت خان کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" عرش بیگی نے جواب میں کہا۔

"کچھ نہ پوچھو عرش بیگی! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ سب کیا ہو گیا ہے۔ ارادت خان مارا جا چکا ہے اور ہمارا لشکر کچھ تو دشمن کے ہاتھوں اور کچھ خدا کے غضب سے تباہ ہو چکا ہے۔ صرف بیس[...] سپاہی زندہ بچے ہیں۔ ان میں سے بھی آدھے موت کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ خان جہاں شکست کھا کر بھاگ گیا ہے اور عظمت خان میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔"

نیابت خان نے اسے نہایت صراحت کے ساتھ ساری باتیں سمجھا اور بتا ڈالیں۔

"تم گھبراؤ نہیں نیابت خان!" عرش بیگی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔ "میں پانچ ہزار کا لشکر لے کر آیا ہوں اور کل صبح برہان پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"کیا تم اسی لیے آئے ہو؟" نیابت خان نے پوچھا۔

"ہاں، میں اسی لیے آیا ہوں۔" عرش بیگی نے جواب میں کہا۔ "میں خان جہاں کو گرفتار کر کے اسے زنجیروں میں جکڑوں گا اور عظمت خان کا سر نیزے پر رکھ کر عزیز و اقارب اور لشکر کے حلقے میں لے کر آگرہ لے جاؤں گا۔ وہاں انہیں در بدر اور خاک بسر کروں گا۔"

"خدا تمہیں، تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔" نیابت نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم ضرور کامیاب ہوں گے نیابت خان! تم فکر نہ کرو، بس اب ذرا لشکر کے قیام کا انتظام کرو۔ سپاہی تھک کے چور ہو رہے ہیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے تاکہ جنگ میں دشمن پر کاری ضرب لگا سکیں۔" عرش بیگی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم میرے خیمے میں قیام کرو۔" نیابت نے کہا۔ "میں لشکر کے قیام کا انتظام کراتا ہوں۔"

یہ کہہ کر نیابت خان سپاہیوں کے انتظام و انصرام میں [...]

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور خیمے تیار ہو چکے تھے۔ جا بجا آگ روشن تھی اور سپاہی آرام سے اپنے اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے تھے۔

عرش بیگی، نیابت خان کے خیمے میں جو سب سے الگ ایک پہاڑی پر نصب کیا گیا تھا، بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ خیمے میں شمع روشن تھی۔ عرش بیگی اب تک کئی جام چڑھا چکا تھا۔ اس پر مدہوشی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک ایک حسین دوشیزہ خیمے میں داخل ہوئی اور خاموشی سے تبسم کے ساتھ تک کر کھڑی ہو گئی۔

عرش بیگی اسے دیکھ کر مسکرایا اور اس کے قریب آ کر بولا۔ "اے حسینہ! تم کون ہو؟"

"میں ایک مغنیہ ہوں۔" دوشیزہ نے جواب دیا۔

"اوہ... لیکن تم یہاں کیوں آئی ہو؟" عرش بیگی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"میں نے سنا ہے کہ حضور کو ناچ گانے کا شوق ہے اور یہ معلوم ہوا کہ آپ آج کی رات اسی خیمے میں قیام کریں گے اس لیے میں حاضر ہو گئی۔" دوشیزہ بولی۔

"خوب! نیابت خان نے یہاں جنگل میں منگل رکھا ہے کیا... خیر، اچھا کیا کہ تم آ گئیں۔ کیا کچھ سناؤ گی بھی؟"

"جی ہاں، ضرور سناؤں گی مگر ذرا ہوش تو درست ہو جانے دیجیے۔" کہتے ہوئے دوشیزہ نے ایک دلفریب انداز سے عرش بیگی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

تب ہی اس نے ایک گیت سنایا اور اپنی سانس درست کرنے لگی۔

اثنائے راہ عرش بیگی جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ کچھ دیر وہ دوشیزہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اس کے قریب آ کر دست درازی شروع کر دی۔

"اتنی بے صبری اچھی نہیں۔ میں تو ساری رات ہی آپ کے پاس رہوں گی۔" دوشیزہ اسے اطمینان دلاتے ہوئے اٹھلا کر بولی۔

عرش بیگی نے اسے جام بھرنے کی ہدایت کی۔ دوشیزہ اٹھی اور ایک جام بھر کے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ مستی سے جھوم رہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ دوشیزہ نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

کالی رات اپنی اداسیوں سمیت سو چکی تھی۔ لشکر [...]

بدذوقی تبسم

گوالے نے نئے ملازم کو آواز دی۔ "[...]"

[...] جب [...] حاضر ہوا۔

"دودھ میں پانی ملا دیا تھا؟" گوالے نے پوچھا۔

"جی ہاں صاحب!" نئے ملازم نے مستعدی سے جواب دیا۔

گوالے کے چہرے پر ایک دم بل پڑ گئے۔ وہ غصے سے اسے ڈانٹ کر بولا۔ "[...] نہیں، دودھ میں پانی ملانا کتنی بری بات ہے۔ بہت بڑی بے ایمانی ہے۔"

"لیکن صاحب! آپ ہی نے تو کہا تھا۔" نیا ملازم ڈرتے ڈرتے اور حیرت سے بولا۔

"اے بات کو غور سے سنو۔" گوالے نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تجھ سے کہا تھا کہ دودھ میں پانی ملا کر... میں نے تو یہ کہا تھا کہ بالٹی میں پہلے آدھا پانی بھر لیا کرو پھر اس میں بھینس کا دودھ نکالا کرو۔ اس طرح ہم لوگوں کے سامنے قسم کھا سکتے ہیں کہ ہم دودھ میں پانی نہیں ملاتے کیونکہ اس طرح ہم پانی میں دودھ ملاتے ہیں۔ دودھ میں پانی نہیں۔"

مرسلہ: پرویز بھٹی، بہاولپور

[...] نے چھپائے ہوئے خنجر کو نکالا اور اطمینان سے خنجر عرش بیگی کے سینے میں گھونپ دیا۔

عرش بیگی کراہا، تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ اب وہ باہر جانے کے لیے بے قرار تھی۔

اس نے خیمے کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ چار مغل سپاہی اطمینان سے سو رہے تھے۔ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ پھر خیمے میں واپس لوٹ آئی پھر خنجر نکال کر خیمے کا کپڑا کاٹنا چاہا تاکہ اس سمت اور اس طرح سے وہ باہر نکلنے کے لیے کوئی صورت پیدا کر سکے لیکن وہ جس جگہ سے خیمے کا کپڑا کاٹنا چاہتی تھی، وہ حصہ حرکت کرنے لگا۔

دوشیزہ پیچھے ہٹی اور ایک کونے میں چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے بعد ہی ایک نقاب پوش اسی راستے سے خیمے میں داخل ہوا۔

"ہم اپنے گھروں سے اس لیے نہیں نکلے ہیں کہ ناکام و نامراد واپس جائیں۔ ہم بہادر ہیں اور ہم آج جہان پور والوں کو دکھا دیں گے کہ ہم کیا ہیں۔"

☆☆☆

سورج کی کرنیں ریتیلی چٹانوں پر پڑ رہی تھیں۔ اب نیابت خان اپنے لشکر کو لے کر ایک کھلے میدان میں پہنچ چکا تھا لیکن ابھی وہ اپنی صفیں درست بھی نہ کر پایا تھا کہ سامنے سے گرد و غبار اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ خان جہاں لشکر کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔

اس نے طبل جنگ بجانے کا حکم دے دیا۔ مغل سپاہیوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے۔ خان جہاں کا لشکر بھی بجلی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ادھر نیابت خان بھی مقابلے کے لیے ہر طرح تیار تھا۔

خان جہاں میدان جنگ میں پہنچتے ہی مغل سواروں پر ٹوٹ پڑا۔ تلواریں تڑپ کر چمکیں اور خون میں ڈوب کر نکلیں۔

گویا دونوں لشکر موت اور عزت کے طلب گار دیوانہ وار حملے کر رہے تھے۔ سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ زمین تپ رہی تھی۔

دونوں طرف کے سپاہی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ سامنے پہاڑیوں پر ایک اور دستہ میدان جنگ کی طرف بڑھ رہا تھا اور نیابت خان کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں کہ یکایک حسین خان اپنے لشکر کے ساتھ نعرے لگاتا ہوا پہنچ گیا۔

نیابت خان پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ حسین خان کے لشکر کو دیکھ کر اس کے رہے سہے ہوش و حواس بھی جاتے رہے۔ یہ ایک نفسیاتی مار تھی ورنہ تو تعداد میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک ہی لشکر کو تقسیم کر دیا تھا اور دشمن پر رعب ڈالنے کے لیے مختلف سمتوں سے حملہ کیا جا رہا تھا۔ اس جنگی چال کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔

نیابت خان تیزی سے اپنے لشکر کی اگلی صفوں میں چھپ کر محفوظ ہو جانا چاہتا تھا مگر اس وقت اسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ یا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس چکے تھے یا اس کے ہاتھوں میں لگام ہلانے کا دم خم ہی باقی نہ رہا تھا۔

دونوں فریقوں کے پلڑے ابھی تک تقریباً برابر ہی تھے۔ عزیزہ کا دستہ سب سے پہلے میدان جنگ میں آیا تھا [illegible] خان تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دوپہر ڈھلتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کے سپاہی اب تھک چکے تھے مگر تلواروں کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی تھی مگر کسی سردار میں یہ طاقت نہ رہی تھی کہ وہ حملہ کر کے کسی ایک فریق کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا۔

گھوڑے بھی دوڑتے دوڑتے نڈھال ہو چکے تھے لیکن جنگ کسی طرح ختم ہوتی نظر نہ آتی تھی۔

ہر سپاہی گھبرایا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ دور ایک لشکر آندھی طوفان کی طرح بڑھتا ہوا نظر آیا اور ہر سپاہی کی نظریں اسی طرف لگ گئیں کہ اچانک ایک تازہ دم لشکر میدان میں پہنچا اور مغلوں پر ٹوٹ پڑا۔

حبشی غلام نے جب یہ دیکھا تو وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا صفوں کو چیرتا ہوا سامنے آیا اور گرجتے ہوئے بولا۔

"بہادرو! ہمیں موت نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اب ہم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ ہم وطن سے دور ہیں اور کسی کمک کی بھی امید نہیں۔ دیکھو، تلواروں کی تیز دھاروں میں موت ہمیں پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ دیر نہ کرو، اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر قیامت تک پچھتانا پڑے گا۔ بڑھو اور جنگ کا فیصلہ کر دو۔" حبشی غلام کی تقریر نے مغلوں میں جوش پیدا کر دیا۔

عزیزہ نے یہ حالت دیکھی تو گھوڑا دوڑا کر اپنے لشکر کے سامنے آ گئی اور گھوڑا روک کر بولی۔

"شیرو! دشمن نے تمہیں مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم یوں ہی پیچھے ہٹتے چلے گئے تو دشمن تمہیں ختم کر دے گا۔ وہ گنتی کے آدمی رہ گئے ہیں اور ہم ابھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ شرم کرو، اپنی اولاد کی آزادی پر قربان ہو جاؤ۔ بڑھو اور ایک ہی حملے میں انہیں نیست و نابود کر دو۔ میرے پیچھے آؤ اور اس حبشی غلام کا خاتمہ کر کے جنگ کا نقشہ پلٹ دو۔"

یہ کہہ کر عزیزہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دشمنوں کی صفوں میں روپوش ہو گئی۔

عزیزہ کے پیچھے پیچھے اس کا دستہ بھی آگے بڑھا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ دفعتاً ہی شاہی لشکر میں حرکت ہوئی اور عزیزہ دونوں ہاتھوں میں شاہی لشکر کے دونوں سرداروں نیابت خان اور حبشی غلام کا سر لیے آگے بڑھی۔ اس کا دستہ فتح کے نعرے لگاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

شاہی لشکر نے جب اپنے سرداروں کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ شفق کی سرخیاں میدان پر [illegible]

فراز سے اترتا ہوا واپس ہو رہا تھا۔

برہان پور کا بچہ بچہ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے ہوئے اپنے بہادروں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

☆☆☆

خدا جانے مغل دارالسلطنت کی دلچسپیاں کس نے چھین لی تھیں۔ شاندار عمارتوں میں اداسی تھی۔ خود شہنشاہ پریشان اور فکرمند تھا اور سارا دربار اداس ہو کر رہ گیا تھا۔

گو بظاہر شاہ جہاں اپنا بیش قیمت تاج پہن کر اسی شان و شوکت سے تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ اراکین دربار اسی طرح چہکا کرتے تھے اور کمزور سلطنتوں پر قبضہ جمانے کی تجویزیں ... باقی تھیں لیکن شاہ جہاں کے چہرے کی وہ رونق اب غائب ہو چکی تھی۔

آج وہ اپنے امرا سے ایک ضروری مشورہ لینا چاہتا تھا اس لیے آگرہ کے گلی کوچوں میں منادی کرا دی گئی تھی کہ رعایا کا ہر فرد اپنی رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ دربار بھرا ہوا تھا اور سارے درباری شہنشاہ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

درباری حیران تھے کہ جس تجویز کے لیے اتنا اہتمام کیا گیا ہے، آخر وہ کیا ہے؟ جب سارے درباری جمع ہو چکے ... تو شاہ جہاں بڑی شان سے آیا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر دربار اور حاضرین دربار پر ڈالی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"معزز سردار اور اراکین سلطنت! آج پورے دو مہینے ہو چکے ہیں جب ہم نے دس ہزار سواروں کا ایک لشکر حاکم مالوہ خان جہاں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا لیکن جب اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو ایک دوسرا لشکر عرض بیگی کی قیادت میں روانہ کیا مگر آج تک اس کے متعلق بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ آج تک نہ تو ان کی کوئی خبر آئی ہے اور نہ ہی حالات معلوم ہو سکے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اب ایک مسلح لشکر مالوہ بھیجا جائے۔"

یہ سن کر دربار پر سناٹا چھا گیا اور پھر چند مغل سرداروں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"جہاں پناہ! ہم اس باغی سے ضرور انتقام لیں گے۔" سردار کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ ایک خستہ حال سوار دربار میں داخل ہوا اور کورنش بجا لا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاہ جہاں نے اسے دیکھا اور قریب بلا کر دریافت کیا۔ "تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"[illegible] لشکر [illegible]

مالوہ کی طرف بھیجا تھا۔" سوار نے ادب سے کہا۔

"کیا خبر لائے ہو؟" شاہ جہاں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جہاں پناہ! ہم تباہ ہو گئے۔ لٹ گئے۔ حضور میں ان سواروں میں سے ہوں جو ارادت خان کی سرکردگی میں مالوہ کی تسخیر کے لیے گئے تھے۔ ایک میں ہی اتنا سخت جان تھا کہ زندہ بچا ہوں۔" خستہ حال سوار نے جواب میں کہا۔

"ولی نعمت! پہلا دستہ بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ارادت خان میدان جنگ میں کام آ گئے۔ ہم صرف [illegible] سپاہی زندہ بچے تھے کہ عرض بیگی اپنا لشکر لے کر پہنچ گیا اور پھر ہم نے نئے سرے سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رات تو کسی طرح گزر گئی لیکن جب صبح سو کر اٹھے تو معلوم ہوا کہ عرض بیگی بھی قتل ہو چکا ہے۔ پھر بھی ہم نے نیابت خان کی قیادت میں مقابلہ کیا لیکن خان جہاں کا لشکر بھوکے شیروں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑا اور ہمارے پاؤں بھی نہ جمنے دیے۔" سوار کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

پندرہ ہزار کے لشکر کا صفایا شاہ جہاں کے لیے کم صدمہ نہیں تھا۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گرجتے ہوئے بولا۔

"اس سے زیادہ تباہی اور کیا ہو گی کہ ایک باغی نے شاہی لشکر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اعظم خان! اب تم خود جا کر باغی خان جہاں کو گرفتار کرو اور مالوہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں کہ جس قدر لشکر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ اگر تم بھی پیچھے رہے تو ہم تنہا میدان میں جائیں گے۔ اعظم خان! تمہاری ذات سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ جاؤ، آج شام سے پہلے لشکر لے کر مالوہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لو۔"

یہ کہہ کر شاہ جہاں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد آصف جاہ کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور اعظم خان کو اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔

دربار برخاست ہو گیا اور شاہ جہاں غصے سے دانت پیستا ہوا شاہی محل میں چلا گیا۔

آصف جاہ، سپہ سالار اعظم خان کو ساتھ لے کر لشکرگاہ میں پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آصف جاہ بولا۔

"کیوں اعظم خان! اب کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں؟" اعظم خان نے پوچھا۔

[illegible]

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" اعظم خان بولا۔ "آخر میں خان جہاں سے کیوں لڑوں؟ اس کا کیا گناہ ہے؟ یہی نا کہ وہ آزاد رہنا چاہتا ہے۔" اعظم خان کا انداز قطعیت اور فیصلہ کن تھا۔

"اعظم خان! تم کیوں بزدل ہو گئے ہو؟ اب تک تمہارے دس پندرہ ہزار سپاہی مارے جا چکے ہیں۔"

"اگر دس پندرہ ہزار سپاہی مارے گئے ہیں تو وہ اپنی بے وقوفی سے مارے گئے ہوں گے۔" اعظم خان بولا۔

"اگر تم جیسا بہادر سردار جائے تو خان جہاں کو چھپنے کی بھی جگہ نہ ملے گی۔" آصف جاہ اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا حضور! لیکن آپ انصاف سے کام لیجیے۔ میں مالوہ جا کر کس بات پر لڑوں؟ صرف اس لیے کہ خان جہاں ہمارے پندرہ ہزار سپاہیوں کو ہلاک کر چکا ہے لیکن اس میں ہماری اپنی غلطی ہے۔ ہم نے خود اس کے ساتھ فریب کیا ہے۔ ہم نے خود اسے دعوت نامہ بھیج کر بلایا تھا اور پھر اس کے بیٹے کو بھرے دربار میں ذلیل کیا۔ ہم نے خود اس کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ باغی ہو جائے۔ ہم نے اسے گرفتار کرنے کے لیے حویلی کا محاصرہ کیا۔ کیا مہمانوں کے ساتھ بھی سلوک کیا جاتا ہے؟ آپ ہی سوچیے کہ اگر کوئی حق کے لیے اپنی آواز بلند کرے تو کیا وہ باغی ہے؟"

"اعظم خان! یقین کرو، میں خود حیران ہوں کہ آخر شہنشاہ نے ایسا کیوں کیا؟ پھر ہمیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ خدا جانے انہوں نے کس کے مشورے پر خان جہاں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا مگر اب......" آصف جاہ کا جملہ مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اعظم خان بولا۔

"حضور! جو کچھ بھی ہوا لیکن مجھ سے آپ کوئی امید نہ رکھیں۔ میں قطعی مجبور ہوں۔ میں ایک فوجی سردار ہوں۔ میرا پہلا فرض لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا ہے اور میں انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا چاہے شہنشاہ مجھے قتل ہی کیوں نہ کرا دیں۔"

"دیکھو اعظم خان! میں تمہارے معاملات ٹھیک کروں گا لیکن تم لشکر کو لے کر یہاں سے نکل تو جاؤ، چاہے مالوہ نہ جانا۔ یہاں سے صرف کچھ کوس کے فاصلے پر......"

"آپ مجھے بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔" اعظم خان نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ کوئی ذمہ داری ہے کہ دوسروں کو موت کے منہ میں

"اعظم خان! مجھے تمہارے فیصلے سے اتفاق ہے" آصف جاہ بولا۔ "مگر مصلحت اسی میں ہے۔ جب تک لشکر روانہ نہیں ہو جاتے، میں شہنشاہ سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ جب تم چلے جاؤ گے تو شہنشاہ یہ سمجھیں گے کہ تم مقابلے کے لیے روانہ ہو چکے ہو پھر میں شہنشاہ کو خان جہاں سے صلح کرنے پر رضامند کر لوں گا۔" آصف جاہ نے اسے سمجھایا۔

"مگر یہ صلح شاید اس وقت ہو گی جب چاروں طرف جنگ کی آگ بھڑک چکی ہو گی۔" اعظم خان نے کہا۔

"تم مجھ پر بھروسا کرو۔ میدان جنگ میں پہنچ کر جنگ کو روکے رکھنا۔ میں میدان جنگ میں صلح کے لیے شاہی قاصد بھیجوں گا۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ میں تمہیں جنگ کا موقع ہی نہ دوں گا۔ بس تم روانگی کی تیاری کرو۔" آصف جاہ اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا اور شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اعظم خان چند لمحے کھڑا سوچتا رہا اور پھر ایک سوار بلا کر بگل بجانے کا حکم دیا۔ بگل کی آواز سنتے ہی سواروں نے تیاری شروع کر دی۔

جب لشکر تیار ہو چکا تو اعظم خان نے سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ ہماری منزل مالوہ ہے۔ فوجی سرداروں نے کوچ کی تیاری شروع کر دی اور اپنے اپنے دستوں کو ہتھیاروں سے آراستہ کیا۔

اعظم خان بھی اپنے خیمے میں آیا اور فوجی لباس پہن کر باہر نکلا۔ لشکر روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اعظم خان نے ایک بار پھر بگل بجانے کی ہدایت کی اور سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے سپہ سالار کے پیچھے ہو لیے۔

مغل سپہ سالار اعظم خان اپنے لشکر کے ساتھ دو دن کی مسافت کے بعد میدان جنگ میں پہنچ چکا تھا۔ خیمے نصب ہو چکے تھے اور سپاہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس وقت اعظم خان کا غلام جعفر بھی اعظم خان کے خیمے میں موجود تھا۔

اعظم خان ابھی تک فوجی وردی پہنے قالین پر بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا اور جعفر خاموشی سے اسے تکے جا رہا تھا۔

آخر اس سے صبر نہ ہو سکا اور متفکر انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"آقا! آپ نے ابھی تک اپنا لباس تبدیل نہیں کیا، آپ تھکے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے پاؤں دبا دیتا ہوں، نیند آ جائے گی۔"

"نہیں جعفر! مجھے اس وقت ایک ضروری کام سے جانا ہے اس لیے میں نے لباس تبدیل نہیں کیا۔" اعظم خان نے کہا۔

"آقا! حالات بہت نازک اور عیارانہ ہیں پھر ہم دشمن کے علاقے میں ہیں اس لیے میں آپ کو باہر جانے کا ہرگز مشورہ نہ دوں گا۔" جعفر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"مجھے دراصل دشمن کے سردار سے ہی ملنے جانا ہے۔ تم میرا انتظار کرنا، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔" اعظم خان نے جواب دیا اور خاموشی سے اٹھ کر باہر نکلا۔

وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔ اسے آج ہی اپنے جاسوس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ خان جہاں بھی لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں موجود ہے اور اس کا لشکر ذرا ہٹ کر ایک پہاڑی پر نصب کیا گیا ہے۔

اعظم خان گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ پہاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی لیکن جونہی وہ نشان کے قریب پہنچا تو اسے ایک سپاہی نظر آیا۔

یہ وہی سپاہی تھا جو پہلے اسے صرف ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔ جب اس نے دشمن کو قریب آتے دیکھا تو تلوار سونت لی۔

اب اعظم خان اس کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ سپاہی نے اسے پہچان کر اپنی تلوار نیام میں ڈال لی اور ایک سریلی آواز گونجی۔

"اعظم خان......!"

یہ مدھر ہاں سی آواز وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور گھوڑے سے اتر کر بولا۔

"عزیزہ.....!"

اس کے ساتھ ہی عزیزہ کی مخمور آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں جھک گئیں۔

"تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں عزیزہ؟" اعظم خان نے محبت پاش لہجے میں سوال کیا۔

"بس، یونہی... نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ سنائیں کیسے ہیں اور یہاں کیسے تشریف لے آئے؟" عزیزہ نے دریافت کیا۔

"میں تو تم سے ملنے کے لیے اس طرف آن نکلا تھا۔" اعظم خان نے جواب میں کہا۔

"آپ کو مجھ سے ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" عزیزہ نے سوال کیا۔

"عزیزہ! کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ یہ جنگ یہیں ختم ہو جائے اور..." یہ کہہ کر اعظم خان

اور عزیزہ اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ابا جان شیر کی طرح بپھرے ہوئے ہیں۔ انہیں عظمت بھیا کی موت......"

"عزیزہ! خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ ایسا نہیں کر سکتیں تو یہ تلوار لو اور مجھے ہی قتل کر ڈالو۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے۔ ایک طرف فرض ہے تو دوسری طرف محبت میرا ہاتھ روک دیتی ہے۔ میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہوں۔ خدارا مجھے اس الجھن سے نجات دلاؤ۔" اعظم خان افسردہ لہجے میں بولا۔

"میں تم سے زیادہ مجبور ہوں۔ میں جس عذاب میں گرفتار ہوں تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ابا جان کی مصیبتیں، بھائی جان کی موت......" عزیزہ نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

"بس ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ تم صلح کر لو۔" اعظم خان نے کہا۔

"پھر کیا ہو گا؟" عزیزہ بولی۔

"یہ خانہ جنگیاں ختم ہو جائیں گی۔ تمہارا خاندان حکومت کا ایک بازو سمجھا جائے گا۔ اگر تم نے منظور کر لیا تو میں اور......"

"اعظم خان! میرے سامنے ایسی باتیں نہ کرو۔" عزیزہ نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ "یہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ تم نہیں جانتے میں آج تک کس طرح اپنے ارمانوں کا خون کرتی رہی ہوں مگر اب مجھے مجبور کیا جا رہا ہے کہ میں ان خیالات کو اپنے ذہن سے نکال پھینکوں۔" عزیزہ نے جواب دیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کون...... کون مجبور کر رہا ہے؟" اعظم خان نے پریشان کن بے چینی سے پوچھا۔

"میرا وطن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وطن پر قربان ہو جاؤں۔ میرے فرائض مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میدان جنگ میں مغلوں کے سپہ سالار اعظم خان کا مقابلہ کروں۔" عزیزہ نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے مقابلہ کرنے میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟" اعظم خان نے کہا۔

"مجھے تم سے محبت ہے اعظم خان! میں تمہاری شجاعت اور شرافت کی قدر کرتی ہوں۔ میں تمہاری شریک حیات بننے پر فخر محسوس کروں گی لیکن اس سیاست نے میرے ارمانوں کا خون کر دیا۔" عزیزہ

''میں کتنا خوش نصیب ہوں عزیزہ کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ میں بھی تم کو دل وجان سے چاہتا ہوں۔ دنیا کا وہ کون سا کام ہے جسے میں تمہاری خاطر نہ کر سکوں مگر اب تم ہی کوئی راستہ نکالو۔ عزیزہ! دیکھو، مجھے مایوس نہ کرو۔'' اعظم خان شدتِ جذبات تلے مغلوب ہو کر بولا۔

''یہ درد اب لا دوا ہو چکا ہے۔ میں ابا جان کو مجبور نہیں کر سکتی۔ عظمت بھیا کی موت ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب تصلح کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ بس اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔'' عزیزہ نے جواب دیا اور اعظم خان حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا اور بے چین ہوتے ہوئے بولا۔

''خدا کے لیے مجھے بتاؤ، میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔ میں تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

عزیزہ بولی۔ ''اب صرف یہی ایک راہ باقی ہے کہ تم بھی فیصلہ کر لو، جیسا کہ میں کر چکی ہوں۔ کل میدان جنگ میں پہنچ کر ہم اپنے اپنے فرائض پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔'' پھر ذرا ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ اعظم خان سے دوبارہ بولی۔

''اعظم خان! محبت ایک غیر فانی چیز ہے۔ جسموں کے ملاپ کو محبت نہیں کہتے۔ اگر تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو کل میدانِ جنگ میں میرا مقابلہ کرنا۔''

اعظم خان یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک نظر عزیزہ پر ڈالی اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

وہ اب عزیزہ سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ عزیزہ اور اعظم خان دونوں کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ اعظم خان اپنے لشکر کی طرف بڑھ رہا تھا اور عزیزہ خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

طبل جنگ نے میدان جنگ میں ایک حشر برپا کر دیا تھا لیکن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ اعظم خان اداس اور فکر مند تھا لیکن مغل سپاہی لڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ دفعتاً لشکر میں حرکت ہوئی اور پھر تلواریں چمکنے لگیں۔ تاریخ میں اس جنگ کی نظیر نہیں ملتی۔ دونوں لشکر بہادری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ابھی دن نہیں ڈھلا تھا مگر دونوں طرف کے سیکڑوں سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ خود خان جہاں اور حسین خان بھی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے مگر عزیزہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔

اعظم خان کی بے قرار آنکھیں عزیزہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور جنگ میں کام آ چکی ہو گی۔ یہ خیال آتے ہی اعظم خان دیوانہ وار دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ آج اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

خان جہاں اور حسین خان، مغل سپہ سالار اعظم خان کا شکار ہو چکے تھے۔ خان جہاں کے ہلاک ہوتے ہی اس کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے اور سپاہی اپنی جانیں بچا کر فرار ہونے لگے۔

شاہی لشکر نے دور تک ان کا تعاقب کیا مگر وہ قابو نہ آئے۔ دفعتاً ایک پہاڑی کی اوٹ سے ایک نقاب پوش سوار سامنے آیا اور بھاگتے ہوئے سواروں کو روکا اور دوبارہ مقابلے پر آ گیا۔

خان جہاں کے سواروں کو لوٹتا دیکھ کر اعظم خان آگے بڑھا اور نیزے کے ایک ہی وار میں اسے گھوڑے سے گرا دیا۔

نقاب پوش سوار نے گرتے ہوئے اپنا نقاب الٹ دیا۔

اعظم خان نے اسے پہچان کر اپنی تلوار پھینک دی اور گھوڑے سے کود پڑا۔ بڑھ کر سوار کو اٹھایا اور اس کا سر اپنی رانوں پر رکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔

اس نے جھک کر اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا اور گلوگیر آواز میں کہا۔

''میری عزیزہ! کیا یہی ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے؟''

''میری موت پر آنسو نہ بہاؤ اعظم! ہماری محبت کا انجام نہایت شاندار ہے کیونکہ میں اپنے وطن پر قربان ہو کر تمہارے بازوؤں میں دم توڑ رہی ہوں۔''

عزیزہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

اعظم خان اپنے خیمے میں عزیزہ کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور بار بار خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر جھانک رہا تھا۔

پھر اس نے عزیزہ کی لاش پر حسرت بھری نظر ڈالی اور خنجر اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔

ماخذات
مالوہ اور اسلام (مولانا طاہر کتبی)
تاریخ شاہجہاں (فیروز بہادر آبادی)
آئینہ ہند، تاریخ ہند (زیب شاہ)

پیلا نشان

جاوید بسام

کوئی کتنا ہی نڈر ہو... کبھی کبھی انسان کے اندر کہیں ایک خوف پوشیدہ ہوتا ہے جو وقت آنے پر کسی نادیدہ دشمن کے مانند حملہ آور ہوتا ہے... وہ بھی انجانے خوف کے غیر محسوس حصار میں قید ہوتا جارہا تھا... وہ جو مردہ لوگوں کے بیچ سانس لے رہا تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہ عنقریب انہی کے درمیان زندگی گزارنے والا ہے...

ایک ایسے پیلا نشان کا قصہ جس کے راز سے کوئی واقف نہ تھا

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کی وضاحت کرنا ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر موسیقی میں کچھ راگ مجھے خزاں کے پتوں کے بھورے اور سنہری رنگ کے بارے میں سوچنے پر کیوں مجبور کرتے ہیں؟ سینٹ سیسل کا ہجوم میرے خیالات کو غاروں میں بھٹکنے کے لیے کیوں لے جاتا ہے، جہاں کی دیواریں اوس کی اچھوتی چاندی سے چمکتی ہیں؟ چھ بجے کے براڈوے کا شور اور ہلچل اچانک میری آنکھوں کے سامنے بریٹن کے ایک پُرامن جنگل کی تصویر سے کیوں بدل جاتی ہے جہاں سورج کی روشنی درختوں میں سے جھانک رہی ہوتی ہے اور سلویا ایک چھوٹی سی سبز چھپکلی کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت سے جھک جاتی ہے اور بہ مشکل سنائی دیتی آواز میں کہتی ہے۔ ''ذرا سوچو، یہ مخلوق بھی خدا

کی سرپرستی میں ہے۔"

میں نے پہلی بار اس آدمی کو دیکھا تو وہ میری طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اتنی ہی توجہ دی جتنی اس وقت واشنگٹن اسکوائر سے گزرنے والے کسی دوسرے راہ گیر کو دی تھی۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ گرجا گھر کے دروازے میں کیسے غائب ہوا پھر جب میں کھڑکی سے ہٹ کر اسٹوڈیو میں واپس آیا تو اس کے بارے میں بھول چکا تھا۔

دوپہر کے اختتام پر دن گرم تھا اور کمرا حبس سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ ابھی تک گرجا گھر کے احاطے میں کھڑا تھا۔ میری نگاہیں چوک کا جائزہ لینے لگیں جہاں فوارہ چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے ذہن کے پردے پر درختوں، فٹ پاتھ پر گزرنے والی آیاؤں اور کام سے چھٹی کرکے گھر جانے والے لوگوں کے نقوش لیے واپس گھوما تو میری نظر بے ساختہ اس پر پڑی۔ اب اس کا رخ میری طرف تھا۔ میں اسے اچھی طرح دیکھنے کے لیے جھک گیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس چہرے میں مجھے کیوں کراہت محسوس ہوئی لیکن مجھے فوری طور پر ایک خوفناک قبر کا خیال آیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے لاش کھانے والا ایک موٹا سفید کیڑا موجود ہے۔ یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ مجھے متلی ہونے لگی جو غالباً میرے چہرے پر جھلک رہی تھی کیونکہ اس نے فوراً ناگوار نظروں سے مجھے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ میں نے سوچا لاروا کا خود ہی پریشان ہونا کتنا عجیب ہے؟

ایزل پر واپس آکر میں نے ماڈل کو مطلوبہ انداز لینے کا اشارہ کیا لیکن تھوڑا سا کام کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ رنگوں میں کچھ فرق آرہا ہے حالانکہ میں نے کوئی نیا رنگ نہیں لیا تھا۔ میں نے رنگ پتڑا لیا اور کینوس پر گہرے رنگ کو کھرچنے لگا۔ دراصل تصویر میں جلد کا رنگ بدل کر کچھ عجیب سا ہوگیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ رنگ میں نے کب استعمال کیا ہے۔ ورکشاپ میں اچھی روشنی تھی۔ میں ایسی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے ٹیسی کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ اس کے گالوں اور گردن پر صحت مند چمک دار سرخی اب بھی موجود تھی۔ "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، یہ میرا قصور ہے لیکن کچھ نہیں آرہا کہ یہ میں نے کب کیا؟ میں اسے صاف کررہا ہوں۔ تم چاہو تو کچھ دیر آرام کرسکتی ہو۔"

ٹیسی سگریٹ پینے کے لیے اٹھ گئی۔ اس نے جاتے ہوئے ایک تصویری میگزین اٹھالیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تارپین سے نقصان پہنچا تھا یا کینوس میں کوئی خرابی تھی۔ میں جتنا کھرچتا گیا، تصویر کے رنگ اتنے پھیلتے گئے۔ میں نے اسے صاف کرنے کی بہت کوشش کی لیکن گردن کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ ایک عجیب انفیکشن نے پوری تصویر کو متاثر کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گہرے دھوئیں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں رنگ پتڑا، تارپین اور چیتھڑے ایک طرف پھینک دیے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس خرابی میں ڈوول کا قصور ہے جس نے مجھے کینوس دیا تھا لیکن جلدی میں نے محسوس کیا کہ کینوس عیب دار نہیں ہے اور نہ ہی ایڈورڈ کے رنگ۔ یہ تارپین کے تیل کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ میری آنکھیں دوپہر کی روشنی میں رنگوں کی تمیز کیسے کھوسکتی ہیں؟ میں نے ٹیسی کو بلایا۔

"تم نے پینٹنگ کے ساتھ کیا، کیا ہے؟" وہ وحشت سے بولی۔

"شاید تارپین کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

"کیا ڈراؤنا رنگ ہے۔ تم کو لگتا ہے کہ میرا جسم سبز پنیر جیسا ہے؟" وہ بولی۔

"بالکل نہیں۔ کیا میں نے پہلے بھی ایسا پینٹ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔ یہ واقعی تارپین کی وجہ سے ہوا ہے۔" ٹیسی نے الجھن آمیز لہجے میں اتفاق کیا۔

پھر وہ کمونو پہن کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ میں کینوس کو دیر تک رگڑتا اور کھرچتا رہا، یہاں تک کہ بیزار ہوگیا۔ آخر میں نے لعنت بھیجی اور برش اٹھا کر زور سے کینوس میں گھونپ دیے لیکن فوراً ہی گھبرا گیا۔ ٹیسی نے آواز سن لی تھی۔ وہ فوراً میری سمت مڑی اور افسوس اور غصے سے چلائی۔

"اوہ تو...... یہ کیا احمقانہ حرکت ہے؟ تم نے تین ہفتوں تک اس پر محنت کی ہے اور اب اسے غارت کردیا ہے۔ آخر یہ فنکار کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں؟"

میں نے ویسی ہی شرمندگی محسوس کی جیسی کہ میں ہمیشہ غصے کے بعد کرتا ہوں اور مایوسی سے خراب کینوس کو دیوار کی طرف موڑ دیا۔ ٹیسی نے برش صاف کرنے میں میری مدد کی اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔ وہ پردے کے پیچھے سے مجھے مشورہ دے رہی تھی کہ جب تم کو غصہ آئے تو اسے کسی قابو کرو اور پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ میں کافی اذیت برداشت کرچکا ہوں، وہ باہر آئی اور شمیز کے بٹن بند کرنے کا کہا۔

"سب برباد ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب تم نے مجھے گرجا گھر کے احاطے میں اس خوفناک آدمی کے بارے میں بتایا، اس کے بعد خرابی شروع ہوئی۔" اس نے کہا۔

"ہاں، اس نے شاید تصویر پر جادو کیا ہے۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، سات بج گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔" ٹیسی نے آئینے کے سامنے اپنی ٹوپی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم کو اتنی دیر تک روکنا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا اور کھڑکی میں چلا آیا۔ نیچے پھولے ہوئے چہرے والا آدمی موجود تھا۔ میں بیزاری سے پیچھے ہٹا اور ٹیسی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیچے دیکھا اور سرگوشی کر ڈالی۔

"کیا یہ وہی آدمی ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آرہا لیکن لگتا ہے کہ وہ سفید اور پھولا ہوا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے ایک خواب کی یاد دلاتا ہے۔ ایک خوفناک خواب...... جو میں نے بھی دیکھا تھا۔ کیا وہ واقعی خواب تھا؟"

"میں کیسے جان سکتا ہوں؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ٹیسی کے چہرے پر بھی مصنوعی مسکراہٹ آگئی۔ وہ بولی۔ "بات یہ ہے کہ تم بھی وہاں موجود تھے۔"

"ٹیسی! کیا یہ کہہ کر تم میری چاپلوسی کرنے کی کوشش کررہی ہو کہ میں تمہیں خواب میں نظر آتا ہوں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"لیکن یہ سچ ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"اچھا آگے بڑھو۔" میں نے جواب دیا اور سگریٹ جلا لیا۔

ٹیسی نے اپنی کہنیوں کو کھڑکی پر ٹکایا اور ایک لمبے توقف کے بعد بہت سنجیدگی سے اپنی کہانی شروع کی۔

"میں پچھلی سردیوں میں ایک رات دیر سے بستر پر گئی تھی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد میں بہت تھکی ہوئی تھی لیکن کسی وجہ سے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے شہر کے گھنٹا گھر کو دس، گیارہ اور پھر آدھی رات کے گھنٹے بجاتے سنا پھر مجھے نیند آگئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے، اٹھو اور کھڑکی میں جاؤ۔ میں گھبرا کر اٹھ گئی اور کھڑکی کھول [illegible]

اور خوفناک لگ رہی تھی۔ میں خوفزدہ ہوگئی پھر کسی سواری کے پہیوں کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ مجھے لگا کہ یہ وہی ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ آہستہ آہستہ آواز بڑھتی گئی۔ آخر گھوڑوں والی ایک کوچ سیاہ سڑک پر دھیرے دھیرے رینگتی نظر آئی جو قریب آتی جارہی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ سیاہ رنگ کی میت گاڑی تھی۔ میں خوف سے کانپ اٹھی۔ کوچوان نے چند لمحوں کے لیے کوچ روکی اور میری طرف دیکھا۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑی، ہوا اور سردی سے کانپ رہی تھی۔ کوچ آگے بڑھ گئی۔ میں نے مارچ میں پھر وہی خواب دیکھا اور کل رات بھی وہ خواب نظر آیا۔ تم کو یاد ہے کہ کل کتنی تیز بارش ہوئی تھی؟ جب میں کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی تو میرا لباس گیلا ہوگیا تھا۔"

"اچھا! میں اس خواب میں کہاں ہوں؟"

"تم...... تم تابوت میں تھے لیکن مرے نہیں تھے۔"

ٹیسی نے جواب دیا۔ اس کی آواز کانپ گئی۔

"تابوت میں؟"

"ہاں۔"

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

"نہیں، لیکن میں جانتی تھی کہ تم وہاں ہو۔"

"شاید تم مشروم یا لابسٹر سلاد زیادہ کھاتی ہو؟" میں نے ہنس کر کہا۔ اچانک وہ خوف سے چیخ پڑی۔

میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھوں سے کھڑکی کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی اور اس کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"وہ...... وہ آدمی جو گرجے کے پاس کھڑا ہے، وہ وہی کوچوان ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا فضول بات ہے!" میں نے کہا لیکن ٹیسی کی آنکھوں میں خوف بھرا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تاہم اب وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

"ٹیسی! بے وقوف نہ بنو۔ تم نے بہت دیر کام کیا ہے۔ تھکن سے تمہارے اعصاب بکھر گئے ہیں۔" میں نے پیار سے کہا۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں وہ چہرہ بھول سکتی ہوں؟" وہ بڑبڑائی۔ "میں نے تین بار اپنی کھڑکی کے نیچے ایک میت گاڑی کو رکتے دیکھا اور ہر بار کوچوان نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کا چہرہ بالکل اسی طرح سفید اور پھولا ہوا تھا جیسے مردہ آدمی کا چہرہ ہو۔"

کر دیتے ہیں۔ وہ جاہل اور خواندہ دونوں کو یکساں سمجھ میں آتے ہیں اور لوگ انہیں پڑھ کر جواہرات سے زیادہ قیمتی اور موسیقی سے زیادہ سکون بخش سمجھتے ہیں جبکہ وہ موت سے زیادہ خوفناک ہیں۔ باتوں کے دوران کچھ سائے ہمارے قریب منڈلانے لگے مگر ہم اپنے اردگرد جمع ہونے والے سایوں کو نظر انداز کر کے بات کرتے رہے۔ ٹیسی نے مجھ سے سنگ سلیمانی کے ہک کو پھینکنے کو کہا کیونکہ ہم جان چکے تھے کہ یہ بھی پیلا نشان تھا۔ میں کبھی نہیں جان پاؤں گا کہ میں نے ایسا کرنے سے کیوں انکار کیا اور یہاں تک کہ جب میں اپنے بیڈ روم میں یہ اعتراف لکھ رہا ہوں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے فوری طور پر پیلے رنگ کے نشان کو پھاڑ کر جلتی ہوئی چمنی میں پھینکنے سے روکا۔ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کرنا چاہتا تھا لیکن ٹیسی کی تمام درخواستیں بے سود تھیں۔ رات ڈھلتی گئی اور وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور ہم پیلے بادشاہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہے۔ کہیں دور شہر کے گھڑیال نے آدھی رات کا گجر بجایا۔ ہم نے ہستور (فرضی شہر) اور کیسیلڈا (فرضی ملک) کے بارے میں بات کی جبکہ باہر دھند کھڑکیوں کے خالی شیشوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی جیسے ابر آلو لہریں ہالی (فرضی جھیل) کے ساحل پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

گھر میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور سڑک سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ٹیسی تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ بہت اداس تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے رکھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ میرے تمام خیالات کو آسانی سے پڑھ سکتی ہے، جیسا کہ میں کر رہا تھا کیونکہ ہم ہائیڈس (یونانی اساطیری کردار) کے اسرار کو سمجھ چکے تھے اور حقیقت کا پریت ہمارے سامنے تھا۔ جب ہم نے خاموشی سے ایک دوسرے کو سوچ سمجھ کر جواب دیے تو ہمارے اردگرد سایوں کی ہلچل بڑھ گئی اور کہیں دور گلی سے بگھی میں لگے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں آنے لگیں......

وہ آرہا تھا۔ موت کا ہرکارہ۔ پہلے پہیوں کی ہلکی آواز آئی پھر صاف اور واضح ہو گئی۔ آخر میرے گھر کے دروازے پر آ کر رک گئیں۔ میں بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس گیا اور نیچے ایک کالی میت گاڑی دیکھی۔ گیٹ کھلا اور بند ہوا۔ میں کانپتا اور رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور بولٹ چڑھا دیا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی بھی بولٹ اور تالا ہمیں اس خوفناک ہرکارے سے نہیں بچا سکتا جو پیلے رنگ کے نشان کے لیے آیا تھا...... پھر میں نے کسی کو آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سنا۔ وہ دروازے تک چلا آیا۔ آؤ بولٹ اس کے لمس سے یکدم پھسل گئے۔ میں نے گھبرا کر اندھیرے میں دیکھا لیکن میں اسے کمرے میں داخل ہوتے نہیں دیکھ سکا اور جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اپنی نرم برفیلی گرفت میں لے رہا ہے تو میں زور سے چیخا اور بچنے کے لیے جدوجہد کرنے لگا لیکن میرے ہاتھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سنگ سلیمانی کا ہک میرے چہرے پر مارا۔ مجھے ایک زوردار دھچکا لگا۔ گرتے ہوئے میں نے ٹیسی کی چیخ سنی اور اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ اس وقت میں نے خواہش کی کہ میں بھی اس کے پیچھے جاؤں کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب صرف خدا سے دعا کرنا باقی رہ گیا ہے۔

میں مزید بات کر سکتا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں پہلے ہی انسانی مدد اور امید کھو چکا ہوں۔ جب میں یہ لکھ رہا ہوں تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں لکھنے سے پہلے مرجاؤں یا نہ مروں۔ میں ڈاکٹر کو دیکھتا ہوں جو میرے پاس کھڑا اپنا کام کر رہا ہے۔

یقیناً اس دنیا کے بہت سے لوگ اس سانحے کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب ہوں گے۔ خاص طور پر وہ صحافی جو کتابیں اور لاکھوں اخبارات شائع کرتے ہیں لیکن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف پادری ہی میری آخری باتیں سنے گا اور اقرار کی رازداری کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ ہاں، صحافیوں کو انسانی دکھ لکھنے دو۔ انہیں خون اور آنسوؤں کی کہانی رقم کرنے دو لیکن یہ جاسوس میری کوئی بات نہیں سنیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ٹیسی مرچکی ہے اور میں بھی جلد ہی مرجاؤں گا۔ وہ جانتے ہیں کہ پڑوسی میری غیر انسانی چیخ سے بیدار ہو کر گھر میں آئے اور انہوں نے مجھے زندہ اور دو لاشیں وہاں پائیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں اب اپنے اعتراف کرنے والے سے کیا کہوں گا اور وہ کبھی نہیں جان پائیں گے کہ ڈاکٹر نے ورکشاپ کے کونے میں ایک خوفناک شکل کے ڈھیر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے جو کر جا گھر کے چوکیدار کی جامنی سی لاش تھی، یہ کیوں کہا۔ ”میرے پاس اس بات کی کوئی وضاحت اور کوئی مفروضہ نہیں ہے کہ اس شخص کو مرے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ آخر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مر رہا ہوں۔ کاش یہاں کوئی پادری ہوتا۔

XXX

سانحہ

اُمِ عبداللہ

کہتے ہیں خوش نصیب ہے وہ شخص جسے مخلص دوست میسر ہوں مگر... جب دوست کے روپ میں دشمن مل جائیں تو تصور کرنا بھی محال ہو جاتا ہے کہ وہ اتنی شدت سے بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں... کہ سنبھلنا بھی دشوار تر ہو جاتا ہے... اس کے ساتھ ہونے والا سانحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا کر رہ گیا۔

یقین و بے یقینی کے بھنور میں الجھے دوستوں کا انجام

اس حادثے کو میں اتفاق ہی سمجھ رہا تھا مگر شاہنواز نے جس طرح آہستہ آہستہ اپنی اصلیت دکھائی وہ مجھے ششد و پنج میں مبتلا کر گئی۔

ہم پانچ دوست پنجاب کی معروف یونیورسٹی میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ یاسر، زمان اور محمود تو پنجاب ہی کے مختلف اضلاع سے تعلق رکھتے تھے جبکہ میں اسلام آباد کا باشندہ اور شاہنواز مری سے آگے پتریاٹہ کا رہنے والا تھا۔ وہاں اس کے بزرگوں کی آبائی زرعی زمینیں تھیں۔ ہاسٹل میں ساتھ رہنے کی

نقصان ہوسکتا تھا' میں ان کا ممنون تھا۔

''یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں، سب علاقے چھان مارے ہیں۔'' شاہنواز کی آواز سماعتوں میں اتری۔

''پھر بھی ہمیں کوشش جاری رکھنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خون زیادہ بہہ جانے سے اسے کوئی نقصان پہنچ جائے۔'' یہ یاسر کے جملے تھے۔

''ہاں یار! خون اس کا پہلے بھی بہت ضائع ہو چکا ہے، کہیں کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔'' محمود نے تشویش سے سر جھٹکا۔

''یار! اس کا حال دیکھ دیکھ کر تو مجھے ہول آرہا ہے، چل محمود ہم دونوں ہی کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ شاہنواز تو کسی کام کا نہیں۔'' زمان نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے کاٹیج سے نکلنے لگا۔

''کرلو تم بھی اپنی سی کوشش، مگر دیکھ بھال کر جانا۔ طوفانی جھکڑ چل رہے ہیں اب...... موسم بہت خطرناک ہو گیا ہے۔'' شاہنواز نے پیچھے سے انہیں تاکید کی۔

''اس سے بڑھ کر اور کیا طوفان ہوگا کہ ہمارا جگری یار یوں اس بیابان میں بے یار و مددگار زخمی پڑا ہے اسے خون کی بھی ضرورت ہوگی...... میں بھی آرہا ہوں رُکو!'' یاسر نے رندھی ہوئی آواز میں وہیں سے انہیں آواز دی۔ وہ عجلت میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے کچھ رقم وغیرہ نکالی اور جیکٹ پہنتا ہوا میرے پاس آیا۔

''گھبرانا مت یار! اللہ تمہاری نگہبانی کرے۔'' اس نے محبت سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور فی الفور ان سے جاملا۔ میں کراہتے ہوئے کسمسا کر رہ گیا۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر شاہنواز میرے پاس چلا آیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی وہ داخلی دروازہ بند کر آیا تھا جہاں سے برفیلی ہواؤں کے کاٹ دار جھونکے کمرے کو یخ بستگی کی نذر کر گئے تھے۔

''آگئے ہوش میں تم؟'' شاہنواز میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ آج اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔

''ہاں یار! اللہ تعالیٰ نے جان بچالی، تمہاری مہربانی کہ بروقت مجھے آگاہ کردیا ورنہ تو شاید میں دوسرے جہاں سدھار چکا ہوتا۔'' میرے منہ سے ساتھ ہی کراہ بھی برآمد ہوئی۔ تکلیف کی شدت سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔

''تو دوسرے جہاں میں اب بھی جایا جاسکتا ہے، دیر کس بات کی۔'' اس کی خوبصورت آواز میں اب فرعونوں کے لاؤ ولشکر رہے تھے جو مجھے اچنبھے میں مبتلا کر گئے۔ وہ

اب کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے لگا تھا جس سے اطراف کے مناظر واضح دکھائی دے رہے تھے۔

''ہوا کیا ہے دوست؟'' میں نے دوستانہ تعلق کا بھرم رکھتے ہوئے اس سے اس رویے کے بارے میں استفسار کیا جو میری سمجھ سے باہر ہوچلا تھا۔ بجائے میرے زخموں پر مرہم رکھنے کے وہ نجانے کن مردوں کو اکھیڑنے پر تلا تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔

''تو نے میری محبت چھین لی خرم!'' وہ چلایا۔

اور...... پھر اس نے جو انکشاف کیا وہ مجھے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ رانیہ سے بچپن سے ہی محبت کرتا تھا اور دیار غیر میں اچھی سی نوکری کے بعد اس کا ہاتھ مانگنا چاہتا تھا۔ بقول اس کے میں نے اس کی محبت پر ڈاکا ڈالا اور اسے بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ وہ مستقل ناکامیوں کا سامنا کر رہا تھا جس میں بڑا دخل اس کی فارغ البالی اور روزگار میں عدم دلچسپی تھی، اس کا تعلیمی معیار بھی بہتر نہیں تھا۔

''کیا وہ بھی تمہیں چاہتی تھی شاہنواز؟'' میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

''یہ جاننا تمہارا کام نہیں، جب بندے کے پاس پیسا ہو تو محبت ہو ہی جاتی ہے۔'' نہ جانے اس کی کیا منطق تھی جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ تیز جیپ کے بریک فیل ہونے میں بھی بقول اس کے اس کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ مجھے اس حادثے میں ختم کردینے کے بعد اس بہانے رانیہ کو حاصل کرسکتا تھا۔ وہ مجھے کسی طور بھی زندہ سلامت نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور مجھے اسی طرح بے یار و مددگار دیکھ کر اپنی کمینگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے اس درجہ حسد کرے گا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''تم نے مجھے بتایا تو ہوتا، میں اپنے دوست کے لیے کچھ کر دیتا۔'' میں نے دوستی کا بھرم قائم رکھنا چاہا۔

''چپ چپاتے شادی کر کے تو نے بھنک ہی کب پڑنے دی۔ تو تو گھر والے گھر میں رات گئے ویڈیو بھیج کر میری محبت کا جنازہ نکال دیا تو نے کمینے......!'' غصے سے دانت کچکچاتے اس کے منہ سے کف نکلنے لگا تھا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو شاہنواز؟'' میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ زخموں میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں جو اپنے والدین کی ہتھیلی کا چھالا بنا ہوا تھا، آج ٹوٹی ہڈیوں میں جکڑا بیڈ پر پڑا کسمپرسی کے عالم میں اپنے پروردگار کو یاد کر رہا تھا۔

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

والی کھڑکی کھول دی جہاں کچھ دیر قبل اس نے پردے سرکائے تھے۔ برفیلی ہوا کی تیز لہر جھونکے کی صورت میرے جسم کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے میرا جسم برف بن گیا ہو۔ وہ اب بھی کھڑا تھا اور پھر اس نے ایک ہی جھٹکے سے میرا اسپیل کھینچ لیا جو محمود اور یاسر نے مجھے اوڑھایا تھا۔ نہ جانے وہ کیا ثابت کرنا چاہتا تھا۔ شدید سردی سے میری جان لبوں پر آگئی تھی۔ بے بسی کی انتہا تھی کہ میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی، اب تو سانس بھی میری پہنچ سے دور تھا۔

''بس اب سدھار جاؤ جہاں تو...... دیکھتا ہوں کون آتا ہے تجھے بچانے۔'' اس نے میرے ٹوٹے ہوئے بیڈ کو اٹھا کر ایک طرف پھینکا اور تیزی سے بستر سے اٹھا کر نیچے چھوڑ دیا۔ گرنے سے پہلے ہی میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے ٹوٹے بازو کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا جس سے میرا رکا ہوا خون پھر سے جاری ہوگیا۔ میں درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میری چیخیں سوا ہوگئیں۔ وہ پرانے بدلے لینے پر تلا تھا اور اس انتقام کا مطلب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے کسی بھی طرح اذیت دے کر مارنا چاہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی طرح میرے خون کے اخراج کو جاری رکھنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میری جان جانے کا اندیشہ تھا۔ آہ! یہ بے بسی اور اذیتوں کا عروج......

''رانیہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔'' اس پر خون سوار تھا۔ ''بس اس کے لیے تمہیں مرنا ہوگا۔ کسی کو پتا نہ چلے گا۔ تمہارے ان سب چیلوں کو یہاں سے غائب کردوں گا۔ تمہارا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا ادھر۔ انہیں تو میں نے کمین سے پاگلوں کی طرح پرے کردیا ہے۔ جلد ہی تمہاری موت کی خبر بھی کسی طرح تمہارے گھر والوں کو مل جائے گی۔ تمہارے سیل فون پر ریکارڈ ویڈیو بھی حادثے کی گواہی دے گی۔ سوگ میں ڈوبی ''بھابی'' ہفتہ، مہینے بعد جب ''فارغ'' ہوجائے گی تو شرعاً اس کی عدت بھی ختم ہوجائے گی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور نہ ہی اس کا حصول میرے لیے کوئی مشکل کام ہے بلکہ بیوہ کے لیے کنوارے کا رشتہ تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اپنے راج میں رانیہ کو ملکہ بنا کر رکھوں گا اپنی اور بچے کو باپ کا پیار بھی دوں گا۔ آخر کو وہ میرے دوست کی اولاد ہے۔'' نہ جانے وہ کیا کیا بکے جا رہا تھا۔ ادھر میری حالت [illegible]

چیکنگ

نیر وین نے اپنے پڑوسی ... سے ... تے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے ارشاد کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئی ہیں۔ یہ حادثہ کیسے ہوا؟''

''اس نے یہ دیکھنے کے لیے ایک گھوڑے کے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ اس کے کتنے دانت ہیں۔'' ... نے بتایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' نیروین نے دریافت کیا۔

''گھوڑے نے یہ دیکھنے کے لیے اچانک منہ بند کرلیا کہ ارشاد کے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔'' ... نے جواب دیا۔

مرسلہ: اویس علی، سرگودھا

پہچان

ایک پاکستانی سیاح کو گائیڈ نے پیسا کا مشہور عالم مینار دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ پیسا کا ٹیڑھا مینار جسے لوگ دنیا بھر سے دیکھنے آتے ہیں۔''

پاکستانی سیاح نے اوپر سے نیچے تک مینار دیکھا اور منہ بنا کر بولا۔ ''اس میں تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اس ٹھیکیدار کی بنائی ہوئی کئی عمارتیں ہمارے ہاں کراچی میں بھی موجود ہیں۔''

مرسلہ: نازیہ جہانگیر، ملتان

دوستوں کو نکلے کافی دیر ہوگئی تھی۔ وہ اس دوران کمرے میں ادھر ادھر چکراتے پھرتے طنز کے تیر برساتا میرے زخموں پر نمک پاشی کرتے میرے جگر کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔ میں دہری اذیت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ حادثے سے بڑھ کر یہ ساتھ میرے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ میرا سامنا ایسے حالات سے ہوگا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں پہلے ہی اس انکشاف سے سنبھلا نہیں تھا اور اب اس کی بے وفائی اور دل میں چھپی کدورت نے رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے اکیلا اور تنہا دیکھ کر بجائے میرے ساتھ مزید کیا سلوک کرنے والا تھا۔ میں تو اللہ کر اس کا بڑھتا ہاتھ بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ حیرت میں تھا کہ جیپ گہری کھائی میں گرنے کے باوجود میں زندہ کیوں بچ گیا؟ جس کے لیے میں ... نے ... جان نچھاور کی، آج وہ میری ہی جان

قسط: 33

زندگی پیار ذ نت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کی مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ بزورِ بازو کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

رپورٹ چاہیے۔ کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے؟ سب معلوم ہونا چاہیے۔'' یہ حکم جاری کرتے ہوئے وہ ایک مختلف رخ پر سوچ رہی تھی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ جیسے وکی کی موت کی مکمل تفصیل رہائی کے باوجود وہ منظر پر آ گیا تھا، ممکن تھا کہ لالہ بھی اسی طرح زندہ ہو اور اس کی خودکشی ایک سوچا سمجھا ڈراما ہو۔

''او کے میڈم! اور کوئی حکم؟'' سامنے کھڑے غلام نے تابعداری سے پوچھا۔

''فی الحال یہ کام اچھی طرح کرو۔ مجھے امید ہے کہ یقیناً کچھ ضرور نکل کر آئے گا۔'' میڈم نے جواب دیا اور اشارے سے جانے کی اجازت دی۔

وہ چلا گیا تو اس نے اپنا جام ختم کیا اور کچھ دیر کسی ان دیکھے نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر اپنا موبائل نکالا۔ اس جدید موبائل کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس پر آنے جانے والی کالز کا ٹریس ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر انگلی پھیرتے ہوئے اس میں محفوظ کانٹیکٹس نکالے اور ڈیوڈ کا نام منتخب کر کے کال ملائی۔ دوسری ہی گھنٹی پر اس کی کال وصول کر لی گئی۔

''کیا اطلاعات ہیں ڈیوڈ؟'' اس کے لہجے میں بے چینی سی چھپی ہوئی تھی۔

''گاڑی کو حادثہ پیش آنے کی تصدیق ہو گئی ہے۔ حادثہ شدید تھا۔ میرا ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچا لیکن معاذ اور سونیا کے ساتھ ساتھ اس کے سارے ساتھی حیرت انگیز طور پر غائب ہیں۔''

''کیا مطلب ہے، غائب ہیں؟ اگر تمہارے آدمی مُردہ حالت میں پائے گئے ہیں تو باقی لوگوں کو بھی مردہ یا کم از کم زخمی حالت میں ان کے ساتھ ہی پایا جانا چاہیے تھا۔''

''ہونا تو یہ چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا ہے اور جائے وقوعہ کے معائنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ یقیناً وہی لوگ انہیں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''کون لوگ؟ کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ؟'' میڈم ایکس نے اس کی دی اطلاع پر تیز لہجے میں پوچھا۔ ویسے اس اطلاع نے غیر محسوس طور پر اس کے اندر تبدیلی پیدا کی تھی اور وہ ریلیکس دکھائی دینے لگی تھی۔

''یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن جو اطلاعات ملی ہیں، ان کی روشنی میں امکان ہے کہ انہیں چینی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''چینی...؟'' اس نے اچنبھے سے استفسار کیا۔

''چینی کہاں سے آ گئے وہاں؟''

''چینی جنگجو وقتاً فوقتاً ان علاقوں میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر ان کی آمد و رفت اپنے مذہبی پیشوا سے ملاقات کے لیے ہوتی ہے لیکن اڑتی اڑتی معلومات کے مطابق ان جنگجوؤں کے بھیس میں کچھ جاسوس بھی موجود ہوتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اسے بتایا۔

''اگر ایسی اطلاعات ہیں تو تمہارے پاس ان جنگجوؤں کے بارے میں مکمل معلومات ہونی چاہیے تھیں۔''

''ان کے بارے میں معلومات رکھنا میرے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ مجھے جو ذمے داریاں سونپی گئی ہیں، میں انہیں اب تک احسن طریقے سے پورا کرتا رہا ہوں۔ موجودہ مسائل تم اور تمہاری ٹیم کے پیدا کردہ ہیں۔'' اس کے اعتراض پر ڈیوڈ کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''چینی خطرناک لوگ ہیں ڈیوڈ! اور دنیا کے موجودہ حالات میں ہم ان کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ وہ کبھی بھی، کسی بھی وقت ہماری راہ پر لگ سکتے ہیں۔'' اس نے اپنا لہجہ قدرے نرم کیا۔

''اسی وجہ سے ہم ان سے دور دور رہتے ہیں لیکن تمہاری وجہ سے لگتا ہے اب ہمارا ان سے پالا پڑنے والا ہے۔ تمہیں پتا ہے سونیا میرا گولڈن استارا اپنے ساتھ لے گئی ہے اور اگر چینیوں نے اس کے پاس سے وہ برآمد کر لیا تو پھر وہ اس سے ایک ایک بات معلوم کیے بغیر اس کی جان نہیں چھوڑیں گے۔'' ڈیوڈ نے یہ اطلاع دے کر اس کا سارا اطمینان رخصت کر دیا۔

''سونیا گولڈن استارا اپنے ساتھ لے گئی ہے، اس بات کا کیا مطلب ہے؟ وہ کوئی اپنی مرضی سے تو نہیں گئی ہے۔ تمہارے لوگوں نے یہ کام کیا ہے اور ان کا فرض تھا کہ ہر فرد کی مکمل تلاشی لیتے۔'' وہ سونیا کے بارے میں یہ اطلاع سن کر بے چین ہوئی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈیوڈ سے باز پرس نہ کرتی۔

''کوتاہی کرنے والوں کو ان کے کیے کی سزا مل چکی ہے لیکن یہ سوچو کہ اگر سونیا چینیوں کے سامنے زبان کھول دیتی ہے تو تنظیم کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''سونیا کوئی عام لڑکی نہیں ہے جو چینی اس سے آسانی سے کچھ معلوم کر لیں۔''

[illegible]

کے جذبات میں عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ تمہاری بیٹی تو پہلے ہی بہت عجیب کام کرتی پھر رہی ہے۔'' ڈیوڈ کا ایک طعنہ اس کے موڈ کو سبوتاژ کرنے کے لیے کافی تھا۔

''وہ ہماری ایک نہایت تربیت یافتہ کارکن ہے ڈیوڈ! اس کی موجودہ کوتاہیاں اس کے ماضی کے کارناموں کو دھندلا نہیں سکتیں۔ تم اگر اسے اپنے تربیتی کیمپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ دوبارہ ہمارے لیے کارآمد بن سکتی تھی۔ میں نے تو پروفیسر وکٹر تک کو راضی کر لیا تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر سونیا کی ذہن سازی کریں۔'' اس بار میڈم کا انداز زرا افسردہ تھا۔

''حادثے اور اتفاقات کبھی بھی، کسی بھی پلاننگ کو تباہ کر سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو ان علاقوں میں سفر کرنا کتنا مشکل ہے۔ میں نے انہیں کیمپ تک بھجوانے کے لیے ٹھیک ٹھاک اسٹیبلشمنٹ کی تھی اور امید تھی کہ تربیت کے بعد ایک بہترین ٹیم میدان میں بھیجنے کے لیے تیار ہو گی لیکن اس کے بالکل برعکس ہوا اور صورتِ حال یہ ہے کہ ہم خود مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ بھی درحقیقت الجھا ہوا اور پریشان تھا۔

''کیمپ پر موجود افراد میں سے کچھ کو جنگجوؤں کی راہ پر لگا دو۔ ہمارے آدمی اگر جنگجوؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو صورتِ حال بدل کر ہمارے حق میں بھی ہو سکتی ہے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ ہم لیٹ ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس حادثے کی اطلاع دیر سے پہنچی تھی اور جنگجوؤں کو علاقے سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ ویسے بھی وہ ان راستوں کے کیڑے ہیں اور کسی تعاقب کار کو دھوکا دے کر بہت آسانی سے بھاگ سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ کے پاس اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔

''سونیا کو کھونا ہمارا بہت بڑا نقصان ہو گا ڈیوڈ!'' اسے خود بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی کیفیت کا اظہار کرے۔

''ان جنگجوؤں میں اگر جاسوس بھی شامل تھے تو ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو سیدھا بیجنگ پہنچایا جائے گا۔ اگرچہ وہاں ہمارا زیادہ مضبوط سیٹ اپ نہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ جو لوگ موجود ہیں، وہ اہم معلومات جمع کر کے دے سکیں۔'' ڈیوڈ نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے اپنی کہی۔

''ٹھیک ہے ...

''ہمارا پیچھا ہو رہا ہے استاد!'' اصغر کو ٹھکانے سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈرائیور نے اسے اطلاع دی۔

''کون ہیں یہ، کس کے...'' اصغر فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا اور خود بھی بیک ویو مرر میں تعاقب کاروں کو دیکھنے کی کوشش کی۔

''نیلی ہنڈا ہے۔ میں نے اپنے اڈے کے پاس بھی اسے دیکھا تھا اور اب پھر یہ اپنے پیچھے دکھائی دے رہی ہے۔'' ڈرائیور نے نشاندہی کی۔

''ذرا اِدھر اُدھر کے پھیرے مار کر کنفرم کر پھر دیکھ لیتے ہیں سالوں کو۔'' اصغر گالی کے بغیر کم ہی بات کرنے کی عادت تھی اور اس وقت تو وہ یوں بھی زیادہ محتاط تھا کہ لالہ ...

قدم کیا ہو گا؟'' اس نے وہ سوال کیا جس کا جواب خود بھی جانتی تھی۔

''تم جانتی ہو، وہاں سے ان لوگوں کو نکالنا ہمارے لیے تقریباً ناممکن ہو گا اس لیے تنظیم کے مفادات کے لیے سخت فیصلے کرنا پڑیں گے۔'' ڈیوڈ کا جواب صاف تھا۔ حقیقتاً ان لوگوں کی موت کے سوا اب ان کے پاس کوئی حل نہیں رہ گیا تھا۔

''مجھے افسوس ہے راجیل! لیکن تنظیم اور اس کا تحفظ ہر شے سے اوپر ہے۔''

''ہاں۔ تنظیم اور اس کا تحفظ ہر شے سے اوپر ہے۔'' اس نے ڈیوڈ کے الفاظ نہیں، اپنا عہد دہرایا۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

''وہ کیا؟''

''مکمل شاہ کا بیٹا میرے پاس ہے اور میرے خیال میں تم مقامی معاملات کو سنبھالنے کے لیے اس بچے کا استعمال کر سکتی ہو۔ لطیف سومرو کے ناکارہ ہونے کے بعد اس علاقے میں کام کرنے کے لیے تمہیں کسی اور بڑے وڈیرے کی مدد درکار ہو گی اور اس بچے کے نانا اور دادا دونوں ہی بااثر وڈیرے ہیں۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنائی۔'' ڈیوڈ کی دی اطلاع سن کر اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اگر وہ اپنے دل میں جھانک کر دیکھتی تو وہاں خوشی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہاں اس کی ممتا چیخ رہی تھی۔ راجیل سے میڈم ایکس تک کا سفر اس نے ہر بار اپنی ممتا کو کچل کر ہی طے کیا تھا۔

☆☆☆

ہی وفادار لوگوں کے سوا کسی کو لالہ کے زندہ سلامت ہونے اور واپس لوٹ آنے کی خبر نہیں تھی۔ احتیاطاً کچھ شخصوں کو ملوث رکھتے ہوئے لالہ نے بھی وہاں قیام کو مناسب نہیں سمجھا تھا اور ابھی ایک خفیہ کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ حامد کو بھی اسی کوٹھی میں رکھا گیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کی تلاش میں اڈے کا رخ کرے تو اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔

"صحیح بولتا ہے۔ سالے ماں کے یار مستقل پیچھے لگے ہوئے ہیں۔" تعاقب کرنے والے اگرچہ احتیاط کر رہے تھے لیکن مسلسل فوکس کرنے سے تصدیق ہو گئی تھی کہ نیلی کار کبھی فاصلہ بڑھا کر تو کبھی گھٹا کر مسلسل تعاقب میں ہے۔ اصغر نے تعاقب کرنے والوں کو بلاتکلف مزید دو چار گالیوں سے نوازتے ہوئے اپنا موبائل نکال کر نمبر ملایا اور کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔

"بندے تیار کر ٹونی اور پہنچ میرے پاس۔ کچھ آوارہ کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ان کو ان کی آوارگی کا مزہ چکھانا ہے۔" احکامات دیتے ہوئے اس نے ٹونی کو اپنے محل وقوع کے متعلق بھی بتا دیا۔

"یہاں سے نکل کر ہم سیدھا بڑے والی ہاؤسنگ اسکیم جانے والی سڑک پکڑیں گے۔ ہماری اسپیڈ کم ہوگی۔ تو شارٹ کٹ مار کر تیزی سے آیا تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی وہاں پہنچ جائے گا۔"

"تو میری فکر نہ کر۔ ان حرام کے پلّوں کو حملہ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ میرے پیچھے لگنے سے ان کا کوئی اور مطلب ہے۔" لالہ نے پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کر دیا تھا کہ حامد کے والی وارث اس کا کھوج لگانے کے لیے ان کی طرف ضرور رخ کریں گے اس لیے اسے فوراً سمجھ آ گئی تھی کہ تعاقب کار کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

"آگے پیٹرول پمپ پر روک کر ٹینکی فل کروا لے۔ ٹونی کو پہنچنے کے لیے تھوڑا ٹائم مل جائے گا۔" کال منقطع کرنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو حکم دیا تو اس نے سمجھنے کے انداز میں سر کو جنبش دی اور پانچ منٹ بعد ہی گاڑی ایک پیٹرول پمپ پر لے جا کر کھڑی کر دی۔ اگرچہ وہ کسی حملے کی امید نہیں کر رہے تھے پھر بھی احتیاطاً اپنے ہتھیار تیار کر لیے تھے کہ ایسا کچھ ہونے کی صورت میں اپنا دفاع کیا جا سکے۔ توقع کے مطابق کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اور نیلی کار انہیں چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس موقع پر اس نے نوٹ کیا کہ کار میں ڈرائیور سمیت تین افراد موجود ہیں۔

[illegible]

اطمینان سے آگے بڑھے۔ نیلی کار سب تو تھی آگے جا کر منتظر کھڑی تھی۔ کار والوں نے اگرچہ کوشش کی تھی کہ سڑک پر موجود گڑھے میں پھنس کر ناکارہ ہو جانے والی بس کی آڑ میں خود کو پوشیدہ رکھ سکیں لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے۔

"دیکھ آرہے ہیں سڑک چھاپ عاشق۔" کچھ مزید آگے جا کر نیلی کار ایک بار پھر ان کے پیچھے دکھائی دی تو اصغر نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے تعاقب کار کا اعلان کیا۔

ابتدا میں راستہ پُررونق تھا لیکن جیسے جیسے وہ بڑے والی ہاؤسنگ اسکیم سے قریب ہوتے گئے ٹریفک کم ہوتا شروع ہو گیا۔ یہ کم ہوتا ٹریفک ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہی بالکل برائے نام ہو گیا۔ اسی وقت اصغر نے اپنے موبائل پر ٹونی کی کال موصول کی۔

"ہم ہاؤسنگ اسکیم کے قریب پہنچ گئے ہیں استاد اور ہمیں اپنے آگے ایک نیلی ہنڈا جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔"

"وہی ہے سالی۔۔۔ لگا رہ پیچھے۔ تھوڑا اور آگے آنے پر دونوں مل کر دبا لیں گے۔" اصغر نے جوش سے جواب دیا۔ فی الحال اسے عقب نما آئینے میں نیلی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"بس، ادھر ہی روک لے۔ آتے ہوں گے کتے کے۔۔۔ یہیں دبوچ لیں گے انہیں۔" اس نے ڈرائیور کو رک جانے کا حکم دیا۔ اس کے خیال میں نیلی کار والوں نے انہیں ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر چڑھتے دیکھ کر قصداً فاصلہ بڑھا لیا تھا کہ کہیں اس خالی سڑک پر وہ ان کی نظر میں نہ آجائیں۔ ابھی انہیں گاڑی روکے مشکل سے آدھا منٹ ہی گزرا ہوگا کہ ایک بار پھر ٹونی کی کال آنے لگی۔

"وہ ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر نہیں چڑھے استاد! بالکل عین وقت پر انہوں نے یوٹرن مار لیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ سمجھ گئے ہیں کہ ہم انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ٹونی نے اس کے ہیلو بولنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور کال ملتے ہی جلدی جلدی اطلاع دینے لگا۔

"روک سالوں کو۔ بھاگ کر جانے نہ پائیں۔" اصغر نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی اپنے ڈرائیور سے بھی مخاطب ہو کر بولا۔ "پیچھے لے چل۔ سالے چوہے بھاگ رہے ہیں۔" ڈرائیور نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہی رکھا ہوا تھا چنانچہ فوراً ہی گاڑی ریورس کی۔ اسی وقت فضا میں گولیوں کی

[illegible]

مشین گن کا ہے۔ اس فائرنگ کا جواب دینے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا اور یقینی طور پر ٹونی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بھی ایک وقت دو ہتھیار چلے۔

"ہیپی ڈبل نومبر سے شیر دا بھاگنے مت دینا۔" اصغر وہیں بیٹھے بیٹھے چلایا۔ جوش میں اس نے اپنے ہتھیار کو ہاتھوں میں تھام کر اس کی نال کھڑکی سے باہر نکال لی تھی لیکن آگے ٹونی اور اس کے ساتھیوں کی گاڑی ایک جگہ کھڑی دکھائی دی تو اس کے جوش کی جگہ تشویش نے لے لی۔ قریب پہنچنے پر وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ گاڑی کے ٹائر برسٹ ہو چکے تھے اور دو افراد گاڑی کے ٹائروں کو بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیلی کار کا سڑک پر دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

"انہوں نے پہلی بار میں ہی دونوں طرف کی کھڑکیوں سے فائر کر کے سیدھا ہماری گاڑی کے ٹائروں کو بیکار کیا اور اسپیڈ بڑھا کر بھاگ نکلے۔ ہم نے بھی فائر کیا پر وہ بچ کے نکل چکے تھے۔" ٹونی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کچھ شرمندہ تھا۔

"چل، کوئی بات نہیں۔ بھاگ گئے سالے بزدل چوہے۔ تم لوگ ٹائر بدل کر واپس جاؤ، ہم بھی اپنے رستے جاتے ہیں۔" اصغر نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔

"اگر تھوڑی دیر ویٹ کر سکو تو ہم ٹائر چینج کر کے سیکیورٹی کے لیے ساتھ چلتے ہیں۔" ٹونی نے پیشکش کی۔

"پہلے ہی اس چکر میں لیٹ ہو گیا ہے یار! اب اور دیر نہیں کر سکتا۔" اصغر اس سارے ہجوم کو لالہ کی رہائش گاہ تک نہیں لے جانا چاہتا تھا اس لیے ٹونی کو ٹال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ لیکن اب انہوں نے اپنے تعاقب کا پہلے سے زیادہ خیال رکھا تھا چنانچہ لالہ والی کوٹھی میں قدم رکھتے ہوئے پوری طرح مطمئن تھے۔

"بہت لیٹ ہو گیا اصغرا! پتا ہے نا اپنے کو ٹائم کی پابندی کرنے والا بندہ پسند ہے۔" لالہ کے روبرو حاضر ہوتے ہی اسے وہ سننا پڑا جس کا خدشہ تھا۔

"راستے میں گڑبڑ ہو گئی تھی لالہ!" دنیا بھر کو منہ بھر کے گالیاں دینے والا اصغر، لالہ کے روبرو آواز بھی اونچی کرنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔

"کیسی گڑبڑ؟" لالہ سن کر چونک گیا۔ جواباً اصغر نے ساری کتھا سنا ڈالی۔

[illegible] اس کا مطلب ہے ہم پر حامد کے اغوا کا

شک کیا جا رہا ہے۔" لالہ نے ایک زوردار ہنکارا بھرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"حالات سے تو یہی ظاہر ہے۔" اصغر نے تائید کی۔

"حالات سے تو یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اڈے کی خبریں باہر لیک ہو رہی ہیں۔" لالہ کے لہجے میں گمبھیر سنجیدگی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اصغر سن کر اچھل پڑا۔

"ایسا ہی ہو رہا ہے اصغرا! تیرے پاس سے یہ خبر نکل کر مخالفین تک پہنچی ہے کہ حامد وہاں نہیں ہے اس لیے وہ لوگ تیرا پیچھا کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔" لالہ کے لیے یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اصغر کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں رہا۔

"کڑی نظر رکھ ہر طرف۔ غدار اور مخبر سے بڑھ کر کوئی خطرناک نہیں ہوتا۔" لالہ نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے نرم الفاظ میں نصیحت کی پھر موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"حامد نے میڈم ایکس کا جو ایڈریس دیا تھا، اس کی نگرانی کروا رہے ہو یا نہیں؟"

"بالکل لالہ! چوبیس گھنٹوں کے لیے بندوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔"

"خیال رکھنا، بس دور دور سے نگرانی ہو۔ نہ نظر میں آنا ہے، نہ کوئی چھیڑ چھاڑ کرنی ہے۔ بہت ہوشیار بندے بٹھانے ہیں نگرانی پر۔" لالہ نے یاددہانی کروائی۔

"جو حکم لالہ!" اصغر نے سیدھے سیدھے تابعداری کا مظاہرہ کیا اور یہ یاد دلانا قطعی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ یہ ساری ہدایات پہلے بھی دے چکا ہے۔

"دیوا کی بڑی فکر ہے مجھے۔ دیوا نے بھی اب تک کوئی اطلاع نہیں دی۔" لالہ نے بڑبڑاتے ہوئے جام اٹھا کر منہ سے لگایا۔

"سنا تھا دیوا کے اپنے برے دن چل رہے ہیں اور وہ پولیس کے ڈر سے انڈر گراؤنڈ ہے۔" اصغر نے جھجکتے ہوئے دیوا کے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

"ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے اور دیوا تو ابھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ اسے ایڈجسٹ کر لے گا۔ باقی رہی میرے کام کی بات تو وہ تو دیکھ لینا کہ ہو کر رہے گا۔ بڑے کانٹیکٹس ہیں اس نامراد عاشق کے اپنے ویسٹ میں۔" دیوا کے خیال سے لالہ کی آنکھوں میں

[illegible]

ہوتے تھے۔ بیرون ممالک سفر میں بھی ایک دوسرے سے

کی اطلاع ملی۔" دیوا نے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

"گل خان ....!" لالہ کے ذہن میں حامد کا بتایا ہوا نام موجود تھا اس لیے فوراً زبان سے پھسل گیا۔

"ہاں، ہاں۔ یہی نام ہے۔ میں پولیس ریکارڈ سے کنفرم کروا چکا ہوں۔" دیوا نے تصدیق کی۔

"وکی اس بنگلے میں کیسے اور کیا کرنے گیا تھا، اس بارے میں گل خان نے کچھ بتایا ہے؟" لالہ نے سنبھل کر سوال کیا۔

"پولیس کو تو اس نے کچھ نہیں بتایا حالانکہ پولیس والوں نے مار مار کر اس کی حالت پتلی کر دی ہے پر اپن نے اپنے ایک بندے کو تھانے میں گھسا کر اس سے بہت کچھ پتا کرایا ہے۔" دیوا نے فخر سے بتایا۔

"تیرے بندے کے سامنے کیسے زبان کھول دی اس نے؟ ایسا کہیں نہیں ہوا ہے کہ پولیس کی ہی کوئی چال ہے؟"

"ہو تو شک اور سالا شروع میں پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دے رہا تھا پر میرا آدمی بھی پوری تیاری سے گیا تھا۔ پولا آگے پیچھے کا داستان سنا کر ثابت کیا کہ اپن تیرے معاملے صاحب، سونیا میڈم، گل بی بی اور باقی سب کو جانتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وکی، سونیا میڈم اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرتا ہوا پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ اس نے یہ بھی وشواس دلایا کہ وہ وکی اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بس پھر سالا پٹھان پھسل گیا اور سب اگل دیا۔" دیوا اسے تفصیل بتا رہا تھا لیکن اس کا ذہن تو معاذ کے نام پر اٹک گیا تھا۔

"یہ معاذ .... معاذ کون ہے؟" تصدیق کے لیے کہ یہ معاذ وہی ہے جو علیزہ کا بھائی ہے، اس نے دیوا سے پوچھا۔

"یہ معاذ بڑی دکھری چیز ہے۔ وہی بندہ جو میرے پاس اپنے دوستوں کو چھڑوانے میں مدد کے لیے میرے پاس آیا تھا۔ اپنے بارے میں جانکاری نہیں دی تھی اس نے لیکن اپن نے ہاتھ پاؤں مار کر پتا لگا ہی لیا تھا۔ اسی کی مالا جپتا تیرا وکی اس بنگلے میں گیا تھا۔ گل خان بتاتا ہے کہ اس نے سونیا کو اس بنگلے میں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ معاذ اور دوسرے ساتھی بھی وہیں ہوں گے۔ وہ سب الگ الگ پوائنٹ سے بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے تو وکی نے اسے کال [illegible] ان باتوں ماننا پڑی تھیں

ان کو پورا یقین ہے کہ وکی بچا نہیں بیٹھا ہوگا اور اس بنگلے میں ضرور گھسا ہوگا جہاں اس نے سونیا کو دیکھا تھا۔ اب اس کو دو ہی شک ہیں۔ ایک یہ کہ پولیس نے سب کو اریسٹ کر کے پچھلے دوار سے صاحب کے حوالے کر دیا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ سب بھی بنگلے کی آگ میں جل کر مر گئے ہیں لیکن پولیس اصل بات چھپا رہی ہے۔" دیوا نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

"جلنے والے بنگلوں کے مالکان کون تھے؟"

"ان کے بارے میں، میں نے جانکاری کی کوشش نہیں کی۔ بس اتنا سنا ہے کہ دونوں بنگلے والے آپس میں رشتے دار ہیں اور ساتھ مل کر کہیں گھومنے پھرنے گئے ہوئے ہیں۔"

"وہاں آگ کیسے لگی تھی؟" لالہ نے جذبات کو سنبھال لیا تھا اور ایک کے بعد ایک تابڑتوڑ سوال کر رہا تھا۔ قریب کھڑے اصغر کو سوالات کی نوعیت نے بے چین کر دیا تھا لیکن ظاہر ہے وہ گفتگو میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔

"پولیس کی رپورٹ کے انوسار شارٹ سرکٹ ہوا تھا لیکن ایک چوکیدار کا کہنا ہے کہ اسے وہاں کسی کیمیکل کی بو محسوس ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ آگ لگی نہیں بلکہ لگائی گئی ہو۔"

"ہو سکتا ہے وکی اور دوسرے لوگوں نے پولیس کی توجہ ہٹانے اور فرار کا موقع پیدا کرنے کے لیے خود وہ آگ لگائی ہو۔" لالہ نے امید ظاہر کی۔

"اپنے کو ایسا نہیں لگتا۔ پولیس جیسے میڈیا سے کچھ چھپا رہی ہے، اس سے اپنے کو بھی لگتا ہے کہ پولیس نے کوئی پکڑ کیا ہے۔ دوسرے وہ منڈا معاذ بھی دوسری طبیعت کا ہے۔ اپنا من نہیں مانتا کہ وہ خود کو بچانے کے لیے دو بسے بسائے گھروں کو زندہ انسانوں سمیت جلا کر بھاگ گیا ہوگا۔" دیوا نے دلیل دی تھی۔ اس کی معاذ کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کچھ قصے دلیپ نے بھی سنائے تھے اس لیے اسے ماننے میں تامل تھا کہ یہ سب معاذ نے کیا ہوگا۔

"ٹھیک ہے پھر۔ تو اپنی آنکھیں کھلی رکھ اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اگنور نہ کر۔ میں تجھ سے اس بارے میں اپ ڈیٹ لیتا رہوں گا۔"

"جو تیری اچھا۔"

"اور ہاں، اس کام کا خرچہ پانی تیرے [illegible] کرنا پڑے، کام رکنا نہیں چاہیے۔" لالہ خود [illegible]

کا باشندہ تھا اور جانتا تھا کہ مجرم بننے والا تقریباً ہر شخص پیسے کے لیے غیر معمولی محبت رکھتا ہے اس لیے خرچے پانی کے نام پر وہ کوئی بھی مطلوبہ معلومات دینے کے لیے تیار تھا۔

"نہیں رکے گا۔" دیوا نے اسے یقین دہانی کروا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

لالہ کال سے فارغ ہو جانے کے باوجود کسی حکم کے منتظر کھڑے اصغر کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اصغر کی ہمت نہیں تھی کہ اسے اس سوچ سے نکال کر اپنی طرف متوجہ کرتا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار لالہ کو اس درجہ متفکر دیکھا تھا۔

☆☆☆

سونیا کو ہوش آیا تو درد کی تیز لہر نے اسے بے ساختہ کراہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے موجود چہروں کو دیکھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اس کی زبان کھلوانے کے لیے اب تک اس پر تشدد کرتے رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر تشدد برداشت کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

"کیسی ہو دیوی جی؟" ہندی سے واقف نارنجی لبادے والے جگشو زانگ تانے میٹھے لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"ایسے منہ نہ پھیرو دیوی جی! تم منہ پھیرو گی تو ہمیں ہمارے سوالوں کا جواب کون دے گا؟" جگشو نے اسے چھیڑا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر دوسری طرف دیکھتی رہی۔

"یہ تو انیائے ہے دیوی جی! ہم آپ سے اتنے پریم سے بات کر رہے ہیں اور آپ ہماری طرف دیکھتی بھی نہیں۔" جگشو کا لہجہ بناوٹی تھا۔

"فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو اور مجھ پر جو ظلم کرنا ہے کرو۔ ہو سکتا ہے کسی اسٹیج پر آ کر میری برداشت جواب دے جائے اور تم اپنا مقصد حاصل کر لو۔" اس بار سونیا نے رخ بدلا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں بولی جیسے اسے چیلنج کر رہی ہو۔

"اتنا غصہ نہ کریں شریمتی جی! یہ تو ہماری مجبوری تھی جو ہمیں آپ پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا ورنہ ہم بڑے شانتی والے لوگ ہیں۔ اب بھی ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کوئی آپ کو انگلی بھی نہیں لگائے گا۔" وہ نرم اور میٹھے لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن سونیا کو اس لہجے کی تہ میں کچھ اور محسوس ہو رہا تھا۔ [illegible]

"ہم نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کر دی تھی پر اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں اس سے آپ کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔ آپ مر تو جائیں گی پر ہماری اچھا کے انوسار اپنی زبان نہیں کھولیں گی۔ پر ایسا بھی نہیں کہ آپ کی زبان کھلوانے کا کوئی اپائے ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔ اپائے ہے اور اب ہم اسی کو آزمانے جا رہے ہیں۔"

"آزما کر دیکھ لو۔" جگشو کے ذہن میں کیا ہے، یہ تو وہ نہیں سمجھ سکی تھی لیکن خود کو اس کے سامنے کمزور ظاہر کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

"بس تو پھر دل تھام کر بیٹھیے شریمتی جی! ابھی یہ پردہ ہٹے گا تو آپ اپنے ایک ساتھی کو اپنے سامنے دیکھیں گی۔ ہم اس کو اس وقت تک مارتے رہیں گے جب تک آپ زبان نہ کھول دیں یا وہ اپنی جان سے نہ چلا جائے۔ ایک مرے گا تو ہم اس کی جگہ دوسرے کو لے آئیں گے اور دوسرے کی جگہ تیسرے کو پھر دیکھیں گے کہ آپ اپنی ضد پر اپنے کتنے ساتھیوں کو بلی چڑھاتی ہیں۔" اب جگشو زانگ تا کے لہجے سے نرمی غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سفاکی نے لے لی تھی۔ وہ پہلے والی سونیا ہوتی تو اس دھمکی سے ذرا متاثر نہ ہوتی لیکن اس وقت وہ اندر سے کانپ گئی تھی۔

"یہی کر کے دیکھو۔" ڈر جانے کے باوجود اس نے اپنا ڈر ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا اور سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر ایک بار پھر منہ پھیر لیا۔ اسے منہ پھیرتے دیکھ کر جگشو دھیرے سے مسکرایا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اگلے لمحے وسیع و عریض جھونپڑے کو دو حصوں میں منقسم کرنے والا پردہ ہٹ گیا۔

"تمہارا پہلا ساتھی، تمہاری ضد کی بھینٹ چڑھنے کو تیار ہے۔ نظریں نہ چراؤ اور اسے اپنی آنکھوں سے مرتا ہوا دیکھو۔" جگشو نے اسے مخاطب کیا لیکن اس نے رخ موڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار شڑاپ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ جانتی تھی یہ کوڑا ہے جو پوری قوت سے کسی انسانی جسم پر برسایا گیا ہے۔ کوڑے کی آواز کے ساتھ ہی انسانی چیخ بلند ہونے کی منتظر اس کی سماعت کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور پوری جان سے کانپ گئی۔

☆☆☆

"ہاں پرویز! بول کیا قصہ ہے۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟" اصغر فون پر اپنے ایک آدمی سے رپورٹ لے رہا تھا۔

[illegible]

طریقے اور احتیاط سے ہونا چاہیے۔ میں نے سردار کو سارا ضروری سامان پیک کرنے کا بول دیا تھا تو اسے فون کر کے ایڈریس لکھوا دے، وہ سامان پہنچا دے گا۔ تو بس اس بات کا خیال رکھنا کہ اگلی پارٹی بہت چالاک ہے اس لیے تم لوگوں سے کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔" پرویز کو ہدایات جاری کرتے ہوئے اس نے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔

"میں دیکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے آدھے پونے گھنٹے میں، میں خود ادھر کا چکر لگاؤں۔ اگر نہ بھی آسکا تو تم سب اچھی طرح سنبھال لینا۔" آخری ہدایت دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر آنے والے مناظر دیکھنے لگا۔ یہ اڈے کے مختلف حصوں کے مناظر تھے۔ وہ چاہتا تو ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے وہاں کی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ ساتھیوں میں کسی غدار کی موجودگی کے شک کے باعث یہ سسٹم حال ہی میں نصب کروایا گیا تھا۔ اتفاق تھا کہ بجلی سے متعلق چند چھوٹے موٹے کام کافی دنوں سے اٹکے ہوئے پڑے ہوئے تھے۔ مرمت کے بہانے بھروسے کے الیکٹریشنز بلوائے گئے اور ساتھ ساتھ خفیہ کیمرے اور مائیک وغیرہ نصب کروا دیے گئے۔ اس سارے سیٹ اپ کی صرف چند ایک لوگوں کو ہی خبر تھی اور انہیں اصغر نے سختی سے زبان بندی کا حکم دے دیا تھا۔ وہ موقع ملنے پر خفیہ کیمروں کی مدد سے اپنے آدمیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ سسٹم میں ریکارڈنگ کا آپشن بھی موجود تھا اور اس وقت اس کا ریکارڈنگ ہی دیکھنے کا ارادہ تھا اس لیے پرویز کو آدھے پونے گھنٹے بعد پہنچنے کا بتایا تھا۔

"عرفان اللہ آیا ہے استاد!" ابھی اس نے ریکارڈنگ کھولی بھی نہیں تھی کہ ایک آدمی نے آکر اسے اطلاع دی۔

"عرفان اللہ!" اس نے حیرت سے نام دہرایا پھر پوچھا۔

"اکیلا آیا ہے یا ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"صرف گارڈز ہیں ساتھ۔"

"اچھا چلو، میں آتا ہوں۔" اس نے کمپیوٹر بند کیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ملاقاتوں والے کمرے میں عرفان اللہ اس کا منتظر تھا۔

"آج آپ نے کیسے اس غریب خانے کو رونق بخشی؟" رسمی علیک سلیک کے بعد اصغر نے عرفان اللہ سے براہ راست سوال کیا۔

"کوئی پہلی بار تو نہیں آیا ہوں۔ لالہ کے زمانے میں اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔" عرفان اللہ نے [illegible]

تیکھا پن محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ آنا جانا لالہ کے ہوتے ہی کافی پہلے چھوٹ گیا تھا اس لیے اس وقت گزرے دنوں کا حوالہ دینا بنتا نہیں ہے۔" اصغر اسے رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔

"چھوڑو یار گزری باتیں۔ گاہک دکان پر کتنے ہی عرصے بعد آئے، دکاندار اسے دھتکارتا نہیں ہے۔ جو بیت گیا سو بیت گیا۔ اب آگے کی بات کرو۔"

"کیا خریدنے آئے ہیں آپ یہاں؟" اصغر نے اسے جانچتی نظروں سے گھورا۔

"تمہاری خدمات۔" عرفان اللہ نے ہاتھ میں پکڑے سگار کا کش لگایا۔

"کس مقصد کے لیے؟"

"سیاست کے میدان میں اپنے قدم مضبوط رکھنے کے لیے تم جیسوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ تم میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں منہ مانگے دام دوں گا۔"

"کیوں، وہ تمہارا اپنا باذل ہے نا۔ وہ تو تمہاری خاطر کشتوں کے پشتے لگا سکتا ہے۔" اصغر نے ظاہر ہونے دیا کہ وہ باذل کے غیاب سے واقف ہے اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

"باذل آج کل یہاں موجود نہیں ہے اور اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہی مجھے باہر کے لوگوں سے کام لینا پڑ رہا ہے۔" عرفان اللہ نے اب بھی تحمل کا مظاہرہ کیا۔

"کیوں، کیا اس ڈاگر کو دنیا فتح کرنے کے مشن پر بھیج دیا ہے؟" اصغر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"ہر بار میں ہی اسے کہیں بھیجوں، یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ عاقل، بالغ اور آزاد بندہ ہے۔ اپنی مرضی سے بھی کہیں آ جا سکتا ہے۔" حقیقتاً عرفان اللہ خود بھی باذل کے اچانک غیاب سے پریشان تھا لیکن اس پر اپنی پریشانی کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ وہ حرام کا جنا تو دنیا کا آزاد ترین بندہ ہے جو باپ کے نتھنے سے بھی آزاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی زندگی میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا ہوگا کہ کسی نے اس کا کان پکڑ کر برا بھلا سکھانے کی کوشش کی ہو۔ کیا کبھی آپ نے ایسی کوئی کوشش کی؟" اصغر کے اچانک پوچھے گئے سوال نے عرفان اللہ کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔

"میں ایسا کیسے کرسکتا ہوں؟ برا بھلا کیا حق ہے اس [illegible]

"یہ بھی ٹھیک کہا۔ حق تو اصل میں حق ادا کرنے والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔" اصغر نے آہستہ سے اسے چڑکا بھی دیا اور جب دیکھا کہ اس کی رنگت متغیر ہو رہی ہے تو آرام سے بولا۔

"دیکھیے نا، اگر آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو اسے ایسے بے لگام بیل کی طرح آزاد تھوڑی چھوڑ دیتا۔ کچھ تعلیم و تربیت دیتا اس کی۔ سچ۔۔۔ اپنے کو بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اس جیسا جی دار اور طاقتور بندہ محض تربیت کی محرومی کے باعث انسان بننے سے بھی محروم رہ گیا۔"

"اب کیا باذل پر ہی بات کرتے رہو گے اور مجھے میری اس بات کا جواب نہیں دو گے جس کے لیے میں خود چل کر یہاں تک آیا ہوں۔" عرفان اللہ نے جز بز ہوتے ہوئے ٹوکا۔ حقیقت یہ تھی کہ آج کل تاجور نے بھی باذل کے حوالے سے اس کی جان کھائی ہوئی تھی کہ معلوم کرو باذل کہاں غائب ہے؟ تاجور کی فرمائش پر اس نے باذل کو تلاش کروانے کی تھوڑی بہت کوشش بھی کی تھی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ سارا وقت اسی کام میں لگا رہتا۔

"سالا خود چل کر آنے کی بھی خوب کہی آپ نے۔ اپنی ہی تو اوقات ہے کہ رب کا احسان جانو کہ اپنے پیروں پر چلنے کے لائق ہو ورنہ وہ تمہارا لطیف شاہ، دیکھو کیسی اکڑ والا تھا لیکن اب بستر پر مردوں کی طرح پڑا ہے۔"

"تم ایسا کرو، اڈا چھوڑ کر تبلیغی جماعت کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تعلیم و تربیت کی باتیں، یہ شکرانے کی نصیحتیں اتنی بیٹھ کر کرتے ہوئے اچھے لگو گے تم۔" بالآخر عرفان اللہ کا ضبط جواب دے گیا اور اصغر اس کی باتوں پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اصغر اس کے یوں لوٹ کنے پر کھلکھلا کر ہنسا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"بات اپنی نے سن اور سمجھ لی ہے پر فیصلہ سنانے کو تھوڑی مہلت چاہیے ہے۔ سوچ سمجھ کر ایک آدھ دن میں جواب دے دوں گا۔"

"جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے۔ پرانے تعلق کا اتنا مان تو تمہیں رکھنا ہی ہوگا۔ اگر تمہاری جگہ یہاں لالہ بیٹھا ہوتا تو وہ بھی فیصلہ میرے حق میں ہی دیتا۔ اس کی وضع داری مجھے انکار کرنے ہی نہیں دیتی۔" عرفان اللہ نے اسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

"اب بھی فیصلہ لالہ ہی کا ہوگا۔" اصغر [illegible]

"مطلب، لالہ کا طریقہ تھا کہ کوئی بھی الجھا ہوا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے اپنے اعتبار کے بندوں سے مشورے لیتے تھے۔ مجھے بھی بس یہی کرنا ہے۔" اصغر نے بات بنائی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں ایسے لوگ میسر ہیں۔ ایک مجھے ہی دیکھ لو۔ ہر طرف اکیلا ہی بھاگا پھرتا ہوں۔ پہلے یزدانی کا آسرا تھا لیکن اسے جوان بیٹے کی موت کا غم ڈھا گیا ہے۔ سارا وقت یا تو بیمار رہتا ہے یا روتا رہتا ہے۔ جب ان دونوں کاموں سے تھک جاتا ہے تو سو جاتا ہے۔ بالکل بھی کسی کام کا نہیں رہا ہے۔" عرفان اللہ نے اپنا دکھڑا رویا۔

"سنا تھا آپ کا بیٹا بھی بیمار ہے اور آپ نے علاج کے لیے اسے باہر بھیجا ہوا ہے۔ کچھ فرق پڑا اسے گوروں کے علاج سے؟" اصغر نے ظاہری ہمدردی سے پوچھا۔

"علاج ابھی شروع ہی کہاں ہوا ہے۔ ابھی تو ٹیسٹ پر ٹیسٹ کروا رہے ہیں وہ لوگ۔ یہاں کی رپورٹوں کو کہاں مانتے ہیں گورے ورنہ ٹیسٹ تو یہاں بھی بے حد و حساب ہوئے تھے۔"

"بس تو ٹھان لیجیے کہ جب بھی آپ کو موقع ملا اپنے ملک میں بھی ایسے کالج اور اسپتال بنائیں گے جن کی ڈگریوں اور رپورٹوں کو گورے بھی مانیں۔" اصغر نے مفت مشورہ دیا۔

"اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ ایک دو دن بعد فون کر کے تمہارا جواب مانگوں گا۔" عرفان اللہ اس کے مشورے کے جواب میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اصغر نے بھی روانگی اختیار کی۔ روانی سے دوڑتی گاڑی شہر کے ایک ایسے حصے میں جا رکی جہاں کثیر المنزلہ عمارات کی بہتات تھی۔ ان عمارتوں میں سے کچھ عمارتیں رہائشی تھیں جبکہ اکثریت کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ اس کی گاڑی جس عمارت کے سامنے جا کر رکی، وہ رہائش کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اترا تو اس عمارت کے مقابل سڑک کے پار دوسری کثیر المنزلہ عمارت کا کن انکھیوں سے جائزہ لیا۔ عمارت کی تعمیر میں شیشوں کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا لیکن یہ وہ شیشے تھے جن کے باہر کی طرف سے اندر نہیں جھانکا جا سکتا تھا البتہ اندر والے بخوبی باہر کا جائزہ لے سکتے تھے۔

[illegible] کے ساتھ آئے ڈرائیور کو حکم دیا اور خود رہائشی عمارت کی

طرف بڑھ گیا۔ داخلی راستے پر موجود گارڈ نے اس کی منزل کا پوچھ کر پہلے پرویز سے رابطہ کیا اور وہاں سے گرین سگنل ملنے کے بعد ہی اسے لفٹ میں سوار ہونے کی اجازت دی۔
لفٹ میں اس کے ساتھ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا اور اس سے کچھ برس چھوٹی بچی موجود تھی۔ دونوں شکل سے بہن بھائی لگتے تھے اور ہاتھوں میں آئس کریم پکڑے اردگرد سے بے نیاز آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ یقیناً رہائشیوں کے تحفظ کے لیے ہی وہاں سیکیورٹی کا انتظام زبردست رکھا گیا تھا اور اجنبیوں کو بلا روک ٹوک داخلے کی اجازت نہیں تھی۔
”کیسا چل رہا ہے؟“ اصغر اپنی مطلوبہ منزل پر لفٹ سے اتر کر ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اندر گھسنے کے لیے دروازہ کھولنے والے پرویز سے پوچھا۔ اس کے ساتھ لفٹ میں سوار بچے پہلے ہی کسی نچلی منزل پر اتر چکے تھے۔
”ٹیلی اسکوپ فٹ کر دی ہے اور ایک آدمی کو مستقل نگرانی پر بھی بٹھا دیا ہے لیکن زیادہ فائدہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہاں کی طرح وہاں بھی ایسے شیشے لگے ہیں کہ باہر سے اندر کا کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ بس ہم انہی لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جو سیڑھیاں چڑھتے اترتے سامنے آجاتے ہیں۔“
پرویز نے قدرے مایوسانہ انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے سننے والے انداز میں پرویز کا شانہ تھپکا اور خود اس کھڑکی کی طرف بڑھ گیا جس کے ساتھ ٹیلی اسکوپ فٹ کی گئی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ بے شک بند تھا لیکن جس منہمک انداز میں ٹیلی اسکوپ کے پیچھے بیٹھا بندہ اپنے کام میں مصروف تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اسے سب صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اصغر نے آہستہ سے اس شخص کا بازو دبا کر اسے متوجہ کیا اور اشارے سے سیٹ چھوڑنے کا حکم دیا۔ اب وہ خود آنکھ لگائے سامنے موجود عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ صورت حال وہی تھی جو اسے بتائی گئی تھی۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ سامنے موجود عمارت کے دفاتر میں کیا ہو رہا ہے۔ پوری عمارت میں بس دائیں جانب بنائی گئی سیڑھیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں اور اس وقت ان سیڑھیوں سے اپنی وردی سے پہچانا دکھائی دیتا ایک آدمی ہاتھ میں چند فائلیں لیے نیچے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔
اصغر کی دلچسپی کا اصل مرکز عمارت کا ٹاپ فلور تھا۔ حامد پر تشدد کر کے بالآخر وہ اس سے جو چند اہم معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، ان میں سے اہم ترین اطلاع یہی تھی کہ اس عمارت کے ٹاپ فلور پر [illegible]
ایکس کا قبضہ تھا۔ یہاں اس کے دفاتر بھی تھے اور رہائشی یونٹ بھی۔ وہ عمارت میں آمد و رفت کے لیے پرائیویٹ لفٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ لفٹ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع پارکنگ اور اس سے آگے ٹاپ فلور تک جاتی تھی۔ عمارت کا بقیہ حصہ کئی حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصہ مختلف کمپنیوں کے استعمال میں تھا جسے وہ اپنے ریکارڈ روم یا اسٹور وغیرہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ میڈم ایکس کی تحویل میں موجود حصہ ساؤنڈ پروف تھا جسے ضرورت کے مطابق مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔
”یہاں سے نگرانی بس اس حد تک کارآمد ہے کہ ہمارے مطلوبہ حلیے والے مرد اور عورت میں سے کوئی سیڑھیوں کا استعمال کرے اور اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ لفٹ کے ہوتے ہوئے کوئی سیڑھی کا استعمال کرے۔“ پرویز اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اور اپنی رائے دی۔
”اپن کو ہر ایریا کور کرنا ہے۔ ادھر پارکنگ کی Exit پر بھی بندے بٹھائے ہیں۔ کہیں سے بھی اپنے مطلب کا کچھ بھی مل سکتا ہے۔ تو بس اپنے کو ہر بات کی اطلاع دیتے رہنا۔“ اصغر نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ [illegible] لالہ کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا اور وہی ہدایات اپنے آدمیوں تک پہنچا رہا تھا۔
”کہو تو وہ آواز سنانے والی ڈبی ابھی ادھر لگوا دوں۔ کچھ تو سن گن ملے اور بندہ خالی بیٹھا مکھیاں مارنے سے بچے۔“ پرویز بھاگ دوڑ اور مار کٹائی کرنے والی فطرت کا بندہ تھا اس لیے اسے چند گھنٹوں میں ہی نگرانی کے اس ٹھس عمل سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔
”ہرگز نہیں۔“ اصغر ٹیلی اسکوپ چھوڑ کر فوری طور پر اس کی طرف گھوما اور تیز لہجے میں بولا۔
”ڈبیا کو فائر کرنے کے لیے تمہیں کھڑکی کھولنا پڑے گی اور ایسے میں تم لوگ کسی کی نظر میں بھی آ سکتے ہو۔“
”بس دو منٹ کی تو بات ہے۔“
”دو سیکنڈ کے لیے بھی ایسا نہیں کرنا۔ جب بتا دیا ہے کہ کام آدھی رات کے بعد کرنا ہے تو بس اسی ٹائم کرنا ہے اور دھیان رکھنا ہے کہ اس ٹائم یہاں معمولی سی بھی روشنی نہ ہو۔ تم لوگوں کا نظر میں آ جانا ساری محنت کو ضائع کر دے گا۔“ وہ بہت سختی سے پرویز کو باور کروا رہا تھا کیونکہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ حامد سے معلومات اگلوانے میں کتنی محنت لگی تھی اور اس حساس آلے کا حصول کتنے مہنگے داموں ممکن ہوا تھا جسے کسی گن کی طرح [illegible]

ٹھوس سطح پر چسپاں کیا جا سکتا تھا اور پھر اس کی مدد سے اردگرد کے علاقے میں پیدا ہونے والی انسانی آوازیں سنی جا سکتی تھیں۔
”ٹھیک ہے بابا! نہیں کروں گا اپنی مرضی۔ تم شانت ہو جاؤ۔“ اس کے لہجے نے پرویز کو سمجھا دیا کہ وہ کتنی ہی بیزاری محسوس کیوں نہ کرے، کرنا اسے وہی ہے جو کہا گیا ہے۔
”مجھے تیری طبیعت کا پتا ہے اس لیے میں خود ادھر آیا تھا۔ خیال رکھنا، جلد بازی تیرے ساتھ دوسروں کو بھی مروا دے گی۔ اگلی پارٹی جتنی تگڑی ہے، تجھے اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔“ پرویز کو ہدایات دیتے ہوئے اصغر کو درحقیقت خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔

☆☆☆

شراب...... شراب...... کوڑا ایک تسلسل سے جس شخص پر برس رہا تھا، وہ کتنا ہی مضبوط قوت ارادی کا مالک سہی، تھا تو گوشت پوست سے بنا انسان ہی۔ ابتدائی تین چار ضربیں خاموشی سے برداشت کر لینے کے بعد اب اس کے منہ سے کراہیں نکلنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ کوشش کے باوجود انہیں روکنے میں کامیاب نہیں تھا۔
”تم خوامخواہ اس کو ظلم کا نشانہ بنا رہے ہو۔ یہ میرے ساتھ ضرور تھا لیکن اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جن کے بارے میں تم جاننا چاہتے ہو۔“ سونیا نے ایک نظر ضبط کی کوشش میں سرخ پڑتے معاذ کے چہرے کو دیکھا اور سخت ہوئے چہرے کے ساتھ زانگ تاؤ سے مخاطب ہوئی۔
”اس کا نہ سہی پر تمہارا تو سمبندھ ہے ان لوگوں سے۔ تم بتاؤ ہمیں ان کے بارے میں۔“ زانگ تاؤ مکاری سے بولا اور کوڑے برسانے والے کو اشارہ کیا کہ ہاتھ نہ روکے۔
”بتایا تو ہے کہ میرا کوئی تعلق نہیں کسی سے۔ وہ گولڈن اسٹار بس اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔“ بے شک وہ چند وجوہات کی بنا پر تنظیم سے بددل ہوئی تھی اور معاذ کی محبت میں ماں کی مخالف سمت میں بھی چل پڑی تھی لیکن اس کی پرورش تو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ بچپن سے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ جان دے دینا لیکن دشمنوں کے سامنے تنظیم کا کوئی راز افشا نہ کرنا۔ اس لیے آج بھی اس کے لیے زبان کھولنا مشکل تھی۔ مشکل کو ایک ذاتی وجہ نے اور بھی شدید کر دیا تھا اس لیے اس کی زبان کھلنے کو تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔
”اس لڑکے کو اتنا مارو کہ اس کی کھال [illegible]
کی جان نکلنے سے پہلے تمہارے ہاتھ رکنے نہ پائیں۔“ جھنشو زانگ تاؤ نے خونخوار لہجے میں حکم جاری کیا اور ساتھ ہی ایک دوسرے بندے کو بھی اشارہ کر دیا۔ اب معاذ کے جسم پر بیک وقت دو آدمی کوڑے برسا رہے تھے اور اس کی کراہیں پہلے کے مقابلے میں مزید بلند ہو گئی تھیں۔ اتنی تکلیف کے باوجود بھی اس نے ایک بار بھی سونیا کو نہیں پکارا تھا اور نہ ہی اس سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنی زبان کھول کر اسے اس اذیت سے نجات دلا دے۔ وہ تو اس کی طرف دیکھ تک نہیں رہا تھا اور سونیا اس کے اس انداز کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے فیصلے کا اختیار مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور کسی صورت اسے مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”یہ نرک میں پہنچ جائے تو اسے لے آنا جس کی ٹانگ زخمی ہے۔ دیکھتے ہیں یہ اپنے کتنے ساتھیوں کو اپنی ضد کی بھینٹ چڑھاتی ہے۔“ زانگ تاؤ کا لہجہ غصے میں قہر برسا رہا تھا۔
”رک جاؤ۔ فار گاڈ سیک! رک جاؤ۔ جو تم جاننا چاہتے ہو، میں تمہیں بتاؤں گی لیکن پلیز! کسی کو کچھ نہ کرنا۔ یہ سارے نردوش ہیں اور ان میں سے کوئی بھی وہ نہیں جانتا جو میں جانتی ہوں۔“ معاذ کے جسم سے خون نکل کر لکیروں کی صورت بہنے لگا تو سونیا کا ضبط جواب دے گیا۔ یوں بھی زانگ تاؤ کے لہجے کی سفاکی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے کہے پر عمل کر کے رہے گا اور یہ وہ جانتی تھی کہ معاذ اسے اپنا خون معاف کر دے گا لیکن اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر آنچ آنا اسے گوارا نہیں ہوگا۔
”رک جاؤ سبھی اور ذرا بندے کے زخموں پر کوئی مرہم شرہم لگاؤ۔ اپنی شریمتی جی کی یادداشت واپس آگئی ہے تو ان کے ساتھی کو بھی تھوڑا آرام دو۔“ جھنشو کے حکم پر کوڑے برساتے ہاتھ رک گئے اور فوراً ہی زخموں سے خون روکنے کا کام شروع کر دیا گیا۔
”اب بولنا شروع کر دو دیوی جی اور یاد رکھنا، جہاں تمہاری زبان رکی، وہیں میرے سیوکوں کے ہاتھ بھی مرہم لگانا چھوڑ کر اس کے زخموں پر نمک مرچ لیپنا شروع کر دیں گے۔“ جھنشو زانگ تاؤ نے سونیا کے بولنے سے پہلے ہی اسے دھمکانا ضروری سمجھا تھا۔ ویسے وہ شخص جھنشوؤں کی عمومی امن پسند فطرت کے بالکل مخالف تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کسی انسان کو کیا جانے والا تشدد اسے تسکین دیتا ہے۔
”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“ سونیا نے اسے یقین دہانی کروائی اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔
[illegible]

موقع میسر آیا تھا کہ سوکھی لکڑی مل جائے پر اس نے آگ جلا کر اسے منجمد ہوتے وجود کو گرمی پہنچائی تھی۔

جلکشوؤں کا پیچھا کرتے اور ان کے ٹھکانے تک پہنچتے ہوئے موسم پھر بھی اتنا سخت نہیں تھا لیکن واپسی کے سفر تک درجۂ حرارت یکدم ہی کئی ڈگری نیچے گر گیا تھا۔ موسم کے ساتھ ساتھ اسے خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ وہ جو خشک خوراک ساتھ لے کر چلا تھا، وہ کفایت شعاری سے استعمال کرنے کے باوجود ختم ہو گئی تھی اور اب وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے بھوکا تھا۔ بھوک، پیاس اور تھکن آہستہ آہستہ اس کے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی لیکن وہ آخری سانس تک لڑنے اور حالات کا مقابلہ کرنے والوں میں سے تھا اور اگر اس کی فطرت میں جنگی خصوصیات کے رنگ ضرورت سے زیادہ گہرے اور تیز نہ ہوتے اور وہ مناسب ماحول اور ہاتھوں میں پرورش پاتا تو اس بادل سے مختلف ایک شاندار جوان بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ نہیں تھا کہ اس کی رگوں میں تاجور بادل کا خون دوڑتا تھا اور اپنی مشکوک ولادت نے اس کے اندر غم و غصے کا وہ الاؤ دہکائے رکھا تھا جس نے اس کی شخصیت کو ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کا روپ دے دیا تھا جو وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا لاوا اگلتا رہتا تھا۔ کھولتا ہوا لاوا جو کسی عورت کی عزت کو خاک کر دیتا تو کبھی کسی چیختے جاگتے وجود کو وہ راکھ کا ڈھیر بنا دیتا تھا۔ وہ سراپا قہر تھا اور اس قہر کی زد میں کبھی بھی، کوئی بھی آ سکتا تھا۔ خود اس کا اپنا آپ بھی۔

اب بھی دشمن کو شکست و نابود کر دینے کی ضد اسے اس حد تک لے آئی تھی کہ وہ غیر یقینی حالات میں بھوکا پیاسا ایک پتھر پر بیٹھا ہانپ رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو ہمت کرو اور ایک بار پھر چلنا شروع کر دو ورنہ جس پتھر پر بیٹھے ہو اسی پر بیٹھے بیٹھے منجمد ہو جاؤ گے۔ ہانپی ہوئی سانسیں ذرا بحال ہوئیں تو اس نے خود کو دوبارہ چلنے پر آمادہ کر ہی لیا اور پتھر پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ رگ و پے میں جوش دوڑنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا پہاڑی بکرا تھا جو جانے کس طرف سے بھٹک کر ادھر آ نکلا تھا اور کچھ بے چین سا ادھر ادھر گردن کو جنبش دیتا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اسے راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا جس پر چل کر واپس اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ جائے۔ اس بے زبان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ بادل کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔

اپنے وجود کو بالکل ساکت کرتے ہوئے اس نے بغیر کسی آہٹ کے اپنا پستول نکالا اور دائیں ہاتھ کو بغیر آواز کرے احتیاط سے نشانہ باندھا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی نے وہ ہلکی جنبش کی اور اگلے ہی لمحے پہاڑی بکرا زخمی ہو کر ڈھلان پر پھسلا۔ بادل نے پھرتی دکھائی اور پنڈلی سے بندھا خنجر کھینچ کر تیزی سے تڑپتے بکرے کی طرف بھاگا۔ فاصلہ مختصر تھا۔ اس نے بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی مشکل آسان کی اور تیزی سے کھال اتار کر گوشت الگ کیا۔ اب وہ آگ جلائے اس پر گوشت کے پارچوں کو بھون رہا تھا۔ گوشت بھونے جانے کی خوشبو نے اس کی بھوک سے بے حال آنتوں کو مزید بے چین کر دیا تھا۔ بھوک کی زیادتی اور برداشت کی کمی نے اسے زیادہ دیر گوشت کو بھونے کی اجازت نہیں دی اور جلدی جلدی کچا پکا گوشت دانتوں سے نوچنے لگا۔ کئی گھنٹوں بعد میسر آنے والی یہ خوراک جو کہ مرچ مسالوں سے محروم تھی، اس کے لیے اعلیٰ ترین ریستورانوں میں کھائے جانے والے کھانوں سے زیادہ عمدہ تھی۔ وہ گوشت کا شوقین تھا اور شدید ترین بھوک میں تازہ ذبح شدہ بکرے کا گوشت میسر آ جانے پر خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ جب سے اس برف زار میں موجود تھا اسے بیگ میں موجود بسکٹوں، خشک میوہ جات اور چاکلیٹس کے علاوہ کسی بھی شے کا ذائقہ چکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اپنے ذوق کے مطابق خوراک میسر آئی تھی تو جی بھر کر اسے اپنے معدے میں اتار رہا تھا۔ شکم سیری کے بعد اس نے برف سے ہی اپنی پیاس بجھائی اور پھر بکرے پر سے مزید گوشت کے پارچے اتارنے لگا۔ پورے کا پورا گوشت ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے باقی رہ جانے والے راستے کی مناسبت سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پلاسٹک کی ان خالی تھیلیوں میں منتقل کیے جن میں محفوظ خوراک وہ کب کی اپنے معدے میں اتار چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر سفر کے لیے تیار تھا۔ بھرے پیٹ کی آسودگی نے اس دشوار سفر کی کوفت کو قدرے کم کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ روز قبل پاکستان سے روانہ ہوتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسی کسی جگہ پہنچ جائے گا۔

وہ تو وکی کے پیچھے پیچھے حیدرآباد پہنچا تھا۔ اسے اس کا سراغ لگانے والوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ وکی کہاں موجود ہے۔ وہ بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر اپنا لائحہ عمل طے کر رہا تھا کہ [illegible]

ہونے والے اور ایک فون کال پر رابطہ کرنے کے بعد وہاں سے چلے جانے والے [illegible] نے ایسا کیا تھا اور وہ بھی اس گاڑی میں سوار ہو گیا تھا جو قیدیوں کو لے کر نامعلوم ٹھکانے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ان بے ہوش قیدیوں کے علاوہ تین مسلح افراد شامل تھے۔ ان میں سے دو باری باری ڈرائیونگ کر رہے تھے جبکہ ایک بے ہوش قیدیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہ تینوں اس سے بے پروا ہو کر بیٹھے تھے۔ ان کی آپس کی گفتگو سے اسے چند باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ انہیں کسی سرد مقام تک پہنچنا ہے اور اس سرد مقام تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے راستے میں گرم کپڑوں اور خشک خوراک کی خریداری بھی کی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گاڑی بس ایک مخصوص مقام تک جائے گی جہاں کچھ لوگ اسے اور قیدیوں کو وصول کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ باقی لوگوں کو اسی مقام سے واپس لوٹ جانا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جہاں اسے لے جایا جا رہا ہے، وہاں اس کے ذمے کیا کام ہوگا لیکن وہ بے چون و چرا وہاں تک جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا کیونکہ وہ اسے میڈم ایلس کو ناراض کرنا منظور نہیں تھا۔ ویسے وہ سارے لوگ جو آج کل دشمنوں کی فہرست میں سرفہرست تھے وہیں لے جائے جا رہے تھے اور اسے امید تھی کہ اسے ان سے نمٹنے کا بھرپور موقع ملے گا۔

اس کی سوچ جو بھی تھی، قدرت نے اس سے ہٹ کر منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ ڈرائیور تجربہ کار تھا اور اس کا ان علاقوں میں یہ کوئی پہلا سفر نہیں تھا پھر بھی جانے کیا ہوا کہ حادثہ پیش آ گیا۔ حادثے کے وقت وہ بالکل دروازے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ جھٹکے سے کھلا تو وہ توازن قائم نہ رکھتے ہوئے باہر جا گرا۔ گرنے سے اسے چوٹیں تو آئیں لیکن گرنے نے ہی اس کی زندگی بچا لی۔ وہ جب تک سنبھلتا اور الٹی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچتا، وہاں جلکشو آ گئے تھے۔ وہ فوری طور پر ان کے سامنے جانے کے بجائے ایک جگہ چھپا ان کی کارروائی دیکھتا رہا۔ انہوں نے اس کے سامنے گاڑی سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالا پھر زخمیوں کو طبی امداد دینے لگے۔ بادل کو خود بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی لیکن وہ ان کے سامنے جانے سے جھجک رہا تھا کہ وہ اس سے قیدیوں کی بابت سوال جواب کرتے۔ اس کے آزاد ہونے سے یہ بات واضح تھی کہ وہ قیدیوں کے بجائے ان کا ساتھی ہے جو قیدیوں کو لے کر جا رہے تھے۔
اس شکل [illegible]

جس مقام پر پیش آیا تھا وہ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی کہ کسی اور کے آنے کا امکان ہوتا۔ وہ جلکشو بھی جانے کیوں موجود تھے لیکن ان کے انداز و اطوار دیکھ کر اسے یقین لگ رہا تھا کہ وہ ان سیدھے سادے جلکشوؤں کی طرح نہیں جو تارک الدنیا ہو کر اپنی تپسیا میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے جو لوگ موجود تھے ان کی حرکات و سکنات میں ایک طرح کی ہوشیاری اور تیزی طاری تھی۔ سویا کو طبی امداد دینے والا جلکشو اس کے گلے میں موجود زنجیر اتار کر تیز لہجے اور آواز میں اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگا تو صورت حال میں تیزی سے تغیر آیا۔ وہ فاصلے پر ہونے کے باوجود زنجیر میں جھولتا ستارہ دیکھ سکتا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس سنہری ستارے کو دیکھ کر جلکشوؤں کے رویے میں عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تیز تیز لہجے میں بولتے رہے تھے اور پھر گویا ان کے درمیان وہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ بادل کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ قیدیوں کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور انہیں اپنے خچروں پر لادے تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔
ان کے روانہ ہونے کے بعد بادل جائے حادثہ پر پہنچا اور وہ سارا سامان نکال لیا جس کی اسے اس برفانی علاقے میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ جلکشوؤں کے مشکوک رویے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کا تعاقب کرے۔ جلکشوؤں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جلد از جلد سفر طے کر لینا چاہتے ہیں لیکن بے ہوش قیدیوں کی وجہ سے ان کے لیے اپنی رفتار تیز رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ان کی یہ مجبوری اس کے لیے مددگار ثابت ہوئی تھی۔ وہ جسمانی طور پر چاق و چوبند اور مضبوط تو تھا لیکن ایسے راستوں پر سفر کرنے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اس لیے اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔

بہرحال جیسے تیسے وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں ان جلکشوؤں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ رات کے وقت وہاں گھس کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ان کے پاس جدید اسلحے کی موجودگی اور مستقل چوکیداری نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ خوش قسمتی سے حادثے میں اس کا موبائل محفوظ رہا تھا۔ اس نے موبائل کی چارجنگ بچانے کے لیے زیادہ تر اسے بند رکھا تھا۔ اس لیے وہ استعمال کے قابل تھا۔ واپسی کے سفر میں وہ [illegible]

رہا تھا تاکہ وہ دوبارہ جب اس طرف آئے تو بھٹکنے کے امکانات نہ رہیں۔ اگر اس علاقے میں جی پی ایس ٹریکر دستیاب ہوتا تو ان سب کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ بآسانی فرصت میں اپنے مددگاروں سے رابطہ کر لیتا لیکن اب اسے یہ کام کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔

اگرچہ اس کی زندگی ابتدا ہی سے ہنگاموں سے پُر رہی تھی لیکن اتنے سخت وقت سے وہ پہلی بار گزر رہا تھا کہ نہ کوئی مددگار آس پاس تھا نہ سفر کی مناسب سہولیات۔ سوجے ہوئے زخمی پیروں کے ساتھ خالی پیٹ ایک برف زار میں چلتے چلے جانے کا تجربہ وہ یقیناً ساری زندگی نہیں بھول سکتا تھا اور کئی گھنٹے بھوکے رہنے کے بعد پیٹ بھرنے کی آسودگی کا نشہ بھی اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اسی نشے میں مست وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک زوردار للکار نے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

”اسٹاپ!“ بلند آواز میں پکار کر نہ صرف اسے رکنے کا حکم دیا گیا تھا بلکہ جیسے ایک گولی بھی چلا دی گئی تھی جو اس کے کان کے پاس سے سرسراتی ہوئی گزر گئی تھی۔

”ہینڈز اپ!“ رک جانے پر دوسرا حکم بھی فوراً ہی صادر ہو گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اسے جدید اسلحے سے لیس چار افراد نے گھیر رکھا ہے۔ وہ ایک پستول اور خنجر کے زور پر تنہا اس کھلی جگہ پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا چناں چہ بے چون و چرا اپنا بیگ نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ان میں سے ایک اس کے قریب آیا اور اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ جلد ہی وہ اس کا پستول اور خنجر اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔

”کون ہو تم؟“ نقش و نگار اور رنگت سے اس کی قومیت کا اندازہ لگا کر اسی کی زبان میں سوال کیا گیا۔

”سیاح ہوں۔ پہاڑوں اور برف زاروں سے عشق کرتا ہوں اس لیے ان کے درمیان مارا مارا پھرتا ہوں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”سیاح... یہاں اور وہ بھی بالکل تنہا؟“

”کوہ نوردی کا اصل مزہ تنہائی میں ہی ہے۔ میں کسی کو ساتھ رکھ کر خود کو ڈسٹرب کرنا پسند نہیں کرتا اس لیے ہمیشہ تنہا ہی سفر کرتا ہوں۔“ پازل کا انداز بڑا بے نیازانہ تھا۔

”لیکن یہ بہت خطرناک ہے۔ تمہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا تو کوئی تمہاری ہیلپ کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔“ اس سے گفتگو کرنے والا گفتگو کر رہا تھا جبکہ وہ شخص جس نے اس کی جامہ تلاشی لی تھی، اب اس کے رک سیک کی تلاشی لے رہا تھا۔

”میں ان پہاڑوں میں مر کر اگر اس کی برف کے نیچے دفن ہو گیا تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا کیونکہ بعد میں بھی اپنی پسندیدہ جگہ پر رہنے سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔“ وہ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی پہاڑوں کا عاشق نہ ہو۔ عاشق بھی ایسا کہ اس کے عشق نے دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا ہو۔

”تمہارا پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کاغذات کہاں ہیں؟“ رک سیک کی تلاشی لینے والے نے اپنا کام ختم کر لیا تھا اور یہ سوال اسی کی جانب سے آیا تھا۔ وہ بہت جانچتی نظروں سے پازل کا جائزہ لے رہا تھا۔

”میرا چھوٹا بیگ ہولسٹر کے ساتھ کمر سے بندھا تھا۔ ایک کھائی کو پار کرتے ہوئے کھائی میں جا گرا تھا۔ میرے سارے اہم ڈاکیومنٹس اور کرنسی اسی بیگ میں تھے اس لیے اب میں وہ سب کچھ کھو چکا ہوں۔“ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس وقت بھی پوری ڈھٹائی سے یہ کام کر رہا تھا۔

”کس کنٹری سے ہو؟“ پہلے والے نے اس سے پوچھا۔

”انڈیا۔“ غیر ملکیوں کے لیے انڈو پاک کے شہریوں کو الگ الگ شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ان دو ممالک کے لوگ بخوبی ایک دوسرے کو الگ الگ شناخت کر لیتے ہیں۔ اس نے بھی ان دو افراد کے لب و لہجے سے ان کی قومیت کا درست اندازہ لگا لیا تھا اس لیے خود کو ان کا ہم وطن ظاہر کرنے میں ہی بھلائی سمجھی۔

”انڈیا میں کہاں سے؟“

”تم لوگ اس کا انٹرویو ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام کی بات بھی معلوم کرو گے؟“ پازل جواب میں کچھ کہتا اس سے قبل ہی ایک تیسرے شخص نے گفتگو میں دخل دیا اور بیزاری سے اپنے ساتھیوں کو ٹوکا۔

”کام کا سوال تم کر لو۔ ہمیں تو یہ کچھ مشکوک لگ رہا ہے اس لیے اس کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ جامہ تلاشی لینے والے نے ذرا سا برا مان کر اپنے اس ساتھی کو جواب دیا۔

”اس کو بعد میں ٹھوک بجا کر دیکھ لینا۔ ابھی تو اس سے پوچھو کہ کیا اس نے کہیں چینی بھکشوؤں کو دیکھا ہے یا نہیں؟“ اس شخص کی زبان سے نکلنے والے سوال نے پازل کو چونکا دیا۔

”لگتا ہے ہمیں یہاں بھجوانے والوں کو حادثے کا علم ...

ہیں۔ ان لوگوں کو جھکشوؤں سے متعلق کوئی کلیو ملا ہوگا جب ہی انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔" دل میں آنے والے اس خوش کن خیال نے ان لوگوں کی طرف سے اس کے شکوک کم کر دیے اور کسی کے سوال کیے بغیر خود ہی بول پڑا۔

"میں نے چینی جھکشوؤں کو دیکھا تھا۔ وہ تعداد میں اچھے خاصے تھے اور لدے ہوئے خچروں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔"

"ان کے خچروں پر کیا لدا ہوا تھا؟" فوراً ہی بے چینی سے سوال ہوا لیکن باڈل نے فوراً جواب نہیں دیا اور چہرے پر ایسے تاثرات سجا لیے جیسے جواب دینے میں کشمکش و پیچ کا شکار ہو۔

"تم نے بتایا نہیں کہ ان کے خچروں پر کیا لدا ہوا تھا؟" اس بار درشت لہجے میں سوال دہرایا گیا۔

"میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ کیا ہے تا کہ انہوں نے خچروں کی پیٹھ کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ چادروں کے نیچے کیا ہے، دکھائی ہی نہیں پڑتا تھا۔ پر تو..." اس نے ایک بار پھر زبان روک لی۔ اس طرح وہ ان کے تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔

"پر تو کیا...؟ جو ہے صاف بول۔"

"میں نے ایک چادر کے نیچے جھولتے کالے بال دیکھے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے... جیسے خچر کے اوپر کوئی جوان میلا لدی ہو۔" اس نے ڈرنے، جھجکنے کی شاندار اداکاری کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"کس طرف جاتے دیکھا تم نے ان لوگوں کو؟" دیے گئے جواب نے سوال کرنے والوں کا جوش و خروش بڑھا دیا۔

"اگر تم لوگ مجھ پر وشواس کرو اور بتاؤ کہ تم ان لوگوں کو کیوں کھوج رہے ہو تو شاید میں تمہیں زیادہ اچھی طرح سے گائیڈ کر سکوں۔" اس بار اس نے تھوڑا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ تصدیق ہو سکے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو وہ سمجھ رہا ہے۔

"شرطیں رکھتا ہے سالا۔" اس کے مطالبے نے جامہ تلاشی لینے والے کو آپے سے باہر کر دیا اور وہ اسے مارنے کے لیے لپکا۔ اس کے ایک ساتھی نے درمیان میں آ کر بمشکل اسے قابو کیا۔

"آپ لوگ مجھے غلط مت سمجھو۔ ہم ایک ہی دیش کے رہنے والے ہیں اور اپنے دیش سے پریم کرتے ہیں۔

بتاؤ اس جن کا اسمگلر ہے۔" باڈل بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں اپنا موقف پیش کر رہا تھا۔

"تیری ایچھا کی ایسی کی تیسی۔ اگر ہم نکلوانے پہ آئے تو تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر ساری انفارمیشن نکلوا لیں گے۔" اس پر حملہ آور ہونے والے کو اگرچہ اس کا ساتھی پیچھے دھکیل چکا تھا لیکن اس کا غیظ و غضب اب بھی تھما نہیں تھا اور اب بھی خونخوار لہجے میں دھمکی دے رہا تھا۔

"تم چپ کرو شری! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے ہمیں اپنے بارے میں اس کی تسلی کروانی چاہیے۔" چوتھا ساتھی جو اب تک خاموش رہا تھا، گفتگو میں دخل انداز ہوا اور اپنے جوشیلے ساتھی کو ڈانٹنے کے بعد باڈل کی طرف متوجہ ہو کر نرم لہجے میں بولا۔

"بات کیول اتنی ہے کہ ہمارے ساتھی ایک گاڑی میں کچھ خاص (خاص) لوگوں کو لے کر ہم تک آ رہے تھے کہ ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ہمیں اس ایکسیڈنٹ کا پتا کافی سے گزرنے کے بعد تب ہوا جب طے شدہ ٹائم گزرنے کے کئی گھنٹے بعد بھی وہ لوگ ہم تک نہیں پہنچے اور ہمیں ان کی کھوج میں نکلنا پڑا۔ ایکسیڈنٹ کی جگہ پر ہمیں کیول اپنے تین ساتھیوں کی لاشیں ملیں تو خود بخود دماغ میں ہلچل مچ گئی کہ باقی لوگ کدھر گئے۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کے بعد جانکاری ملی کہ چینی جھکشوؤں کا ایک گروپ اپنے گروہ سے ملنے ہماری سائڈ آیا ہوا تھا۔ یہ جگہ ایسی ہے کہ ہر طرف سرکار کی عملداری نہیں ہے اور جھکشوؤں اور کچھ دوسرے لوگوں کو ایسے راستوں کی جانکاری ہے جہاں سے چوری چھپے آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہمیں جھکشوؤں کی ادھر موجودگی کا پتا چلا تو ہم سمجھ گئے کہ وہ ہی ہیں جو ہمارے ساتھیوں کو اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ بس اسی لیے ہم ان کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔" اس کی بات کے اختتام تک باڈل کا چہرہ خوشی سے کھل چکا تھا۔ جیسے ہی وہ چپ ہوا، خود چہک کر بولا۔

"بدھائی ہو، جن ساتھیوں کی کھوج میں آپ لگے تھے، میں ان ہی میں سے ایک ہوں اور جانتا ہوں کہ ہمارے قیدیوں کو چینی جھکشو ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر ان جھکشوؤں کا پیچھا کیا تھا اور ان کا ٹھکانا دیکھنے کے بعد مدد لینے ہی واپس آ رہا تھا۔" یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ یہ وہی لوگ ہیں جن تک اسے پہنچنا تھا، اس نے کھل کر سب بتا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر تم ہمیں ترنت ان کے ٹھکانے پر لے چلو تا کہ ہم انہیں ان کی اس حرکت کا مزہ چکھا سکیں۔"

"نہیں دوست!" باڈل نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میری حالت اتنی کھراب (خراب) ہے کہ میں ترنت اتنا لمبا سفر دوبارہ نہیں کر سکتا۔ اس سفر کے لیے مجھے تھوڑے سے آرام اور علاج کی ضرورت ہے اور تم لوگوں کو تیاری کی۔ ان جھکشوؤں نے بہت محفوظ جگہ اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے اور وہاں پہرے داری بھی سخت ہے۔ میں ان کے پاس جتنا اڈوانس ویپن دیکھ کر آیا ہوں، مجھے وشواس ہی نہیں ہو رہا ہے کہ وہ کوئی جھکشو ہیں۔"

"تو کیول بہانے بازی کر رہا ہے۔" جوشیلے صاحب کو ایک بار پھر غصہ آنے لگا۔

"دھیرج شری! ہمیں اس کی بات سمجھنا چاہیے۔ آؤ، اسے لے کر اپنے ٹھکانے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے اوپر والوں سے بات کریں گے اور پھر وہ جو فیصلہ سنائیں ہمیں اسی پر عمل کرنا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک۔ پہلے اوپر رپورٹ کرنا ضروری ہے۔" باری باری سب ہی سمجھانے لگے تو شری نامی بندے کو بادل ناخواستہ ہتھیار ڈالتے ہی پڑے لیکن وہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ باڈل کو اس کی خوشی یا ناخوشی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ اس بات پر خوش تھا کہ کئی دنوں کی خواری کے بعد کوئی ایسا ٹھکانا ملنے جا رہا ہے جہاں وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کے ساتھ ساتھ ڈھنگ کی خوراک کھا سکے گا۔ اپنی اس خوشی میں اس نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ ان لوگوں نے اسے اپنا ساتھی تسلیم کر لینے کے باوجود اس کا پسٹل اور خنجر واپس نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ زیادہ عرصے اس طرح نہیں رہے گا۔

☆☆☆

سیاہ شیشوں والی گاڑی نے سڑک چھوڑ کر کثیر المنزلہ عمارت کی زیریں منزل پر قائم پارکنگ کی طرف رینگنا شروع کیا تو قریب ہی بیٹھا ایک فقیر پھرتی سے اٹھ کر گاڑی کی طرف بھاگا۔ وہ کئی گھنٹوں سے وہاں بیٹھا تھا اور عقبی حصے سے پارکنگ میں آنے اور جانے والی ہر گاڑی کو دیکھ کر ایسے ہی دوڑ لگاتا تھا۔ اس کی اس تگ و دو کے نتیجے میں ابھی تک ایک آدھ ہی گاڑی والے نے رکنے اور خیرات میں کوئی چھوٹا نوٹ دینے کی زحمت کی تھی لیکن وہ پوری دلجمعی سے اپنے کام پر ڈٹا ہوا تھا۔ بالکل اس تاجر کی طرح جسے یقین ہو کہ شروع میں مندی سہی، بالآخر ایک دن کاروبار جم ہی جائے گا۔ ویسے ایک طرح سے دیکھا جاتا تو فقیر نے اپنے دھندے...

سامنے کے مقابلے میں پارکنگ کے عقبی حصے میں گاڑیوں کی آمد و رفت بہت کم تھی اور اس کی صدا پر رکنے والوں کا تناسب تو اس سے بھی بے حد کم۔

سیاہ شیشوں والی گاڑی بھی دیگر بہت سی گاڑیوں کی طرح اس کی صدا پر نہیں رکی اور سیدھی پارکنگ ایریا میں داخل ہو گئی۔ گاڑی والے کی اس حرکت پر فقیر نے دایاں ہاتھ اٹھا کر پیچھے سے لعنت کا اشارہ کیا پھر یوں کمر پر ہاتھ رکھ کر باہر کھڑا کھڑا ہی پارکنگ کے اندر جھانکنے لگا جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ اسے بھیک نہ دینے والا کنجوس اور بد اخلاق شخص کون ہے؟ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے گاڑی سے ایک باوردی شوفر باہر نکلا جس نے پھرتی سے پچھلا دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے سے ایک غیر ملکی عورت چھوٹے بچے کو گود میں لیے باہر نکلی۔ عورت غیر ملکی ہونے کے باوجود اس حلیے پر پوری تن دہی سے اتری تھی جو اسے ذہن نشین کروایا گیا تھا پھر بھی وہ دلچسپی سے اسے اور اس کی گود میں موجود بچے کو دیکھتا رہا۔ بچہ نیند میں تھا اور اس کا سر عورت کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ عورت اتر کر ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہوئی تو فقیر کو احساس ہوا کہ بے شک وہ اس کی مطلوبہ عورت نہیں ہے لیکن کوئی اہم عورت ضرور ہے جو اس مخصوص لفٹ کی طرف بڑھ رہی ہے جس پر نظر رکھنے کی ہدایت بھی دیگر ہدایات میں شامل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے کشکول کے اندر ہاتھ ڈال کر انگلیوں کو جنبش دی اور کشکول کو تھوڑا سا اوپر کر کے ایسے زاویے سے ترچھا کیا کہ اس کے پیندے کا رخ پارکنگ کی لفٹ کی طرف بڑھتی عورت کی جانب ہو گیا۔ سیاہ پیندے میں موجود چھوٹا سا سوراخ کسی کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ آ بھی جاتا تو کس کو غرض پڑی تھی کہ اس کے کشکول کے پیندے میں موجود سوراخ پر توجہ دیتا۔ یہ سوراخ یونہی نہیں تھا۔ اس سوراخ کے ساتھ اس جدید موبائل کے کیمرے کا بٹن پکا ہوا تھا جسے بڑی مہارت سے کشکول میں فٹ کیا گیا تھا اور اوپر گہرے سیاہ رنگ کا کپڑا اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ موبائل اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ صرف فقیر ہی جانتا تھا کہ کس جگہ انگلیاں ڈال کر وہ کپڑے کو سمیٹنے اور موبائل استعمال کرنے کے لائق ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس نے یہی کام کیا تھا لیکن اس کی پھرتی کے باوجود عورت کے چہرے کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور فقیر کی طرف اس کی پشت تھی۔ پشت پر سے کھینچی گئی تصویر میں عورت کا چہرہ تو نہ آ سکا لیکن اس کے شانے سے لگے بچے کا...

کر کے کھینچی گئی تھی اس لیے فاصلے کے باوجود رزلٹ عمدہ تھا۔

اس نے اس اکلوتی تصویر پر اکتفا کرتے ہوئے کشکول نیچے کیا تو شوفر بھی گاڑی کی ڈکی میں رکھے سامان کو نکال کر فارغ ہو چکا تھا۔ عورت کے پیچھے لفٹ کی طرف بڑھنے سے پہلے اس نے ایک تیز اور شک بھری نظر فقیر پر ڈالی۔ فقیر کی جوتی کو بھی اس کی نظر کی فکر نہیں تھی۔ اس نے بھری ڈھٹائی سے اس کی نظر کو سہا اور ہاتھ میں پکڑا کشکول آگے کی طرف کرنے کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ کی انگلی کو یوں آسمان کی طرف اٹھایا جیسے شوفر کو دھمکی دے رہا ہو کہ اگر اب بھی اس نے اس کے کشکول میں کچھ نہ ڈالا تو ڈائریکٹ اس کی اوپر بھیجی گئی بددعا کی زد میں آجائے گا۔ شوفر نے اس کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر گردن موڑی اور اس لفٹ کی طرف بڑھ گیا جس کے کھلے ہوئے دروازے سے عورت اس کی جانب منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اے ہٹ یہاں سے۔" پارکنگ کے داخلی راستے پر ڈیوٹی دینے والا گارڈ جو شاید کسی ضرورت کے تحت کچھ دیر کے لیے وہاں سے ہٹ گیا تھا، ایک سمت سے نمودار ہوا اور فقیر کو دھتکارا۔

"بڑی ڈھیٹ قوم ہے یہ بھی۔ کتنی بار سالے کو دھتکار چکا ہوں پھر بھی ہر تھوڑی دیر بعد آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے انتظامیہ کو کمپلین کرنا پڑے گی اس کی۔" گارڈ بلند آواز میں بڑبڑایا لیکن فقیر نے اس کی بڑبڑاہٹ کا کوئی اثر نہیں لیا اور ہٹ کر اس مخصوص جگہ جا بیٹھا جہاں اس نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ اب وہ اپنے کشکول پر چہرہ جھکائے بیٹھا منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا کم از کم دور سے دیکھنے والوں کو یہی گمان ہوتا کہ وہ دیوانگی میں ایسا کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک وائس میسج ریکارڈ کر رہا تھا۔ میسج مکمل ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر قبل کھینچی گئی تصویر کے ساتھ اسے دو نمبروں پر بھیج دیا۔ ایک نمبر اصغر اور دوسرا پرویز کا تھا۔ پرویز کا جواب فوراً آیا۔

"تو اب وہاں سے ہٹ جا۔ تیری جگہ میں نورے کو ڈیوٹی پہ بھجوا رہا ہوں۔" اس نے سر کے لمبے بالوں میں پوشیدہ کان سے لگی بلیو ٹوتھ میں یہ پیغام سنا اور ذرا سے توقف کے بعد اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جاتے جاتے اسے وہ چھابڑی والا دکھائی دے گیا تھا جس کے کندھوں پر جمی لکڑی کے ساتھ دونوں جانب چھابڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان چھابڑیوں میں بھنے ہوئے چنے بھرے تھے۔ چنوں کی گرماہٹ اور خستگی کو قائم رکھنے کے لیے ان کے درمیان رکھی کٹوری میں کوئلے سلگ رہے تھے۔

"چنا گرم......" چھابڑی والے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کراری آواز میں کہا تو وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اگر کامیابی سے پیشہ ور فقیر ہونے کی اداکاری کر رہا تھا تو نورے نے بھی اپنا کردار نبھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اس جگہ سے دور نکل کر اس نے پرویز کو رپورٹ دی۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تو آرام کر۔ جب ضرورت پڑی، میں تجھے کال کر لوں گا۔" پرویز نے اسے جواب دیا اور ایک بار پھر اپنے موبائل کی اسکرین پر اس کی بھیجی گئی تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں عورت کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی لیکن بچے کا چہرہ نمایاں تھا۔ گہری نیند سویا ہوا بچہ چہرے مہرے سے ہی کسی اچھے گھرانے کا لگتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ مقامی ہے۔ کسی مقامی بچے کا ایک غیر ملکی عورت کے ساتھ میڈم ایکس کے دفتر میں جانا اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ ساری مصلحتوں کو بھول کر ابھی وہ جادوئی ڈیوائس میڈم کے دفتر کی طرف فائر کرے جس کی مدد سے وہ وہاں ہونے والی گفتگو بہ خوبی سن سکتا تھا۔ گفتگو سن کر یہ عقدہ حل ہو سکتا تھا کہ بچہ کون ہے اور وہاں کیوں لایا گیا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اصغر نے آدھی رات سے قبل اس کام سے سختی سے منع کیا تھا۔ بے چینی نے اسے اصغر کو کال کرنے پر مجبور کر دیا۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔ تجھے میں نے آدھی رات کا بولا ہے تو بس آدھی رات کو ہی کام کرنے کا ہے۔" اصغر نے اس کا مدعا سن کر فوراً انکار کر دیا۔

"پر تب تک تو ہو سکتا ہے وہ لوگ واپس چلے جائیں۔" پرویز منمنایا۔

"جانے دے واپس۔ تو نے ادھر جو سالے نورے کو بٹھایا ہے، وہ دیکھ کر اس بھوتنی کے امجد کو اطلاع کر دے گا۔ امجد کو گاڑی دے کر ادھر پاس میں ایسے ہی تو نہیں بٹھایا ہوا ہے نا۔ سب کھوج لگا لے گا کہ گاڑی کس کی ہے اور کدھر گئی ہے بچے کو لے کر۔" اصغر نے اسے اچھا خاصا جھاڑ دیا۔

"ٹھیک ہے استاد! جیسی تمہاری مرضی۔" پرویز کو مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنا پڑے۔

"میرے کو معلوم ہے تجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جا رہا پر یاد رکھنا بھوتنی کے، اگر اپنی چول بازی میں کوئی گڑبڑ کی تو الٹا ٹانگ دوں گا۔" اصغر نے اسے دھمکی دینا ضروری سمجھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

بے وقوف

شاہ سنان

انسان عمر سے اتنا نہیں سیکھتا جتنا تجربہ اسے ہوشیار کردیتا ہے۔ وہ جو بظاہر قدم قدم پر دھوکا کھارہی تھی درحقیقت دھوکے بازوں کو بے وقوف بنارہی تھی کیونکہ وہ ایسا نہ کرتی تو پھر وہ ایسا کرجاتے جیسا کرنے وہ ان کی زندگی میں آئے تھے... لیکن اس نے ایسا کچھ کرنے ہی نہ دیا جس سے اس کی بے وقوفی ثابت ہوجاتی...

ایک ذہین حسینہ کی چالاکیوں کا پرتجسس احوال

پنک لباس میں ڈیانا بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ سمندر کنارے ریت پر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر پہلوؤں کے قریب ٹکائے ٹانگیں سیدھی کیے بیٹھی تھی۔ اس کے خوبصورت سنہری بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ شام کا ڈھلتا سورج جہاں سمندر میں عکس ڈال کر اس کی خوبصورتی بڑھا رہا تھا، وہیں اس کی لالی ڈیانا کے چہرے کو مزید حسین بنا رہی تھی۔ اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے وہ اردگرد کے لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہی تھی۔ اسے جم کا انتظار تھا۔ جم اور وہ جلد شادی کرنے والے تھے۔ بس اس شہر میں ایک دو کام نمٹانا باقی تھے اس

کے بعد دونوں شہر چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر شادی کرنے کا پلان بنائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

انتہائی امیر بزنس مین فریک کی بیوی بن کر وہ بہت نازاں تھی۔ فریک نہ صرف دولت مند بلکہ ہینڈسم بھی تھا۔ ڈیانا کو بڑی اچھی زندگی مل گئی تھی۔ شاندار گھر، قیمتی گاڑی، مہنگے اسٹائلش ملبوسات لیکن اچانک اس کی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ فریک کو بزنس میں شدید نقصان ہوا۔ اس کی معاشی پوزیشن پہلے کی طرح مستحکم نہ رہی۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہونے لگے۔ حتیٰ کہ فریک نے ان تمام برے حالات کا ذمے دار ڈیانا کو قرار دے دیا۔

''تمہاری لاکھوں کی شاپنگ نے میرے بینک اکاؤنٹس میں سے رقم تیزی سے کم کی اور تمہارے آئے روز ادھر ادھر کے ممالک میں سیر و تفریح کے شوق نے مجھے کاروبار پر توجہ نہ دینے دی۔ میں تمہیں دنیا جہان کی سیر کرواتا رہا اور میرا بزنس ڈوبتا رہا۔ بہت منحوس ہو تم۔''

اتنا کچھ سن کر ڈیانا کی زبان سے شعلے نکلنے لگے۔

''گھٹیا آدمی! تم اس قابل تھے ہی نہیں کہ تمہاری شادی مجھ جیسی حسین لڑکی سے ہوتی۔ اگر مجھے اندازہ ہو گیا ہوتا کہ تم میں کاروبار چلانے کی عقل نہیں تو میں تم سے ہرگز شادی نہ کرتی۔ نااہل انسان! اب تم بیوی کا خرچ تک اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ اپنی بے وقوفیوں کا ذمے دار مجھے مت ٹھہراؤ۔ نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تم سے شادی کرنے کا انتہائی غلط فیصلہ کیا۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمارا اکٹھے رہنا ممکن نہیں۔'' فریک نے بھڑک کر فیصلہ سنایا۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ مجھ سے علیحدہ ہو کر تم کون سا تیر مار لیتے ہو۔''

طلاق ہو گئی اور ڈیانا کو علیحدگی کے بعد بھی گھر، گاڑی اور کچھ رقم مل گئی۔ طلاق کے تقریباً دو ڈھائی ماہ بعد اس کی ملاقات جم سے ہوئی۔ وہ سڑک پر کھڑی کسی مدد کی منتظر تھی۔ اس کی گاڑی نے چلنے سے جواب دے دیا تھا۔ وہ موبائل نکال کر کوئی نمبر ملانے ہی والی تھی کہ دور سے تیزی سے آنے والی بائیک اس کے نزدیک آ کر رک گئی۔

''کیا ہوا میڈم؟'' بائیک والے نے ڈیانا سے پوچھا۔ وہ گاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ گویا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گاڑی میں پرابلم ہے۔

حسین و جمیل ڈیانا نے اکتائے ہوئے لہجے میں اسے بتایا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ جم تیزی سے گاڑی کے قریب آیا اور کچھ دیر بعد اسے اسٹارٹ کر دیا۔ ڈیانا نے اسے تھینک یو کہا تو اس نے جواباً کہا کہ یہ تو اس کا روز کا کام ہے۔ وہ ایک مشہور ورکشاپ چلاتا ہے جہاں گاڑیوں کے ٹھیک کرنے، سروس کا کام ہوتا ہے۔

''یعنی تمہارا کہنا یہ ہے کہ تم ورکشاپ والے ہو اس لیے تمہیں تھینک یو کے بجائے معاوضہ چاہیے؟'' ڈیانا مسکرائی۔

''اوہ...... نو میم! میرے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو جب بھی گاڑی کے سلسلے میں کوئی پرابلم ہو تو مجھ سے رابطہ کریں۔ میرے ملازمین فوراً پہنچ جائیں گے۔'' جم مسکرا رہا تھا۔ ڈیانا کو اس نے اپنا نمبر دے دیا تھا۔

دو تین بار گاڑی کے لیے جم سے رابطہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد دونوں میں بے تکلفی پیدا ہو گئی اور دونوں اکثر اکٹھے شام کی کافی پینے لگے۔ ڈیانا نے جب اپنا پورا تعارف اس سے کروایا تو وہ حیران رہ گیا۔

''اوہ، تو آپ اس بزنس ٹائیکون فریک کی بیوی تھیں جس کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کمال ہے، آپ کبھی سامنے نہیں آئیں۔'' اس نے کہا تو ڈیانا جھٹکے سے غصے سے بولی۔

''کیا، بزنس ٹائیکون؟ وہ بے وقوف انسان چھوٹی عرصے میں اپنا کاروبار برباد کر بیٹھا اور مجھے ذمے دار ٹھہرا کر طلاق کا فیصلہ کر لیا۔ یہ شہرت جو ہے، عارضی ہے۔ جلد ہی اس کا بنایا گیا بھرم ختم ہونے والا ہے۔ ہونہہ، احمق انسان!''

جم موضوع بدل کر اپنے بارے میں بتانے لگا۔ ورکشاپ چلانا اس کا شوق تھا کیونکہ اس نے اپنے باپ سے لڑائی اور گھر سے نکالے جانے کے بعد یہیں سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور پھر اس کام کو کافی آگے بڑھا لیا۔ اب اس کے باپ کے مرنے کے بعد اسے خاندانی پراپرٹی مل گئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کام کو جاری رکھے ہوئے تھا۔

''کون سا علاقہ بتایا تم نے جہاں تمہارا آبائی گھر اور دیگر پراپرٹی ہے؟'' ڈیانا نے اچانک چونک کر پوچھا۔ جم نے جگہ کا نام بتایا۔ وہ کافی مہنگی جگہ تھی۔

''میم! آپ نے دوبارہ شادی کا نہیں سوچا؟'' ایک روز وہ سمندر کنارے جو دونوں کی فیورٹ جگہ تھی، پر چہل قدمی کر رہے تھے تو جم نے سوال کیا۔

''تم نے مجھے پھر میم کہا؟ تم میرے دوست ہو۔ نام لیا کرو۔ کئی بار کہہ چکی ہوں۔'' کہہ کر ڈیانا نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ''کوئی پرخلوص ساتھی ملے تو آج کروں۔''

''واقعی؟'' جم حیرانی سے بولا۔

''ہاں جم! میں کسی اچھے انسان سے شادی کر کے اس فریک کو بتانا چاہتی ہوں کہ صرف دنیا میں تم ہی نہیں تھے جس کو میں نے پسند کیا۔ مجھے پسند کرنے والے اور بھی ہیں۔''

''تم کیا شخص چاہتی ہو؟'' جم نے سوال کیا۔

''پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ جو میرے ساتھ مخلص ہو بس...... اور کچھ نہیں چاہیے۔ فریک سے الگ ہو کر بھی کافی دولت میرے پاس ہے اس لیے زیادہ دولت نہ بھی ہو تو فرق نہیں پڑتا۔'' ڈیانا نے جواب دیا۔

''ڈیانا!'' جم نے اسے پہلی بار نام سے مخاطب کیا۔ وہ چونک گئی۔

''ہاں جم! بولو۔''

''...... تم کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھا سکتی ہو؟ تم سے ایک خاص بات کرنا ہے۔'' جم نے تھوڑا توقف کر کے کہا۔

''ہاں...... کیوں نہیں۔ ٹائم بتا دو، کب اور کس ہوٹل میں آنا ہے؟'' ڈیانا نے بڑی جلدی دعوت قبول کی تھی۔ جم کو حیرانی سی ہوئی۔

''ہوٹل نہیں، میرے گھر میں۔ میں بہت اچھا کھانا بناتا ہوں۔'' جم نے بتایا تو ڈیانا ہنس پڑی۔

''اوکے! چلو کل تمہاری ایک اور خوبی کا بھی پتا چل جائے گا۔''

☆☆☆

''کیا واقعی میں ایک شادی کے ناکام تجربے کی تلخی کے بعد دوبارہ شادی کر پاؤں گی؟'' ڈیانا نے خود سے سوال کیا۔ اسے چند دنوں سے یہ لگ رہا تھا کہ جم اسے پروپوز کرنا چاہتا ہے۔ اب اس نے ڈیانا کو کھانے پر بلا کر خاص بات کرنے کا کہا تو ڈیانا کو سمجھ آ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

جم شکل وصورت میں ڈیانا کے برابر نہ سہی لیکن کافی اچھا تھا اور اس کی پراپرٹی بھی تھی جبکہ ڈیانا کے پاس اب کافی حد تک دکھاوا تھا۔ اچھی گاڑی اور گھر ہی رہ گیا تھا۔ بینک بیلنس تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اسے واقعی سہارے کی تلاش تھی۔ ایسے سہارے کی جو اس کے خرچے برداشت کر سکے۔ جم میں یہ خوبی تھی۔ اگرچہ وہ فریک سے کئی گنا کم امیر تھا لیکن تقریباً خالی ہاتھ ہوتی ڈیانا کے لیے بہت بڑی غنیمت......

کالے لباس کے ساتھ ہلکی سی جیولری میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی......

پرس اٹھایا اور جم کے گھر جانے کے لیے گاڑی میں آ بیٹھی۔

☆☆☆

جم نے کھانے کی ٹیبل سجائی اور خود بھی تیار ہو گیا۔ اس نے گھر کو بھی خوب نکھار رکھا تھا اور مختلف جگہوں پر تازہ پھول رکھے تھے۔ ''آج ڈیانا کو شادی کی پیشکش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ ہاں ہی ہو گی۔ اتنے دنوں میں یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا ہے۔'' اس نے ٹیبل کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ تبھی ڈور بیل بجی۔ حسب توقع ڈیانا ہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

''واقعی، تم کھانا اچھا بنا لیتے ہو۔'' کھانے کے دوران ڈیانا نے مسکراتے ہوئے تعریف کی۔

''کیا واقعی؟'' جم بھی مسکرایا۔

''ہاں بالکل...... تم جانتے ہو کہ میں کھانے پینے میں کس قدر محتاط ہوں۔ اپنی فٹنس کے لیے ناپ تول کر اور بہت دھیان سے خوراک لیتی ہوں لیکن دیکھو اس وقت میں کیسے بے فکری سے پلیٹ ختم کر چکی ہوں اور یہ سب تمہارے ہاتھ کے ذائقے دار کھانے کی وجہ سے ہوا ہے۔'' ڈیانا نے کہا تو جم بہت خوش دکھائی دیا۔

''اوہ...... تھینکس! یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے...... ارے، تم رک کیوں گئیں، کچھ اور بھی کھاؤنا...... اور یہ سویٹ ڈش میں نے خاص ترکیب سے بنائی ہے۔ دیکھو ذرا، یہ بھی کمال کی ہے یا نہیں؟'' جم نے شیشے کا پیالہ اس کے سامنے رکھا جس میں بڑا اعلیٰ قسم کا اور ٹھنڈا، میٹھا بنا ہوا تھا۔

''نہیں...... نہیں...... بھئی سوری، میں اتنا کھا چکی ہوں کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج میٹھا نہ کھاؤں۔ پلیز! اسے رہنے ہی دو۔'' ڈیانا نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جم سے معذرت کی۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ آج میں اس ڈش سے پرہیز کرتا ہوں۔ تم پھر کسی دن آنا۔ میں دوبارہ بناؤں گا پھر اکٹھے کھائیں گے۔'' جم کہتے ہوئے اٹھا اور سویٹ ڈش کو فریج میں رکھ دیا۔

''اچھا...... تو دوبارہ یہ سویٹ ڈش بناؤ گے۔ آج باقی کا مزیدار کھانا کھلایا ہے، کیا وہ دوبارہ نہیں کھلا سکتے؟'' ڈیانا نے مذاقاً کہا۔ وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر صوفوں پر آ بیٹھے۔

''دوبارہ کیا، میں تو زندگی بھر تمہیں ایسی ڈشز کھلا سکتا ہوں، اگر تم چاہو تو۔''

جلسہ ستا اور کچھ دیر خاموش رہی۔
"کیا بات ہے، تمہیں برا لگا؟ شاید میں تمہارے معیار کے مطابق ——" جم بے چینی سے بولا تو ڈیانا نے بات کاٹ دی۔
"نہیں، برا نہیں لگا۔ بس تھوڑا وقت چاہیے سوچنے کے لیے۔"
"تو ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس پورے پانچ منٹ ہیں سوچنے کے لیے۔" جم نے مسکرا کر اسے فراخ دلی سے ٹائم دیا۔ وہ جانتا تھا ڈیانا کے لیے اتنا ٹائم بھی بہت ہے۔ پانچ منٹ سے پہلے ہی ڈیانا "ہاں" کر چکی تھی۔

☆☆☆

"میگی! کہاں ہوتی ہو آج کل؟" کلارا نے پوچھا۔ وہ میگی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ میگی ابھی کام سے واپس آئی تھی اور اپنے لیے کافی بنانے کچن میں آئی ہی تھی کہ اس کی قریبی دوست کلارا کا فون آ گیا۔
"وہی روٹین کے کاموں میں بزی ہوں۔ تم سناؤ، جاب کیسی چل رہی ہے۔ نیا باس کیسا ہے؟" میگی نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔
"میری چھوڑو —— ذرا اپنے ارد گرد دھیان دو۔" کلارا کا انداز عجیب سا تھا۔
"کیا مطلب؟" میگی کو بالکل سمجھ نہ آئی۔
"مطلب یہ کہ وہ جم، جس سے تم جلد شادی کرنے والی ہو، جانتی ہو آج کل کس کے ساتھ ہے؟"
"جم کسی کے ساتھ —— ؟ کلارا! پلیز کھل کر بتاؤ۔" میگی قدرے پریشان ہو گئی۔ جواباً کلارا اسے تفصیل بتانے لگی۔

☆☆☆

جم، ڈیانا کو رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے باہر آ رہے تھے کہ اچانک میگی آ گئی۔
"فراڈ انسان! یہ کیا کر رہے ہو تم؟" وہ آتے ہی چلائی۔ جم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کافی گھبرا گیا تھا۔ ڈیانا نے حیرانی سے آنے والی لڑکی کو دیکھا۔
"کچھ نہیں —— بس، کھانا کھا رہے تھے ہم —— یہ ڈیانا ہے، میری دوست۔ میں نے اسے انوائٹ ——" جم، میگی کو صفائیاں دینے لگا۔ ڈیانا آنکھیں پھاڑے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے چند منٹ پہلے شادی کے لیے رضامندی دی تھی اور وہ شخص اسے صرف دوست کہہ کر اس کا تعارف کروا رہا تھا۔
"اوہ —— گھر تک بلانے کی نوبت آ گئی۔ لعنت ہو تم پر۔ میں خوامخواہ تمہارے ساتھ اپنا وقت برباد کرتی رہی۔" میگی چنگھاڑ رہی تھی۔
"جم! کون ہے یہ اور تم سے اس کا کیا تعلق ہے؟" ڈیانا نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ بڑے غور سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
"میں میگی ہوں، جم کی دوست اور ہم دونوں شادی کرنے والے ہیں، سمجھیں تم —— شاید تم پہلے اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھیں لیکن اب تو پتا چل گیا ہے۔ تو تم ہم دونوں کی جان چھوڑو اور آئندہ جم کے آس پاس نظر نہ آنا۔" جم کے بجائے میگی نے جواب دیا۔ وہ شدید غصے میں تھی۔
"شٹ اپ میگی!" جم چلایا۔ "میں تمہیں چھوڑ چکا ہوں۔ یہ بات تم کیوں بھول گئی ہو کہ اب ہم شادی نہیں کر رہے؟ ڈیانا نہیں، تم ہم دونوں کی جان چھوڑو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" جم چیخ کر بولا۔
"کیا کہا تم نے؟" میگی شاکڈ تھی۔
"وہی، جو تم نے سنا ہے۔" جم بے رخی سے بولا۔ ڈیانا پھر سے خاموش کھڑی تھی۔
"اوکے، میں جا رہی ہوں لیکن تم یاد رکھنا۔" وہ ڈیانا کی طرف مڑی۔ "یاد رکھنا، ایک دن یہ تمہیں بھی دھوکا دے گا۔ تمہیں بھی کسی نئی لڑکی کی خاطر چھوڑ دے گا جب تمہارے ہوش ٹھکانے آئیں گے اور تم ——" وہ جذباتی انداز میں بول رہی تھی کہ جم آگے بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ وہ چند لمحوں بعد واپس آیا۔
"سوری، مجھے تم کو میگی کے متعلق پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ دراصل یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں ضرور بتاؤں گا لیکن پلیز، میرے بارے میں کچھ غلط مت سوچنا۔" جم کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔
"یہ تمہاری دوست تھی نا، کیوں چھوڑا تم نے اسے؟" ڈیانا نے سوال کیا۔
"ہاں، میری دوست تھی۔ میگی اور میں کچھ عرصہ قبل شادی بھی کرنے والے تھے لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ ہم دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے پھر ہمارا بریک اپ ہو گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے رابطہ کیے تقریباً ساڑھے تین ماہ ہو چکے ہیں۔ نہ جانے کس نے اسے تمہارے اور میرے بارے میں بتا دیا اور وہ جیلس ہو کر یہاں تماشا کرنے آ گئی۔ میں نے باہر لے جا کر اسے سختی سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری زندگی [illegible]

ہو۔" جم نے کہا۔
ڈیانا نے پوری بات سنی اور بولی۔ "جم! جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ سچ ہے نا؟"
"سو فیصد سچ۔" جم نے زور دیتے ہوئے کہا۔
"اوکے، میں چلتی ہوں۔ پھر ملتے ہیں۔" ڈیانا نے مسکرا کر کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔
جم [illegible] رہ گیا۔ وہ ڈیانا کو رخصت کر کے سوچنے لگا۔ اسے ڈیانا کی آنکھوں میں بے یقینی سی نظر آئی تھی۔ پہلی بار اسے میگی پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا؟ پہلی بار کتنے پیار سے ڈیانا شادی کے لیے مان گئی تھی اور اس میگی نے کیسے معاملہ بگاڑ دیا۔" وہ پریشانی سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈیانا کو سمندر کنارے بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتی اور گھنٹوں بیٹھی سمندر کی لہروں اور وہاں کی رونق کو دیکھتی۔ آج بھی وہ اکیلی بیٹھی یہی کر رہی تھی۔ اسے جم کے گھر سے آئے تین روز ہو چکے تھے۔ وہ بار بار میگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پہلی شادی کی ناکامی نے اسے محتاط کر دیا تھا۔ جم جو کہہ رہا تھا، سچ تھا یا جھوٹ —— یہ کیسے پتا چلے گا؟ اس نے سوچا۔ اس نے اپنے جاننے والوں سے یہ بات چھپا رکھی تھی کہ اب اس کی مالی پوزیشن بہت ڈاؤن ہو چکی ہے۔ اثاثے ختم ہو رہے تھے۔ وہ بہ مشکل اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے تھی۔ جم کی صورت میں اس کو ایک مستحکم پوزیشن والا ساتھی مل رہا تھا لیکن میگی کی وجہ سے وہ اس تعلق کے بارے میں بے یقینی محسوس کر رہی تھی۔ میگی کو بری طرح ڈانٹ کر باہر نکال دینے اور اس سے معذرت کر کے بھرپور یقین دلا دینے کے باوجود ڈیانا، جم پر اتنا اعتبار نہیں کر پا رہی تھی۔ رات ہی جم کا فون آیا تھا۔ وہ اس سے شادی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ڈیانا نے اسے گول مول بات کر کے ٹال دیا اور اب وہ اوپر نیچے ہوتی لہروں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی اور وہ کسی بھی نتیجے پر پہنچے بغیر گھر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ راستے میں تھوڑی سی شاپنگ کر کے وہ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کافی پینے چلی گئی۔ اسے کافی پیتے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کے سامنے ایک حیران کن نظارہ آ گیا۔ وہ کپ ہاتھ میں تھامے ادھر دیکھنے لگی۔ کئی منٹ اس منظر کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے کافی ادھوری چھوڑی اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

[illegible]
دیکھ رہا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ "اوہ، ڈیانا!" اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
"کیسے ہو جم؟ کیا ہو رہا ہے؟" ادھر سے ڈیانا کی مسکراتی آواز سنائی دی۔ جم کھل اٹھا۔
"چھٹی تھی آج۔ سارا دن گھر پر رہا۔ کچھ گھریلو کام نمٹائے۔ اب بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔"
"جم —— ! کیا میں اور تم رات کا کھانا اکٹھے کھا سکتے ہیں؟" ڈیانا نے سوال کیا۔
"کیوں نہیں —— کیوں نہیں۔ آ جاؤ، میں تمہارے لیے کھانا بناتا ہوں۔" جم خوش ہو گیا۔ اس روز کے بعد آج ڈیانا نے اس سے بات کی تھی۔
"نہیں —— تمہارے گھر نہیں، اس بار میرے گھر —— تم وہیں پہنچ جاؤ۔" ڈیانا نے کہا تو جم فوراً مان گیا۔
"لگتا ہے، میں نے جو رات میں اسے کال کی تھی، اس کا اچھا اثر پڑا ہے اس پر۔" وہ موبائل رکھ کر ریموٹ اٹھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

موبائل بجا اور کال اٹینڈ کی گئی۔ کال اٹینڈ کرنے والے کے چہرے پر موبائل آن کرتے ہوئے بڑی حیرانی تھی جیسے اسے اس کال کا یقین نہ ہو۔
"ہیلو، کیسے ہو؟" دوسری جانب سے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا گیا۔
"ٹھیک ہوں —— تم نے آج کیسے کال کر لی؟"
"فوری ملنا ہے تم سے —— بڑی ضروری بات ہے۔"
"ضروری بات؟ مطلب؟"
"مطلب یہ کہ معاملات سلجھائے جا سکتے ہیں۔"
"میں بھی عرصے سے یہی سوچ رہا تھا۔ میں آ رہا ہوں، کہاں ملنا ہے؟" بڑی خوشی سے کہا گیا۔

☆☆☆

ڈیانا اور جم کھانا کھا رہے تھے۔ جم بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ "میں میگی والے واقعے کی وجہ سے بہت ڈرا ہوا تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے کہے پر اعتبار کیا۔" جم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میں ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی تم سے شادی کے لیے تیار ہو گئی تھی کیونکہ تم میں مجھے ایک اچھا لائف پارٹنر نظر آ رہا تھا۔ بس میں یہ چاہتی تھی کہ شادی کی آفر تم کرو۔ جب ایسا ہی ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ درست ہے کہ میگی [illegible]

زندگی گزارنے کا ارادہ کر چکی تھی اس لیے مجھے اس دن کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑا۔'' ڈیانا نے مضبوط لہجے میں بات کی۔

''تو اب ہم کب شادی کر رہے ہیں؟'' جم نے سوال کیا۔

''میرے اپنے سابق شوہر سے چند قانونی معاملات چل رہے ہیں۔ تقریباً ایک ماہ میں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم شادی کریں گے اور ہاں..... جم! میں اس شہر میں نہیں رہنا چاہتی۔ ہم کسی دور کے شہر میں چلے جائیں گے۔ وہاں جا کر نئے انداز میں زندگی گزاریں گے جہاں کسی کا خطرہ ہوگا نہ میرے سابق شوہر کی طرف سے کوئی قانونی الجھن۔'' ڈیانا نے کہا تو جم ہنس دیا۔

''ارے تم میلی کو بھول جاؤ۔ تمہارے سامنے میں نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ اس روز کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ میری جانب آنے کا سوچے گی بھی نہیں۔ ہاں، اگر تمہیں ویسے یہ پسند ہے کہ ہم کہیں اور جا کر رہیں تو میں تمہاری خواہش کا احترام ضرور کروں گا۔'' ڈیانا مسکرا دی۔

☆☆☆

موبائل کی بیل بجی۔ وہی حیران کر دینے والا نمبر اسکرین پر جگمگا رہا تھا لیکن کال اٹینڈ کرنے والا اس بار حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ اسے اس کال کا انتظار تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل آن کر کے پوچھا۔ ''ہاں..... بات کہاں تک پہنچی؟'' جواباً اسے تفصیل بتائی گئی۔ ''اوکے'' کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا۔

☆☆☆

''بہت شاندار انگوٹھی ہے۔ ڈیانا کو پسند آئے گی اور اس کے ہاتھ میں اچھی بھی لگے گی۔'' جم انگوٹھی خرید کر گاڑی میں بیٹھا تھا۔ سگنل پر رکا تو جیب سے نکال کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ ڈیانا کے گھر جا رہا تھا۔ آج صبح ڈیانا کا فون آیا تھا کہ اس کے جو معاملات تھے، وہ حل ہو گئے ہیں۔ اب انہیں شادی کا دن کون سا ہوگا اور وہ شادی کے بعد کہاں رہیں گے، طے کر لینا چاہیے۔ جم نے اسے شام کے وقت ملنے کا کہا تھا۔ وہ اب اس کے گھر انگوٹھی لے کر جا رہا تھا۔

ڈیانا نے انگوٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''جم! میں رنگ پہن لوں گی لیکن اس سے پہلے تمہیں میری ایک شرط ماننا ہوگی۔''

''کون سی شرط..... ؟ دیکھو ڈیانا! میں ہر حال میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ تمہاری ڈیمانڈ کیا ہے؟''

جم پہلے تو چونکا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بات کی۔

''وعدہ کرو، انکار نہیں کرو گے کیونکہ اس کے بغیر تمہاری اور میری شادی ہرگز نہیں ہوگی اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ پلیز مان جاؤ جم!'' ڈیانا کے لہجے میں لجاجت تھی۔ جم حیران ہو رہا تھا۔

''تم کہو تو سہی، بات کیا ہے؟ میں وعدہ کرتا ہوں مانوں گا۔'' جم نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''جم..... میں اپنا گھر، دولت، جیسے مجھے میرے سابق شوہر سے پیسوں کے علاوہ ملے ہیں اور جتنی بھی زیادہ شادی سے پہلے تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ ہے جو میں تمہیں شادی کے بعد بتاؤں گی کہ کیوں ایک تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جانے والی مطلقہ نے سب کچھ اپنے ہونے والے شوہر کے نام لگا کر خود کو خالی ہاتھ کر لیا تھا۔ فریک سے شادی نے مجھے بہت سی قیمتی اشیا اور پراپرٹی کا مالک بنا دیا تھا لیکن جلدی اس نے مجھے طعنے دینے شروع کر دیے تھے۔ ہماری شادی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اب میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کر کے تم سے کوئی بھی ڈیمانڈ کر کے مختلف انداز میں زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی وجہ ہے جو میں تمہیں جیسا کہ پہلے کہہ چکی ہوں، شادی کے بعد ہی بتاؤں گی..... تم جس انداز سے مجھے دیکھ رہے ہو، مجھے تمہاری آنکھوں میں کئی سوال نظر آ رہے ہیں۔ ہاں، واقعی یہ احمقانہ پن اور بہت عجیب ہے لیکن تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ تم میری بات مانو گے اس لیے ان کاغذات پر سائن کر دو اور پھر مجھے رنگ پہنا دو۔'' ڈیانا نے تفصیل سے بات کرتے ہوئے اپنی ڈیمانڈ بتائی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ وہ بہت جذباتی نظر آ رہی تھی۔

جم تو کچھ بولنے کے لائق ہی نہ رہا تھا۔ واجبی سی تعلیم، بس گزارے لائق شکل کے باوجود اسے ڈیانا جیسی لڑکی مل رہی تھی۔ وہ بھی اس انداز میں کہ وہ گنگ سا ہو گیا اور سوچا کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے؟

''دیکھو ڈیانا! حالانکہ میں وعدہ کر چکا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہوں گا کہ تم جو کر رہی ہو، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ.....''

''نہیں جم، پلیز!'' ڈیانا نے اصرار کیا۔ وہ صوفے کے اوپر گھٹنے سمیٹے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور بہت اداس سی لگ رہی تھی۔ [illegible]

سے پریشان کر دیا ہو۔ چند جملے دونوں کے درمیان مزید بولے گئے اور جم نے گویا ہار مانتے ہوئے کاغذات پر سائن کر دیے اور ڈیانا کو رنگ پہنا دی۔

کچھ ہی دن بعد ایک ہفتے کے بعد دونوں نے اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے بعد کچھ عرصہ وہیں رہیں گے اور پھر واپس اسی شہر میں آ جائیں گے۔

''میں اپنے ایک دو کاروباری معاملات نمٹا لوں، ورکشاپ کا کچھ بندوبست کر لوں پھر پرسوں تم سے ملتا ہوں اور پھر شادی اور دوسرے شہر جانے کی تیاری کرتے ہیں۔''

رات کا کھانا ڈیانا کے ساتھ کھانے کے بعد اس کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے جم نے کہا تو ڈیانا نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

موبائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔

''تیار رہو، کھیل کا اختتام ہونے والا ہے۔''

''اوکے..... ہم دونوں اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ کھیل کا اختتام شاندار اور ہماری توقع کے مطابق ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا..... کیونکہ ہم معاملات پر پوری نظر رکھے ہوئے ہیں۔''

☆☆☆

پنک لباس میں ڈیانا بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ شام کا ڈھلتا سورج سمندر میں عکس ڈال کر جہاں اس کی خوبصورتی بڑھا رہا تھا، وہیں اس کی لالی ڈیانا کے چہرے کو مزید حسین بنا رہی تھی۔ اسے جم کا انتظار تھا۔ سمندر کنارے بیٹھی وہ اس کی منتظر تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ تھوڑی دیر میں جم آ گیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' جم نے قریب بیٹھ کر خوشدلی سے پوچھا۔

''تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' ڈیانا نے اپنی نیلی آنکھوں سے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈیانا! ہم اتوار کو یہاں سے جا رہے ہیں اور شادی بھی ادھر جا کر ہی کریں گے۔ میں نے اپنے یہاں کے سارے معاملات نمٹا لیے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟'' جم بات کرتے ہوئے بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''بالکل ٹھیک۔ میں تیاری کر لیتی ہوں تاکہ اس سفر اور زندگی کے نئے سفر کا خوبصورت آغاز کر سکوں۔'' ڈیانا بھی مسکرا دی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کافی پی رہے تھے۔

☆☆☆

[illegible] ''لو یہ پلان بنایا گیا ہے۔'' لہجہ حیرت سے بھرا

حیرت

رات کے وقت ایک عورت باورچی خانے سے خوابگاہ میں آئی تو دیکھا کہ اس کا شوہر بچے کے پالنے کے پاس بت بنا کھڑا ہے۔ بچے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طرح طرح کے جذبوں کے رنگ جھلک رہے ہیں۔ خوشی، فخر، حیرت، تعریف، رشک..... سب کی پرچھائیاں چہرے پر رقصاں ہیں۔ شوہر کی چہرے کی محبت اور مختلف جذبوں کی کشمکش دیکھ کر عورت کے دل میں بچے کے لیے ہی نہیں، شوہر کے لیے بھی پیار امڈ آیا۔ آنکھوں میں محبت کی جوت جگا کر وہ اس کے کاندھے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی۔

''کن خیالوں میں گم ہیں؟''

شوہر نے جواب دیا۔ ''بھئی کمال ہے۔ اتنی دیر سے میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اتنا خوبصورت پالنا کوئی بیس روپے میں کیسے بنا کر دے سکتا ہے؟''

اپنا گھر

ایک سردار جی اپنے گھر میں صرف نیکر پہنے اور بنیان لگائے بیٹھے تھے۔ ایک دوست آیا۔ اس نے پوچھا۔ ''سردار جی! آپ نے نیکر کیوں پہن رکھا ہے؟''

سردار جی فرمانے لگے۔ ''پھر کیا ہوا۔ اپنے گھر میں ہی بیٹھے ہیں۔''

دوست نے کہا۔ ''پھر ٹائی کیوں لگا رکھی ہے؟''

سردار جی نے جواب دیا۔ ''ارے بھئی کبھی کوئی ملنے جلنے والا بھی تو آ جاتا ہے۔''

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

انٹرویو

پریس رپورٹر نے ایک بڑی شخصیت کا انٹرویو لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ کبھی تفریح بھی کیا کیجیے۔ مثلاً مچھلی کا شکار وغیرہ تاکہ اس کا ذکر بھی آپ کے انٹرویو میں کر سکیں۔''

بڑے آدمی نے جواب دیا۔ ''آپ شوق سے یہ بات اپنے اخبار میں چھاپ دیں۔ میں کل ہی اپنے سیکریٹری کو مچھلی کے شکار پر بھیج دوں گا۔''

ہوا تھا۔
"ہاں، دیکھو کیسا گھٹیا اور چالاک شخص ہے یہ۔"
"کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا کم کریں گے۔"
"ہاں، ایسے کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔"

☆☆☆

اتوار کی شام کو جم نے ڈیانا سے کہا کہ وہ تیار ہو کر اور اپنا ضروری سامان لے کر اس کے فلیٹ پر آجائے پھر وہیں سے دونوں اپنے نئے سفر کے لیے نکلیں گے۔ ڈیانا نے اپنا ضروری سامان پیک کیا اور جم کے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد وہ جم کے پاس تھی۔ جم نے بھی اپنا بیگ تیار کر رکھا تھا۔
"میں کافی بنا کر لاتا ہوں، پی کر چلتے ہیں۔ کھانا راستے میں ہی کھائیں گے۔" اس نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔
"ضرور..... کافی کی مجھے بھی طلب ہو رہی تھی۔" ڈیانا نے کہا۔ وہ ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
"یہ کون اس وقت آ گیا؟" جم کچن سے نکلتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ چند لمحوں میں میگی اور جم اس طرح کمرے میں داخل ہوئے کہ جم اسے دھکیل رہا تھا اور وہ زبردستی اندر گھس رہی تھی۔ ڈیانا صورت حال کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میگی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔
"تو تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے؟" اس نے جم کو پرے دھکا دیتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔
"نکل جاؤ، بدتمیز لڑکی! کیوں زبردستی سر پر سوار ہو رہی ہو۔ کتنی بار کہوں کہ میں تمہیں چھوڑ چکا ہوں۔ تم بھی اب جان چھوڑو میری۔" جم بھی چیخا۔
"تم تو کہتے تھے میگی اب کبھی تمہاری زندگی میں واپس نہیں آئے گی۔ یہ تو پھر آ گئی تماشا کرنے۔" ڈیانا نے شکوہ کیا۔
"بکواس بند کرو گھٹیا عورت! تمہیں شرم آنی چاہیے کسی کے بنے بنائے تعلق کو خراب کرتے ہوئے۔ تم اپنی زبان بند رکھو ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔" میگی چلائی۔
"تم ایسے نہیں مانو گی۔" غصے سے کہتا ہوا جم اس کے قریب آیا اور دونوں بازو دبوچ کر اسے بیرونی دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ میگی زور لگا رہی تھی اور اسے اور ڈیانا، دونوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے زور لگاتے ہوئے خود کو چھڑایا اور قریب پڑا ہوا گلدان پوری قوت سے ڈیانا کی جانب پھینکا۔ ڈیانا نے تیزی سے خود کو صوفے پر گرا کر زخمی ہونے سے بچایا۔ جم اور میگی اب دونوں ایک دوسرے کو مار رہے تھے، بال نوچ رہے تھے۔ ڈیانا بیچ بچاؤ کروانے کے بجائے خود کو بچا کر سائیڈ پر کھڑی تھی۔ کمرے کی چیزیں ٹوٹ رہی تھیں۔ شیشے کی ٹیبل کی کرچیاں بکھر گئی تھیں۔ ٹی وی ٹوٹ چکا تھا اور وہ دونوں بھی تھوڑے تھوڑے زخمی ہو چکے تھے۔ لڑتے لڑتے جم کسی چیز سے لگ کر گرا تو میگی نے شیشے کا اسٹول اٹھا کر اس کے سر پر مارنا چاہا۔ جم نے جواباً اسے دھکا دیا اور اسٹول کو ایک سائیڈ پھینکنا چاہا تو اسٹول میگی کے سر پر لگ گیا اور وہ گر کر یکدم ساکت ہو گئی۔ صوفے اور کرسی کے درمیان گری میگی کو جم نے غور سے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا۔ اس کی نبض چیک کی۔ اس کے ہاتھ سے میگی کا بازو چھوٹ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ڈیانا کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا جو کچن کے قریب ڈری ڈری سی کھڑی تھی۔ جم کے خوفزدہ انداز، میگی کے ابھی تک دوبارہ نہ اٹھنے نے ڈیانا پر صورت حال تقریباً واضح کر دی تھی۔
"میگی..... کیا ہوا..... تم.....؟" وہ رک رک کر پوچھ رہی تھی۔
"ڈیانا! میگی..... میگی مر چکی ہے..... بہت برا ہو گیا..... بہت ہی برا ہو گیا۔" جم کانپتے ہوئے بول رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ڈیانا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ڈیانا اسے آنکھیں پھیلائے دیکھ رہی تھی۔
"اب کیا ہو گا؟" وہ اس کے پاس بیٹھ کر پوچھ رہی تھی۔
"معلوم نہیں۔" جم نے پسینہ صاف کیا۔ "لگتا ہے ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔" جم ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
ڈیانا کچن کی دیوار سے ٹیک لگائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھی اور پانی کی بوتل نکال کر جم کے منہ سے لگا دی۔ وہ تیزی سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو جم کچھ بولنے کے قابل ہوا۔
"میں..... میں اس کی لاش کو چھپانے لگا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں ابھی شادی کو ملتوی کر دینا چاہیے۔ میں اس کی ڈیڈ باڈی کو ٹھکانے لگاتا ہوں۔ تم ابھی واپس جاؤ۔ ہم دونوں اس وقت شہر چھوڑ کر گئے تو اس کی لاش ملنے کے بعد مجھ پر اور تم پر الزام آجائے گا۔ یہ اپنے قریبی دوستوں کو تمہارے [illegible] اگر

گر ہمارا نام آیا تو میں نے سوچا ہے کہ میں کیس خود برداشت کروں گا اور یہ ثابت کرنے تک کہ خونخوار لڑائی کے باوجود یہ موت واقعی حادثہ ہی ہے، تم سے نہیں ملوں گا۔ بالکل، یعنی میں تم اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہونے کے باوجود زیادہ مشہور نہیں ہوئیں لیکن پھر بھی بہت سے لوگ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم بدنام ہو جاؤ، مجھ سے برداشت نہیں ہوگا اس لیے پلیز، تم چلی جاؤ۔ حالات سازگار ہوتے ہی میں تمہیں خود کال کروں گا۔ یاد رکھنا، اس سارے عرصے میں مجھ سے رابطہ ہرگز نہ کرنا۔" اس نے بات مکمل کی اور باقی بچا ہوا پانی پینے لگا۔
پانی پی کر وہ اٹھا اور ایک کمبل لے کر آیا اور میگی کی لاش اس میں لپیٹ لی۔ "میں اسے گاڑی کی ڈکی میں رکھ کر آتا ہوں۔ تم جاؤ، جب ذرا باہر رش کم ہو جائے گا تو میں اسے کہیں پھینک آؤں گا۔" کہہ کر جم، میگی کی لاش کو لے کر کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف چل دیا۔ واپس آکر اس نے ڈیانا سے کہا کہ وہ اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھے۔ وہ اس کا بیگ لے کر آتا ہے۔ ڈیانا آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے اٹھی اور چل دی۔ جم نے ڈیانا کی گاڑی کو دور جاتے دیکھا اور پھر دروازہ لاک کر کے اندر آ گیا۔

☆☆☆

"تیاری مکمل ہے؟"
"ہاں، مکمل ہے۔ تم بتاؤ سب ویسے ہی ہوا؟" پوچھا گیا۔
"بالکل ویسے ہی ہوا..... یعنی پلان کے مطابق ہوا۔ اب دو چار دن بعد دور دراز جھٹکا لگائیں گے۔" بتایا گیا۔
"ٹھیک ہے، پھر پہنچو ائیرپورٹ پر۔"
"اوکے!"

☆☆☆

"آجاؤ باہر..... چلی گئی وہ۔" جم نے گاڑی کے پاس آکر کہا۔ ڈیانا کے جاتے ہی وہ تیزی سے گیراج میں آیا تھا۔
"اچھا تو گئی وہ ڈیانا بے وقوف؟" میگی نے خود پر سے چادر ہٹا کر اٹھتے ہوئے کہا۔
"ہاں، چلی گئی۔ آؤ، اندر بیٹھ کر آگے کی بات کرتے ہیں۔" جم نے کہا۔
"میں نے کیا کمال کی ایکٹنگ کی ہے نا؟" میگی مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"اور کیا، اس ڈیانا کی تو جان نکل گئی تھی۔ کانپتی ہوئی اٹھی ہے۔" جم [illegible]
"اس کے اثاثات تو تمہیں مل کر رہیں گے نا؟" میگی نے سوال کیا۔
"ارے یہ کام تو بہت پہلے ہو چکا ہے۔" جم نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔
"جب کلارا نے تمہارے اور اس حسین بلا کے بارے میں بتایا تھا تو یقین کرو مجھے آگ لگ گئی تھی لیکن تم نے اسی روز جب میں تم سے لڑنے آئی تھی، مجھے اپنا پلان بتا دیا تھا۔ کلارا حیران تھی۔ اس نے مجھ سے جب ساری حقیقت سنی تو کہہ رہی تھی کیا ڈیانا کو بے وقوف بنا کر اس کی دولت و پراپرٹی ہتھیانا آسان ہوگا؟ تو میں نے اسے بتایا کہ جم بہت ہوشیار ہے۔ وہ آسانی سے اسے شیشے میں اتار لے گا۔ چلو جان چھوٹی اس سے۔ تم مجھے بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟ کیا مجھے کچھ عرصہ روپوش رہنا ہوگا یا کچھ اور پلاننگ ہے تمہارے ذہن میں؟" میگی نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔
"تم ایسا کرو....." ابھی جم نے بات شروع کی ہی تھی کہ موبائل بج اٹھا۔ "ارے، ڈیانا کا فون....." وہ تھوڑا سا گھبرا گیا اور میگی کی طرف دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کال اٹینڈ کروں؟
"بات کرو اس سے۔ رک کیوں گئے؟" میگی نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ہمت بندھائی۔
"کہیں اسے پتا تو نہیں چل گیا کہ پراپرٹی کے کاغذات میرے پاس ہیں۔" جم ڈر رہا تھا۔
"تو..... تو کیا کرے گی وہ..... اس نے خود اپنی پراپرٹی تمہاری محبت میں پاگل ہو کر تمہارے نام کی ہے اور ویسے بھی تم نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں تم نے فول پروف پلاننگ کی ہے کہ کیسے اسے ڈرا کر بھگانا ہے پھر کچھ دنوں بعد ہم دونوں نے غائب ہو جانا ہے اور کچھ عرصے بعد ان کاغذات کا بھرپور فائدہ اٹھانا ہے۔ پھر کیوں ڈر رہے ہو۔ دیکھو وہ مسلسل کال کیے جا رہی ہے۔ بات کرو اور اگر اسے کوئی شک ہو گیا ہو تو اسے الجھا دو ورنہ اتنی محنت اور ایکٹنگ اکارت جائے گی۔" میگی نے اسے سمجھایا تو جم نے سیل فون اٹھا لیا۔
"ہیلو ڈیانا! کیوں فون کیا ہے؟ میں نے کہا بھی تھا کہ....."
"جم..... جم! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو یوں اپنے سامنے مرتے دیکھا ہے۔ مجھے تو پکڑے جانے سے بھی خوف آ رہا ہے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے یہ شہر چھوڑ دوں اس لیے [illegible] پلیز، جم! ناراض [illegible]

عقل بند

ملک صفدر حیات

اکثر شاطر لوگ خود کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں جبکہ کُل عقل کا ذرا سا حصہ ہی ان کے نام ہو پاتا ہے۔ اس پر ان کے گھمنڈ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ زمانے کو ٹھوکر پر رکھتے ہیں... مگر بھول جاتے ہیں کہ جب قدرت کی لاٹھی رقص کرتی ہے تو ٹھوکر پر رکھنے والے نہ صرف خود ٹھوکر کھا کر منہ کے بل جا گرتے ہیں بلکہ ٹھکرائے جانے کی تکلیف انہیں پھر کبھی چین نہیں لینے دیتی۔

چالبازی سے کسی بے قصور پر پتھروں کی بارش کرنے والی ایک مکار حسینہ کی عیاریاں

جاتی ہوئی سردی صحت کے لیے کسی ناگ سے کم نہیں ہوتی اور یہی فارمولا ہر موسم پر منطبق ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ موسم کوئی بھی ہو، اس کی آمد اپنے ساتھ بیماریاں بھی لے کر آتی ہے لہٰذا احتیاط ضروری ہے اور موسم کی رخصتی صحت اور تندرستی کی پیامبر ہوتی ہے چنانچہ اس سے دل کھول کر استفادہ کرنا چاہیے۔

وہ ماہِ فروری کا وسط تھا۔ موسم سرما رخصت ہوتے ہوئے گلابی ٹھنڈک چھوڑ گیا تھا اور وہ بھی چند دن کی مہمان تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا حسبِ معمول روزمرہ کے کام نمٹا رہا تھا کہ تین افراد مجھ سے ملنے آگئے۔ ان کی آمد کی اطلاع کانسٹیبل سیف اللہ نے مجھ تک پہنچائی تھی۔

"ملک صاحب! لاہور سے کچھ بندے آئے ہیں۔" کانسٹیبل نے بتایا۔ "ان میں دو کا تعلق اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ وہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

ان دنوں میری تعیناتی ضلع گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں تھی۔ لاہور میرے تھانے سے محض چالیس میل اور لگ بھگ ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے سیف اللہ سے کہا۔

"انہیں فوراً میرے پاس بھیجو۔"

آئندہ ایک منٹ کے اندر وہ تینوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ان میں سے ایک نے سب کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! میں سب انسپکٹر بشارت ہوں اور یہ میرے ساتھ کانسٹیبل ضمیر ہے۔" اس نے اپنے پہلو میں

ان کی بیوی نرگس پریشان ہو گئی۔ اگلی صبح وہ میرے پاس آئی اور میاں صاحب کی عدم موجودگی کے بارے میں بتایا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے میں بھی فکرمند ہو گیا۔ میں نے نرگس سے کہا کہ وہ آج کا دن یعنی نو فروری تک اپنے شوہر کا انتظار کرے۔ اگر میاں نذیر واپس نہ آئے تو میں خود دس فروری کو قلعہ دیدار سنگھ جا کر میاں صاحب کی خیر خبر لوں گا۔ میں دس فروری کی صبح لاہور سے ایک بس میں بیٹھ کر گوجرانوالہ آنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ گوجرانوالہ کے بس اسٹینڈ سے میں نے ایک تانگہ پکڑا اور چودھری حق نواز سے ملنے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا...... آپ کو یقین نہیں آئے گا تھانیدار صاحب......!'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

اسی وقت کانسٹیبل مہمانوں کی خاطر تواضع کے سامان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ جب کانسٹیبل اشیائے خورونوش کو میز پر سجانے کے بعد واپس چلا گیا تو میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''گفتگو کا سلسلہ جاری رہے گا مگر پہلے طعام، بعد کلام اور کام......!''

جب ان تینوں کے ہاتھ اور منہ حرکت میں آ گئے تو میں نے علی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بات کا یقین کر لوں گا۔ آپ بتائیں، کیا ہوا تھا؟''

''دس فروری کو جب میری ملاقات چودھری حق نواز سے ہوئی تو اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ کسی میاں نذیر کو نہیں جانتا اور اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی پچاس فٹ زمین فروخت نہیں کی، پچاس ایکڑ زرعی اراضی کو بیچ ڈالنا تو ایسا ہی ہے کہ انسان زمین پر کھڑے ہو کر آسمان کا سودا کرنے کا تصور کرے۔''

''ہاں، یہ تو چودھری نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور علی محمد سے پوچھا۔ ''پھر آپ نے کیا کیا؟''

''میرے پاس واپسی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ سو میں نے لاہور جانے والی بس پکڑی اور گھر آ گیا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے یہ تو سن رکھا ہے کہ کوئی زمیندار اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر زمین بیچنے کے بارے میں سوچنا بھی وہ گناہ سمجھتا ہے اور دوسری جانب میاں صاحب ہیں جنہوں نے کبھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کی۔''

''کیا آپ نے [illegible] میاں نذیر کے

بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''جبکہ یہ ہمارے معزز ساتھی علی محمد ہیں۔''

علی محمد اور دونوں پولیس والے اس وقت عوامی لباس میں تھے۔ سب انسپکٹر کی بات مکمل ہونے پر میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''ملک صاحب! ہمیں آپ کی مدد اور تعاون درکار ہے۔'' سب انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم لاہور کے ایک رہائشی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔''

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر مہمانوں کے لیے چائے پانی اور بسکٹ وغیرہ لانے کو کہا پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

''آپ کو کس کی تلاش ہے اور وہ بھی میرے علاقے میں؟ میں تفصیل جاننا چاہوں گا اور جہاں تک میری مدد اور تعاون کی بات ہے تو آپ مجھے پیش پیش پائیں گے۔ بتائیں معاملہ کیا ہے؟''

سب انسپکٹر نے علی محمد نامی شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ شروع کریں۔ اگر کوئی بات رہ گئی تو وہ میں ملک صاحب کو بتادوں گا۔''

''تھانیدار صاحب!'' علی محمد براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے ایک دوست میاں نذیر نے قلعہ دیدار سنگھ کے چودھری حق نواز سے پچاس ایکڑ زرعی زمین خریدی تھی۔ میاں نذیر اس زمین پر پھلوں کے باغات لگانا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ کئی بار لاہور سے قلعہ دیدار سنگھ آ بھی چکا تھا۔''

''ایک منٹ!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''علی محمد! آپ اپنے دوست میاں نذیر کا ذکر کرتے ہوئے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو؟''

''میں اسی طرف آرہا تھا۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میاں صاحب آخری بار جب قلعہ دیدار سنگھ ضلع گوجرانوالہ آئے تو پھر واپس نہیں گئے۔''

''اوہ...... یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''میاں نذیر آخری مرتبہ آٹھ فروری کو یہاں آئے تھے۔'' علی محمد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ جب بھی قلعہ دیدار سنگھ آتے تو شام میں واپس لاہور ضرور چلے جاتے [illegible]

پاس پچاس ایکڑ اراضی کی ملکیت کے کاغذات وغیرہ دیکھے تھے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی، بالکل دیکھے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب انہوں نے مجھے باغات کے لیے پچاس ایکڑ زمین کی خریداری کے بارے میں بتایا تو میں ان کے گھر گیا تھا۔ اس روز میاں صاحب اور بھابی نرگس سے میری خاصی طویل ملاقات ہوئی تھی۔ اسی دوران میں میاں صاحب نے مجھے زمین کی خریداری کے پکے کاغذات بھی دکھائے تھے۔ میں رات کا کھانا ان کے ساتھ کھانے کے بعد ہی واپس آیا تھا۔''

''یہ تو ہو گیا دس فروری کا احوال۔'' میں نے علی محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور آج ہے فروری کی بارہ تاریخ۔ میں جاننا چاہوں گا کہ کل یعنی گیارہ فروری کو آپ کیا کرتے رہے تھے؟''

''میاں صاحب کے زیادہ رشتے دار نہیں تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''پہلی بیوی مرحومہ صفیہ بی بی سے ان کا صرف ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام شفیق ہے۔ شفیق عرصۂ دراز سے فرانس کے شہر پیرس میں سیٹل ہے۔ وہ پیرس میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہے اور اس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے۔ میاں صاحب کی دوسری بیوی بھابی نرگس ہیں۔ نرگس سے انہوں نے دو سال پہلے شادی کی ہے۔ ابھی ان کی اولاد نہیں ہے۔ یہ تو ہو گئی میاں صاحب کی [illegible]......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دوست احباب اور دیگر میل ملاپ والے لوگوں کا حلقہ بھی محدود ہے۔ میں نے کل شام تک ہر جاننے والے سے پوچھ گچھ کر لی لیکن کہیں سے بھی میاں صاحب کی اطلاع نہیں ملی چنانچہ میں نرگس بھابی کو ساتھ لے کر تھانے گیا اور میاں صاحب کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔''

''ہم اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔'' سب انسپکٹر بشارت نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رپورٹ درج ہو جانے کے بعد کارروائی ضروری تھی۔ تھانے کے انچارج صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ کو صورت حال سے آگاہ کر سکوں۔ اس پوائنٹ کے ساتھ کہ قلعہ دیدار سنگھ کے چودھری حق نواز کا نام آرہا ہے اور قلعہ دیدار سنگھ آپ کے تھانے کی حدود میں آتا ہے لہٰذا یہ سارا تفتیشی پروگرام آپ کی نگرانی ہی [illegible]

ساتھ رہیں گے۔ وہ بھی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو...... بصورت دیگر ہم دونوں بھی علی محمد کے ساتھ ہی واپس لاہور چلے جائیں گے۔ تمام معلومات آپ کو فراہم کر دی گئی ہیں۔ جب آپ میاں نذیر [illegible] میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں بتا دیجیے گا۔''

''نمبر ایک...... مجھے آپ دونوں کے یہاں رہنے بلکہ آپ کے ساتھ علی محمد کے بھی قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کے لیے بستر اور کھانے پینے کا مناسب بندوبست کر دیا جائے گا۔ آپ جب تک چاہیں، مہمان بن کر یہاں رہ سکتے ہیں۔ نمبر دو......'' میں نے کلامی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کی فراہم کردہ معلومات ادھوری ہیں۔ میں ان سے مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے اور چند دستاویزی ثبوت بھی چاہیے ہوں گے۔ چودھری حق نواز پر ہاتھ ڈالنے کے لیے یہ سب ضروری ہے۔''

''آپ ہم سے جو بھی سوال کریں گے، ہم اس کا [illegible] درست جواب دیں گے۔'' سب انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن دستاویزی ثبوت والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ملک صاحب!''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ''علی محمد نے بتایا ہے کہ اس نے میاں نذیر کے پاس پچاس ایکڑ زرعی زمین کی ملکیت کے کاغذات دیکھے ہیں جو اس امر کا ثبوت ہے کہ چودھری حق نواز نے اپنی پچاس ایکڑ زرعی اراضی میاں نذیر کے ہاتھ فروخت کی ہے۔ اس قانونی دستاویز میں مذکورہ زمین کی قیمت بھی درج ہوگی۔ مجھے وہ کاغذات چاہیے ہوں گے۔''

''زمین کے کاغذات میاں صاحب کے گھر ہی میں ہوں گے۔'' علی محمد نے کہا۔ ''میں بھابی نرگس سے وہ کاغذات لا کر آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ میں نے خود پڑھا تھا، ان کاغذات میں اس زمین کی فی ایکڑ قیمت ایک ہزار روپے لکھی ہوئی تھی۔''

''یعنی پچاس ایکڑ اراضی کو خریدنے کے لیے آپ کے میاں صاحب نے چودھری حق نواز کو پچاس ہزار روپے ادا کیے تھے؟'' میں نے بے یقینی سے علی محمد کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''میاں نذیر کرتا کیا ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا ذریعۂ آمدنی کیا ہے؟''

[illegible] لاہور [illegible] میں [illegible] کی ایک موٹر

"چند باتیں تو بھابی نے مجھے بتائی بھی ہیں۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ اس دوران میں، میں نے دستاویز کا مطالعہ اور مشاہدہ شروع کر دیا تھا لہٰذا اس نے جلدی سے اضافہ کر دیا۔ "آپ پہلے ان کاغذات کا جائزہ لے لیں پھر میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

میں نے بغور ان کاغذات کا معائنہ کیا اور مجھے ایک دو... تمام پر کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ بعض دستخط جعلی تھے اور ایک آدھ مہر میں بھی گڑبڑ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے علی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"یہ پچاس ایکڑ زمین کے اصلی کاغذات نہیں ہیں۔ لگتا ہے آپ کے دوست کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ [illegible] ے اندازے کے مطابق کسی نے گھر میں بیٹھ کر یہ جعلی چیز تیار کی ہے۔ مزید تسلی کے لیے میں پٹواری اور [illegible] کو بھی یہ کاغذات دکھاؤں گا اور رجسٹری آفس میں [illegible] چیک کروں گا کہ اس قطعۂ اراضی کے انتقال کا کوئی ریکارڈ موجود ہے یا نہیں۔ اگر چودھری نے زمین بیچی [illegible] سرکاری ریکارڈ لازمی مل جائے گا۔"

"[illegible] صاحب! یہ دفتری جانچ پڑتال تو ہوتی رہے [illegible] نے کہا۔ "لیکن چودھری حق نواز تو قلعہ دیدار [illegible] رہتا ہے۔ اگر واقعی یہ کاغذات بوگس ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میاں نذیر کے ساتھ چودھری نے فراڈ کیا ہے۔ آپ فوری طور پر چودھری حق نواز سے تو پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں نا۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر یاد دہانی کرانے والے انداز میں بولا۔

"آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں پچاس ایکڑ اراضی کی ملکیت کے کاغذات لے آؤں تو آپ چودھری حق نواز پر ہاتھ ڈالیں گے۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ہم ابھی قلعہ دیدار سنگھ کی طرف جانے والے ہیں۔ چودھری سے جو بھی بات ہوگی وہ آپ کے سامنے ہی ہوگی لیکن یہ نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ..." میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اضافہ کر دیا۔

"ان کاغذات کے جعلی ثابت ہو جانے سے یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ میاں نذیر کے ساتھ ایک سنگین دھوکا کر کے کسی شخص نے پچاس ہزار روپے ہتھیا لیے تھے مگر وہ 'کسی' چودھری حق نواز ہی ہے، اس بات [illegible]

کرنا پڑے گی اور وہ میں ضرور کروں گا۔ آپ کو اس حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"سمجھ گیا جناب!" وہ جلدی سے بولا۔

"تو پھر بتائیں، نرگس نے آپ سے کون سی اہم باتیں کی ہیں؟"

"دو باتیں ہیں ملک صاحب!" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میاں صاحب کی دکان پر ایک دیرینہ وفادار ملازم کام کرتا ہے۔ اس ملازم کا نام سدھیر ہے۔ میاں صاحب سدھیر پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ سدھیر کی زبانی نرگس بھابی کو پتا چلا ہے کہ چودھری حق نواز کا ایک ملازم خاص ارشاد، میاں صاحب کی دکان سے ٹیوب ویل اور موٹروں وغیرہ کا سامان لینے آتا تھا۔ میاں صاحب کی ارشاد سے دوستی ہو گئی تھی اور وہ پہلی بار ارشاد کے ساتھ ہی قلعہ دیدار سنگھ آئے تھے۔ جلد ہی میاں صاحب اور چودھری حق نواز میں گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کے بعد میاں صاحب مہینے میں ایک دو بار قلعہ دیدار سنگھ کا چکر لگانے لگے تھے۔ چودھری نے میاں صاحب کے اندر کاشت کاری کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ وہ پچاس ایکڑ زمین چودھری سے خرید کر اس پر باغات لگانے والے تھے مگر پھر وہ اچانک غائب ہو گئے۔"

"اور دوسری بات؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"میاں صاحب پروفیسر علوی پر بہت بھروسا کرتے تھے۔" علی محمد نے بتایا۔ "وہ کوئی بھی نیا کام شروع کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب سے ضرور مشورہ کرتے تھے۔ نرگس بھابی کا کہنا ہے کہ پروفیسر صاحب نے پھلوں کے باغات لگانے کے حوالے سے میاں صاحب کی نہ صرف تائید کی تھی بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ اس کاروبار میں انہیں بہت فائدہ ہوگا۔"

"پروفیسر علوی کیا بیچتے ہیں؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

علی محمد سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میری بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے، پروفیسر صاحب کون سی یونیورسٹی میں کیا پڑھاتے ہیں اور کس مضمون میں مہارت رکھتے ہیں؟"

[illegible] جلدی سے بولا۔ "وہ ایک عالم فاضل

[illegible] اور بھاٹی گیٹ میں ان کا آستانہ ہے۔"

"سمجھ گیا" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "وہ فرزانستان یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ایک گریجویٹ پروفیسر ہیں جو سادہ لوح افراد کو الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔"

میرے اس ترش تبصرے پر علی محمد نے کوئی خیال آرائی نہیں کی۔

"آپ کے بتائے ہوئے یہ دونوں کردار لاہور میں رہتے ہیں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "دو روز بعد مجھے اپنے ایک ذاتی کام سے لاہور کا چکر لگانا ہے۔ تب آپ کے علاوہ میاں نذیر کی بیوی نرگس، اس کے ملازم سدھیر اور اس کے پیر و مرشد پروفیسر علوی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اس دوران میں، میں زمین کے کاغذات کی حقیقت کا پتا چلاتا ہوں۔"

"اور چودھری حق نواز.....؟" اس نے بات نامکمل چھوڑ کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ایک گھنٹے کے بعد ہم چودھری کی حویلی میں ہوں گے۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

علی محمد کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے ایک تانگا منگوایا اور علی محمد کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر قلعہ دیدار سنگھ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کانسٹیبل غفور احمد بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ میرا تھانہ جی ٹی روڈ (جرنیلی ٹرنک روڈ) پر لاری اڈے کے ساتھ واقع تھا۔ یہ علاقہ شیخوپورہ روڈ بھی کہلاتا تھا۔ راولپنڈی سے لائل پور (فیصل آباد) جانے والی بسیں اسی موڑ پر جی ٹی روڈ کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی تھیں۔ شیخوپورہ، لائل پور سے پہلے پڑتا تھا اسی لیے یہ موڑ "شیخوپورہ موڑ" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ قلعہ شیخوپورہ کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جرم و سزا کی سنسنی خیز کہانیوں سے بھری ہوئی۔ اس زمانے کے سروے کے مطابق صوبہ پنجاب میں جرائم کے لیے سب سے زیادہ مشہور دو علاقے تھے..... اوکاڑہ اور قلعہ شیخوپورہ!

☆☆☆

راستے بھر علی محمد سے میری بات چیت کا عمل جاری رہا۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے ایک پرانے علاقے کرشن نگر میں رہتا تھا۔ گمشدہ میاں نذیر کی رہائش ماڈل ٹاؤن میں تھی۔ ان دونوں کی دوستی کی عمر پندرہ [illegible] منڈی وغیرہ سے گزر کر قلعہ

دیدار سنگھ پہنچ گیا۔

چودھری حق نواز نے ہمارا بڑا تپاک سے استقبال کیا اور ہمیں پرانی طرز تعمیر کی ایک عالیشان بیٹھک میں بٹھایا۔ چودھری کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی تاہم مجھے اس کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل تھیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ بڑے چودھری رب نواز کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں زمین و جائیداد کا بٹوارا ہو گیا تھا۔ اگرچہ چودھری حق نواز اس تقسیم کے حق میں نہیں تھا لیکن چھوٹے بھائی چودھری علی نواز نے ایسا رولا ڈالا تھا کہ بڑا بھائی یعنی حق نواز مجبور ہو گیا تھا۔ بٹوارے کے بعد علی نواز نے اپنی رہائش کے لیے نئی حویلی تعمیر کروالی تھی اور آبائی پرانی حویلی حق نواز کے حصے میں آئی جس کی بیٹھک میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری حق نواز نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "ملک صاحب! یہ جو لاہوری بندہ آپ کے ساتھ آیا ہے، میں سب سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ باقی باتیں بعد میں.....!"

چودھری کی بات سن کر علی محمد نے چونک کر پہلے چودھری کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے علی محمد کی بے چینی اور الجھن کو نظر انداز کرتے ہوئے چودھری سے کہا۔

"آپ اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں چودھری صاحب! لیکن آپ کو اس "شکریے" کی وجہ بھی بتانا پڑے گی کیونکہ علی محمد کو توقع نہیں تھی کہ آپ اس قسم کی کوئی بات کریں گے۔ ان کے تاثرات نے مجھے بھی گہری سوچ میں ڈال دیا ہے۔"

"ضرور..... کیوں نہیں۔" چودھری نے معتدل انداز میں کہا پھر علی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں بولا۔ "بھائی! میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ملک صاحب کے تھانے میں میرے خلاف کوئی رپورٹ درج کرائی ہے جس کی تفتیش کے لیے انہیں آپ کے ساتھ یہاں آنا پڑا اور اسی بہانے ملک صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس سے پہلے میں نے صرف ان کا نام ہی سنا تھا۔ آپ کی شکایت کی برکت سے آج ان کا دیدار بھی ہو گیا۔" پھر وہ روئے سخن میری جانب موڑتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"ملک صاحب! اتنی وضاحت کافی ہے نا؟"

[illegible] چودھری صاحب!" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

بھی آپ سے مل کر بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے لیکن ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر علی محمد کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"علی محمد کے دوست میاں نذیر کی گمشدگی کی رپورٹ لاہور کے متعلقہ تھانے میں درج کرائی گئی ہے۔ ایک روز پہلے علی محمد آپ سے مل کر گیا تھا اور آپ نے کسی میاں نذیر کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی اگلے روز لاہور کے تھانے میں رپورٹ درج ہوئی۔ کل اس تھانے سے دو پولیس والے علی محمد کو ساتھ لے کر میرے پاس آئے تھے تاکہ میں میاں نذیر کی تلاش میں ان کی مدد کر سکوں۔ میں نے ان لوگوں کی کہانی کو پوری توجہ سے سنا اور کہا کہ پچاس ایکڑ اراضی کی خرید کے حوالے سے جو قانونی دستاویز تیار کی گئی ہے، وہ مجھے لا کر دکھاؤ۔ اس کے بعد ہی میں کارروائی کروں گا۔ آج علی محمد وہ کاغذات لے آیا ہے۔ اسی لیے ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں چودھری صاحب!"

میرے آخری جملے نے چودھری کو چونکا دیا۔ "یہ تو آپ نے بہت نیک کام کیا ہے ملک صاحب!" وہ ستائشی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ "ان کاغذات کی موجودگی میں مجھے اپنی صفائی پیش کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ پہلے میں آپ کے لیے کھانے کا بندوبست کراتا ہوں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے چودھری صاحب!" میں نے جلدی سے کہا۔ "آج میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا ہوا ہے۔"

"اور میں بھی فل ہوں۔" میری دیکھا دیکھی علی محمد نے کہا۔

"ملک صاحب! کیا ہوا جو آج سے پہلے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے آپ کی مکمل جانکاری رکھی ہوئی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "آپ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد آپ ناشتا کرتے ہیں اور پھر تیار ہو کر تھانے میں جا بیٹھتے ہیں۔ آپ نے ڈٹ کر یا ہلکا ناشتا بھی کیا ہو تو اب تک اس کا اثر آپ کے پیٹ میں موجود نہیں ہوگا۔ یہ عین کھانے کا وقت ہے۔ تکلف میں نہیں بلکہ آپ کر رہے ہیں اور آپ..." وہ علی محمد کی جانب دیکھتے ہوئے مستقل لہجے میں بولا۔ "آپ لاہور سے آئے ہیں۔ جس بس نے آپ کو گوجرانوالہ پہنچایا ہے، [illegible]

حل ہو سکتے ہیں؟"

چودھری حق نواز کے دلائل کے سامنے مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور ہمارے لیے ایک شاندار قسم کا "آرڈر" دینے کے بعد واپس آ گیا۔ ہمارے درمیان سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے چودھری نے ان کاغذات کا جائزہ لیا جو علی محمد لاہور سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے میرے خیالات کی تائید میں دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ملک صاحب! یہ کاغذات ایک دم جعلی ہیں۔ ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے تو آپ ڈسٹرکٹ رجسٹریشن آفس جا کر ریکارڈ چیک کر لیں۔ آپ کو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا کہ میں نے کسی میاں نذیر کے ہاتھ اپنی پچاس ایکڑ زرعی اراضی فروخت کی ہے یا کسی میاں نذیر نے مجھ سے مذکورہ اراضی خریدی ہے۔"

"صرف رجسٹری آفس ہی نہیں، میں پٹوار خانے اور قانون گو سے بھی اس معاملے کی چھان بین کراؤں گا۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن فی الحال میں یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں کہ آپ نے کس بنیاد پر ان کاغذات کو جعلی قرار دیا ہے؟"

"ایک سے زیادہ وجوہات ہیں۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

"آپ نمبر وار بتاتے جائیں چودھری صاحب!" میں نے کہا۔ "میں اسی غرض سے چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھے ہمہ تن گوش پائیں گے۔"

میرے ان الفاظ پر علی محمد بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"بات ثبوت کے ساتھ ہو تو مزہ بھی آتا ہے۔" چودھری اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں ملک صاحب! پھر ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔"

چودھری کے بیٹھک سے نکلنے کے بعد علی محمد نے مجھ سے پوچھا۔ "چودھری کہاں چلا گیا؟"

"آپ نے شاید اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "میرے خیال میں وہ کوئی ایسی شے لینے گیا ہے جو اسے سچا ثابت کر سکتی ہو۔" [illegible]

"یہ تو اس کی واپسی پر ہی پتا چلے گا۔"

اس کے بعد علی محمد نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ چند منٹ کے بعد چودھری حق نواز ایک فائل تھامے بیٹھک میں آیا۔ وہ دوبارہ اسی صوفے پر بیٹھا جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا پھر وہ فائل میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ملک صاحب! اس فائل کے اندر درجن بھر ایسے ہم نوعیت کاغذات لگے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک پر میرے دستخط موجود ہیں۔ آپ ان دستخط کو اس دستاویز پر موجود میرے دستخط کے ساتھ ملا کر دیکھیں۔ فرق آپ کو صاف نظر آ جائے گا اور وہ فرق آپ اس لاہوری بندے کو بھی دکھا دیں۔"

میں نے چودھری کی فرمائش پوری کرنے میں چند لمحات صرف کیے پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں چودھری صاحب! پچاس ایکڑ اراضی والی دستاویز پر موجود آپ کے دستخط ان فائل والے کاغذات سے کافی مختلف ہیں۔"

"اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں جناب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "نمبر ایک... یہ کاغذات آپ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں، ان پر نظر آنے والے میرے دستخط جعلسازی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ کسی بدنیت شخص نے میرے دستخط کی نقل کرنے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اسے اس مذموم مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ہاں، البتہ وہ میاں نذیر نامی کسی شخص کو بے وقوف بنانے میں ضرور کامیاب رہا ہے۔ نمبر دو... اس دستاویز میں زرعی اراضی کی فی ایکڑ جو قیمت درج ہے، وہ ہوشربا اور ناقابلِ یقین ہے۔ زمین کی قیمت کو اس اونچائی تک پہنچنے میں ابھی کم از کم پچیس سال لگ سکتے ہیں۔ نمبر تین... سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر پھلوں کے باغات سے ہونے والی آمدنی دوسری فصلوں سے زیادہ ہو تو میرے دماغ میں سب سے پہلے باغات لگانے کا خیال آنا چاہیے۔ نمبر چار... یہ حقیقت آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی زمیندار شخص اپنی زمین کو بڑھانے کے لیے تو سوچ سکتا ہے مگر زمین کو فروخت کرنے کا خیال بھولے سے بھی اس کے دماغ میں نہیں گھس سکتا اور وہ بھی کسی لاہوری بندے کے ہاتھ فروخت کرنے کا۔ یہ تو اپنے [illegible] کاشت کاری کے بجائے وہاں کوئی اور کاروبار شروع کر بیٹھتا...؟" اس نے سوالیہ جملے پر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! تین سال پہلے جب ابا جی زندہ تھے تو ہمارے پاس کل تین سو ایکڑ اعلیٰ درجے کی زرعی اراضی تھی۔ ابا جی کے اس دنیا سے اٹھتے ہی کسی بدخواہ کی ہمیں نظر لگ گئی۔ ابا جی کے چہلم کے بعد چھوٹے بھائی علی نواز نے ایک تنازع کھڑا کر دیا۔ وہ زمین و جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کرنے لگا۔ میں نے حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میری اطلاعات اور بڑی حد تک ان کی ماں کا بھی یہی ہے کہ چودھری علی نواز اپنی بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ اس کے اندر اتنا دم نہیں کہ وہ کسی کی بات کو مانے یا اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہے اور یہ بٹوارے والا قضیہ اسی کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ میں اس موضوع پر وقت برباد کرنے کے بجائے آپ کو نمبر وار پانچویں اور آخری اہم بات بتاتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر متوقف ہوا اور دو تین گہری سانسیں لینے کے بعد اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ہماری تین سو ایکڑ زرعی اراضی ہم دونوں بھائیوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو ایکڑ تقسیم ہوئی تو علی نواز اس ضد پر اتر آیا کہ حویلی کے بھی دو حصے ہوں گے۔ میں اس آبائی حویلی کی تقسیم کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے واضح الفاظ میں علی نواز سے کہہ دیا کہ یہ حویلی تو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ تم اس کے بدلے میں تھوڑی زمین لے لو۔ اس نے میری اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں اپنی ڈیڑھ سو ایکڑ اراضی میں سے پچاس ایکڑ اسے دے دوں تو وہ حویلی والے معاملے سے دستبردار ہو جائے گا۔ میں نے حویلی کو بچانے کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ یہ حویلی جس میں اس وقت آپ بیٹھے ہوئے ہیں، میں اس کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ اس کے علاوہ زرعی اراضی کے نام پر میرے پاس صرف ایک سو ایکڑ زمین بچی ہے۔ کیا آپ کی نظر میں، میں اتنا احمق ہوں کہ اپنی سو ایکڑ اراضی میں سے پچاس ایکڑ زمین کسی میاں نذیر کے ہاتھ فروخت کر دوں گا؟"

"مجھے اندازہ تو تھا مگر آپ سے ملاقات کے بعد یقین [illegible]" میں نے اس کے [illegible] بھرے استفسار کے جواب میں کہا۔

بولا۔ ''آپ جیسا چاہتے ہیں، وہ ہو جائے گا مگر میں آپ کے ساتھ کھانا کھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''میرے ساتھ کھانا کھانے کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کرلوں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''تو پھر آپ جا کر وہ کام نمٹالیں جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اس دوران میں، میں پروفیسر علوی سے ملاقات کرلیتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' ارشاد نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں، کیا ہوا؟''

''میں آپ کے ساتھ آیا تھا اور آپ مجھے اکیلے ہی واپس بھیج رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اس سے مجھے لگا کہ شاید آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ارشاد!'' میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ ''تمہیں جلدی واپس بھیجنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔ تمہارا ذہن اس وقت نقلی ارشاد میں الجھا ہوا ہے۔ تم اس بہروپیے کے بارے میں سوچ رہے ہو کہ وہ تمہیں کب اور کہاں نظر آیا تھا اور میں تمہیں اس نیک کام کو جلد از جلد کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہوں کیونکہ میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ تین کاموں کے دوران میں بھولی بسری چیزیں خود بخود یاد آنے لگتی ہیں۔ اول، عبادت..... دوم، رفع حاجت..... سوم، سفر۔ تم لاہور سے گوجرانوالہ تک کے سفر میں اس بہروپیے کے بارے میں سوچو گے تو وہ تمہیں یاد آجائے گا۔ تم کل کسی وقت تھانے آکر مجھے بتانا کہ اس تجربے کا کیا نتیجہ نکلا۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں تیلی فلات سے نیچے اتر گیا۔ علی محمد نے کار آگے بڑھادی۔

سدھیر نے دھوکے باز ارشاد کی شخصیت کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا، اس کی تفتیشی معاملات میں بہت زیادہ اہمیت تھی اور یہ اہمیت اس وقت میری نگاہ میں ہزاروں گنا بڑھ گئی تھی جب اصلی ارشاد نے اپنے محسوسات کا مجھ سے اظہار کیا تھا۔ اگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سدھیر کے بیان کردہ بندے کو اس نے کہیں دیکھ رکھا ہے تو یقیناً بار بار کوشش کرنے سے اس کی یادداشت میں کوئی منظر [illegible] ہاتھ لگ جاتا تو میں اس کی زبان کھلوانے کے بعد اس کو چٹکی بجاتے ہی حل کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اس زمانے میں ''بھاٹی گیٹ'' نامی علاقے میں عوام کی تفریح کے دو ہی مراکز ہوا کرتے تھے۔ نمبر ایک، پاکستان ٹاکیز..... نمبر دو، ملک تھیٹر۔ اس کے علاوہ تھوڑے فاصلے پر ''بازارِ حسن'' بھی واقع تھا مگر ادھر کا رخ تفریحی مزاج اور قماش کے افراد ہی کیا کرتے تھے۔ عام پبلک کا رجحان ''پاکستان ٹاکیز'' اور ''ملک تھیٹر'' ہی کی طرف تھا۔ ان کی نظر میں بازارِ حسن کے بارے میں سوچنا بھی گناہ بے لذت سے کم نہیں تھا۔

پروفیسر علوی کا آستانہ ملک تھیٹر کی بغل میں واقع تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر اپنے آستانے میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس وقت چونکہ عوامی لباس میں تھا اس لیے وہ مجھے بھی کوئی سائل ہی سمجھا۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو بتاؤ، تمہیں کون سی پریشانی یہاں کھینچ کر لے آئی ہے؟''

پروفیسر علوی کا وہ آستانہ روایتی آستانوں کے مانند فرشی نشست کا حامل نہیں تھا بلکہ اس نے اسے ایک آفس کی طرح میز کرسی وغیرہ سے سیٹ کر رکھا تھا۔ ایک کرسی پر وہ خود براجمان تھا اور دو کرسیاں سائلین کے لیے میز کی دوسری جانب رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر اس وقت میں پروفیسر کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ سے سوال کرنے کے بعد اس نے حساب کتاب کی غرض سے کاغذ قلم سنبھال لیا تھا۔

''میرا ایک دوست اچانک گم ہو گیا ہے۔'' میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''بس یہی پریشانی ہے میری۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے دوست کا اتا پتا بتا دیں۔''

''تمہارا دوست کب سے لاپتا ہے؟'' اس نے کاغذ پر قلم چلاتے ہوئے پوچھا۔

''آٹھ فروری کی صبح سے۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ..... تو اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنے دوست کو کہاں کہاں تلاش کیا ہے؟''

''ہر جگہ.....'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کرائی ہے؟''

[illegible] یہ پولیس والے کسی کام کے نہیں ہیں [illegible]

بتاتے ہوئے بولا۔ ''خیر، اب تم بالکل ٹھیک جگہ پر آگئے ہو۔ تمہارا وہ لاپتا دوست جہاں کہیں بھی ہوگا، میں اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''پھر تو آپ کو پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن کر لینا چاہیے پروفیسر صاحب! آپ کے علم کی بدولت ان کے بہت سارے پیچیدہ کیس چٹکی بجاتے میں حل ہو سکتے ہیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ ''اب یہی دیکھ لیں، جو کام وہ لوگ آٹھ دن میں نہیں کر سکے، وہ آپ آئندہ چوبیس گھنٹے میں کرنے والے ہیں پروفیسر۔''

اس نے شک بھری نظر سے مجھے گھورا اور روکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا تمہیں میری صلاحیتوں پر بھروسا نہیں ہے؟''

''اگر بھروسا نہ ہوتا تو میں آپ کے پاس چل کر نہ آتا۔'' میں نے اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لاہور شہر کے جانے پہچانے اور مانے ہوئے عامل کامل ہیں پروفیسر صاحب! ہر قسم کی کاٹ اور لوٹ پلٹ کے ماہر.....'' پھر میں نے سچ کے اندر جھوٹ کا تڑکا لگاتے ہوئے الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میرا ایک رشتے دار ادھر گڑھی شاہو میں رہتا ہے۔ اس کا نام قدیر ہے۔ وہ اپنے ہر کام کے لیے آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اسی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں ہے جو آپ نہ کر سکتے ہوں۔ میں بڑی امید لے کر آپ کے آستانے پر آیا ہوں پروفیسر صاحب!''

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میری وضاحت نے اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات جگا دیے تھے۔ ایک بار پھر وہ کاغذ قلم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تمہارے گمشدہ دوست کا نام مع والدہ.....؟''

''مع والدہ.....!'' میں نے مصنوعی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے دوست اور اس کی ماں کا نام کیا ہے۔ اس کا پتا لگانے کے لیے مجھے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔''

''میں آپ کو اپنے اس دوست کا نام تو بتا سکتا ہوں مگر اس کی ماں کا نام مجھے معلوم نہیں اور مجھے یقین ہے کہ [illegible]'' میرے اس [illegible] جملے نے پروفیسر علوی کو چونکا دیا۔ اس نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تمہیں ایسا یقین کیوں ہے۔ مجھے اس بندے کی ماں کا نام کیسے معلوم ہوگا؟''

''اس لیے کہ.....'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''میرا وہ دوست آپ کا گہرا عقیدت مند ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے کے لیے مشورہ کرنے آپ ہی کے پاس آیا کرتا تھا۔''

''کک..... کون.....؟'' وہ گڑبڑاتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''میاں نذیر کی۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''میاں مکینیکل ورکس، برانڈرتھ روڈ لاہور والے میاں صاحب!''

''اوہ..... تو تم میاں صاحب کے دوست ہو؟'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''میں ہر اس شخص کا دوست، مددگار اور خیرخواہ ہوں جو کسی بھی قسم کی مصیبت میں گھرا ہو۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا نام صفدر حیات ہے۔ میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک تھانے کا انچارج ہوں اور میاں نذیر کی گمشدگی والے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں مجھے گوجرانوالہ سے لاہور آنا پڑا ہے۔ امید ہے آپ میری آمد کا مقصد وضاحت کے ساتھ سمجھ گئے ہوں گے؟''

میری اصلیت کا پتا چلتے ہی وہ پٹری پر آگیا۔ اس نے میرے انکار کے باوجود بھی ضد کرکے لائٹ ریفریشمنٹ کا بندوبست کر دیا اور میاں نذیر کے حوالے سے مجھے بتانے لگا۔

''مجھے میاں صاحب کی گمشدگی کے بارے میں ان کی بیوی نرگس نے بتایا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے اور مجھے بہت مانتے تھے۔ میں بھی ان کے لیے سخت پریشان ہوں۔ پتا نہیں، ادھر گوجرانوالہ میں ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

میں نے سدھیر سے ہونے والی ملاقات اور پچاس ایکڑ زرعی اراضی کے جعلی کاغذات وغیرہ کے بارے میں پروفیسر کو بتانا ضروری نہ سمجھا اور قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ میاں صاحب نے آپ ہی کے مشورے پر گوجرانوالہ کے نواحی علاقے قلعہ دیدار سنگھ میں پھلوں کے باغات لگانے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی سلسلے میں وہاں کے چودھری حق نواز سے پچاس ایکڑ زمین بھی خریدی تھی؟''

''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟'' اس نے [illegible]

''[illegible] کون سی بات؟'' میں نے سادہ لہجے میں پوچھا۔

ہی گئے تھے۔ وہ دونوں بھی میاں صاحب کی گمشدگی پر بہت پریشان ہیں۔"

"آپ کو جب میاں صاحب کی جوا کھیلنے والی عادت کا علم تھا تو یہ بات آپ نے مجھ سے کیوں چھپائی؟" میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"خدا اس میں میرے کسی ارادے یا بدنیتی کا دخل نہیں ہے ملک صاحب!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "بس، مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ میاں صاحب کی اچانک گمشدگی نے مجھے ذاتی طور پر خاصا منتشر کر دیا تھا۔ پھر زیادہ دھیان ان کی بازیابی پر لگا ہوا تھا۔ بس یہ بات دماغ سے نکل گئی۔"

"خیر ہے... جب انسان کا ذہن ایک وقت میں کئی محاذوں پر نبرد آزما ہو تو ایسی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کو اس حوالے سے معذرت پیش کرنے یا کسی قسم کے ذہنی دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ نے میرے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر دیا ملک صاحب!" وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے تشکر آمیز انداز میں بولا۔ "آپ ایک عظیم انسان ہیں۔"

میں نے علی محمد کی بات کے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ جب کوئی آپ کو عظمت کے سنگھاسن پر چڑھانے کی کوشش کر رہا ہو تو عقل مندی اسی میں ہے کہ خاموش رہا جائے۔ سو میں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

☆☆☆

رات کو میں کافی دیر سے سویا تھا مگر صبح عادت کے مطابق وقت پر، روزمرہ پر میری آنکھ کھل گئی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں نے ناشتا کیا اور تیار ہو کر تھانے آ گیا۔ میرے جلدی آنے کی وجہ سے تھانے کا اسٹاف خاصا مستعد اور چاق و چوبند رہتا تھا۔ میں نے حوالدار مرید حسین کو ضروری ہدایات دیں اور کانسٹیبل سلطان علی کو اپنے ساتھ لے کر قصبہ دیدار سنگھ کی جانب روانہ ہو گیا۔

گزشتہ روز گمشدہ میاں نذیر کی بیوی نرگس سے بہت ہی مختصر ملاقات ہو پائی تھی۔ نرگس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے اسے پچاس ایکڑ زمین کے جعلی کاغذات دینے کے بعد الف سے یے تک تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا تو وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد گلوگیر آواز میں بولی تھی۔

"تھانیدار صاحب! کسی بھی طرح کوشش کر کے آپ میاں صاحب کو ڈھونڈ لائیں۔ اب تو آپ کو ہی [illegible]

اشارے بھی مل گئے۔ ایک وہ بہروپیا ارشاد بھی جو علی نواز کا بندہ بن کر میاں صاحب سے ملتا رہا ہے۔ [illegible] آپ کے علاقے کا کوئی ایسا زمیندار جو اپنے ڈیرے پر جوا کراتا ہو۔ پروفیسر طوسی نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ جوا کھیلنا میاں صاحب کا شوق ہے۔ ان کے ایک کام ہو جانے کے بعد میں ان کے پرانے جواری ساتھیوں احسان اللہ اور مقصود مغل سے بھی جا کر ملی تھی۔ وہ چاروں دونوں میاں صاحب کے لیے بہت پریشان تھے۔"

یہ ماننا پڑے گا کہ نرگس خاصی عقلمند عورت تھی۔ اس نے میاں نذیر کی بازیابی کے حوالے سے جن اہم اشاروں کا ذکر کیا تھا وہ ایک طرح سے میری سوچ کی تائید ہی تھے۔ ان لمحات میں میں بھی انہی نکات پر غور کر رہا ہوا تھا۔

میں بڑے بھرپور انداز میں نرگس کو تسلی دلاسا دے کر اس کی کوٹھی سے نکل آیا تھا۔ وہ عالیشان کوٹھی نہر کے کنارے پر واقع شادمان کالونی میں تھی۔ نرگس ایک تعلیم یافتہ اور رکھ رکھاؤ والی تیس سالہ خاتون تھی۔ وہ میاں نذیر کی دوسری بیوی تھی۔ میاں کی پہلی بیوی صفیہ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

میں چونکہ نرگس کی طرف سے جلدی فارغ ہو گیا تھا لہٰذا علی محمد کو مجھے گوجرانوالہ چھوڑنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ میں ادھر سے گوجرانوالہ آنے والی آخری بس میں سوار ہو کر تھانے آ گیا تھا۔

چودھری حق نواز نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھے تو اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"ملک صاحب! اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میں آپ ہی کی طرف آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بس میں ایک گھنٹے میں حویلی سے نکلنے ہی والا تھا۔"

"آپ کے چہرے کی چمک سے تو لگ رہا ہے کہ آپ مجھے کوئی خاص بات بتانے والے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

"آپ کو بالکل ٹھیک لگ رہا ہے جناب!" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "میں پہلے آپ کی خاطر تواضع کا بندوبست کر لوں پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔"

پھر میرے منع کرنے کے باوجود بھی وہ ایک ملازم کو ہدایات صادر کرنے لگا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد میرے سامنے میز پر انواع و اقسام کی ڈشیں سج چکی تھیں۔ میں نے

[illegible] تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے چودھری سے کہا۔

"آپ بتائیں، وہ کون سی خاص بات ہے؟"

"آپ نے میرے ملازم کو پہچاننے اور یاد کرنے کے کام پر لگایا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اس اللہ کے بندے نے بھوک، پیاس اور نیند کو تیاگ کر آخر کامیابی حاصل کر ہی لی ہے۔"

"آپ ارشاد کی بات کر رہے ہیں؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "کیا ارشاد کو یاد آ گیا ہے کہ وہ بندہ اسے کب اور کہاں دکھائی دیا تھا جو ارشاد بن کر گمشدہ میاں نذیر کو ملا کرتا تھا؟"

"جی بالکل! میں اسی بندے کی بات کر رہا ہوں۔" چودھری اثباتی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کا نام پرویز ہے اور لوگ اسے وچا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی رہائش چن دا قلعہ میں ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے... چن دا قلعہ؟"

[illegible] چن دا قلعہ لاہور سے گوجرانوالہ آتے ہوئے گوجرانوالہ کی حد کے آغاز پر واقع تھا۔ اس کے بعد [illegible] ایریا شروع ہو جاتا تھا۔ چن دا قلعہ تاحال وہ گاؤں ہی کی [illegible] چھپا ہوا تھا۔

"جی! میں اسی گاؤں کا ذکر کر رہا ہوں۔" چودھری نے [illegible] بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"چودھری صاحب! یہ پرویز عرف وچا لاہور جا کر کمال [illegible] کی دکان پر خود کو آپ کا ملازم ارشاد بتاتا رہا ہے۔" میں نے چودھری حق نواز کے چہرے پر نگاہ جما کر [illegible] انداز میں کہا۔ "گویا اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آپ کے خلاف ایک خطرناک سازش کی [illegible] آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"[illegible] تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔" چودھری نے [illegible] انداز میں کہا۔ "اس علاقے کا چودھری فرید احمد [illegible] فرید احمد سے ہماری قریبی رشتے داری ہے۔ فرید [illegible] میرے بھائی علی نواز کا سالا ہے۔ اس کی اکلوتی بہن [illegible] علی نواز کی شادی ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ [illegible] بچوں کو پسند نہیں کرتی لیکن فرید احمد کے [illegible] میرے اچھے تعلقات رہے ہیں۔ اس کے [illegible] معمولی سا انسان میرے خلاف [illegible] کیسے کر سکتا ہے؟"

[illegible] الفاظ کے مفصل جواب حاصل کرنے کی سائنس ہے میرے پاس۔ میں وچا کو آج ہی گرفتار کر کے اپنے تھانے کے لاک اپ میں پہنچاتا ہوں۔ اس کی زبان بہتے پانی کے مانند رواں ہو جائے گی۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ امید ہے کہ آپ میرے ہر سوال کا سیدھا اور کھرا جواب دیں گے۔"

"بے شک دوں گا۔" وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ "آپ پوچھیں...!"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کو جوا کھیلنے کا شوق ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔ "میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔"

"کیا آپ کے ڈیرے پر ایسا کوئی کام ہوتا ہے؟"

اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"اپنے بھائی علی نواز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں سمجھا نہیں ملک صاحب...؟"

"مطلب یہ کہ علی نواز کو جوا کھیلنے کی عادت ہو۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ اپنے ڈیرے پر جوا کراتا ہو۔"

"ملک صاحب! ابا جی کی زندگی میں ہم دونوں بھائی اسی حویلی میں ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "اس دوران میں میں نے کبھی علی نواز میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں دیکھا۔ تین سال پہلے ابا جی فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد علی نواز نے اپنی بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر بٹوارے کا مطالبہ کیا اور جب میرے سمجھانے کے باوجود بھی وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ ہم دونوں بھائی ایک جگہ نہیں رہ سکتے تو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا۔ اب ہم دونوں الگ ہیں۔ اگر ہمارے درمیان بہت اچھے تعلقات نہیں ہیں تو خدانخواستہ دشمنی والی بھی کوئی بات نہیں۔ میری معلومات کے مطابق علی نواز خود جوا کھیلتا ہے اور نہ ہی اس کے ڈیرے پر ایسی کوئی سرگرمی ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔

"ملک صاحب! میں جاننا چاہوں گا کہ اس کیس میں "جوا" کہاں سے آن ٹپکا۔ کیا اس کا میاں نذیر کی گمشدگی سے کوئی تعلق [illegible]

"بہت گہرا تعلق اور نہایت ہی اہم واسطہ ہے چودھری صاحب!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میاں نذیر نے جس "قلعہ دیدار سنگھ" میں پچاس ایکڑ "زمین" باغات کے لیے "خریدی" تھی، وہاں کے چودھری "حق نواز" اپنے ڈیرے پر جوا کراتے ہیں جہاں میاں نذیر نے اچھی خاصی رقم "جیتی" تھی۔"

میں نے اپنے جواب میں کئی ایک الفاظ پر زور دیا تھا۔ میرے خاموش ہونے پر وہ سنسنی خیز انداز میں بولا۔

"ساری بات سمجھ میں آ گئی ملک صاحب! میری ساکھ کو بٹا لگانے اور مجھے پچاس ایکڑ اراضی کی جعلی فروخت میں ملوث کرنے کے لیے کسی چالباز شخص نے یہ سازش رچایا ہے۔"

"جب یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہے تو پھر اندازہ لگائیں، آپ سے اس قسم کی دشمنی کون کر سکتا ہے؟" میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یقیناً پرویز عرف وچا کے پیچھے کوئی بہت ہی شاطر اور طاقتور شخص چھپا ہوا ہے۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میرا دھیان کسی کی طرف نہیں جا رہا۔"

"آپ اپنے دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں چودھری صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ کے دشمن کو تلاش کرنا میرا کام ہے۔ آپ بس مجھے اتنا بتا دیں کہ آس پاس کے گاؤں میں کون ایسا طاقتور انسان ہے جو زمیندار بھی ہو اور اسے جوئے وغیرہ کا نہ صرف شوق ہو بلکہ وہ اپنے ڈیرے پر اس کا اہتمام بھی کرتا ہو؟"

"چودھری فرید احمد کے بڑے بیٹے چودھری احسان کو جوئے کی لت ہے۔" اس نے بتایا۔ "احسان کی عمر تیس کے قریب ہے اور وہ اپنے ہم قماش لوگوں کے ساتھ ڈیرے پر ایسی تفریحات کرتا رہتا ہے۔"

"ہم قلعہ دیدار سنگھ کی جگہ چمن دا قلعہ اور چودھری حق نواز کی جگہ چودھری احسان احمد کو رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس حساب سے وچا، ارشاد بن کر میاں نذیر سے ملتا رہا اور پھر میاں نذیر کو چودھری حق نواز کی حیثیت میں چودھری احسان احمد سے ملوا دیا۔ چودھری احسان نے چودھری حق نواز بن کر [illegible]

نذیر کے ہاتھ فروخت کر دی۔ اگر یہاں تک میرا اندازہ درست ثابت ہو جاتا ہے تو پھر میاں نذیر کا کیس حل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" کلام مکمل کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں ملک صاحب؟" چودھری نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"وچا کو گرفتار کرنے۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "اور اس مقصد کے لیے مجھے آپ کے ملازم کی ضرورت پیش آئے گی کیونکہ وہ وچا کو پہچانتا ہے۔"

"میں اور میرے تمام ملازمین آپ سے ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میاں نذیر کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہو اور میں بھی جان سکوں کہ میرا دشمن کون ہے اور... کیوں ہے؟"

"ایسا ہی ہوگا چودھری صاحب!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

وہ احترام بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور حویلی سے نکل کر تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وچا کی گرفتاری کے لیے میں نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کام کے لیے ہم نے ارشاد کے ایک دوست کا استعمال کیا۔ خالد نامی شخص کسی بہانے وچا کو گاؤں سے باہر جی ٹی روڈ تک لے آیا تھا جہاں درختوں کے ایک جھنڈ میں، میں اس کے "استقبال" کے لیے موجود تھا۔ آج کل بھی جی ٹی روڈ کے دونوں جانب آپ کو قد آور درختوں کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی قطاریں دیکھنے کو ملیں گی لیکن اس زمانے میں وہ درختوں کی بہتات کسی جنگل کا سماں پیش کرتی تھی اس لیے چھپنا بہت آسان ہوا کرتا تھا۔

جب پولیس اپنے مطلوبہ مجرم پر پکا ہاتھ ڈال دے تو پھر اس کی زبان کھلوانے میں کسی دقت یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ میں نے وچا کو لگ بھگ مغرب کے وقت حوالدار مرید حسین کے سپرد کیا تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد حوالدار نے آ کر مجھے بتایا کہ اس نے تیپ ریکارڈ کی مرمت کر دی ہے۔ میں جب چاہوں اسے بجا سکتا ہوں۔ [illegible]

نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "بہت جلدی تم نے ٹیپ ریکارڈر کی خرابی پکڑ لیا ہے۔ لے آؤ اسے میرے پاس۔ میں بھی تو دیکھوں کہ اس میں سے کس دریچے کا سر نکلتا ہے۔"

حوالدار "اچھا جی" کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

مجھے میں مرید حسین نے وچا کی ایسی حالت بنا دی تھی جیسے وہ کئی روز سے پولیس کی تحویل میں زیر تفتیش رہا ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو وچا! حوالدار ضد کر رہا ہے کہ میں آج کی پوری رات تمہیں اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ صبح تک وہ تمہارے اندر سے ایک ایک بات کھود کر نکال لے گا۔"

"اگر میں صبح تک زندہ رہوں گا، تب نا۔" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فریادی لہجے میں بولا۔ "آپ کا حوالدار تو قصاب سے کم خطرناک اور بے رحم نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اس اللہ کے بندے نے تو میری کھال اتارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔"

"ہاں، وہ ایسا ہی جلاد ہے۔ اس کے قبضے میں آیا ہوا بندہ خود ہی موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔" میں نے اس کے ڈر میں اضافہ کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں نے تم پر کوئی مہربانی نہیں کی۔ اس کے بدلے میں مجھے تمہارا اچھا ساتھ اور تعاون چاہیے۔"

وچا کو میرے کمرے میں پہنچانے کے بعد مرید حسین باہر چلا گیا تھا اس لیے وچا نے حوالدار کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت بھی کی تھی۔ وہ میری بات کے جواب میں لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

"تھانیدار صاحب! میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ بس، آپ نے مجھے حوالدار کے پاس نہیں بھیجنا۔ آپ جو بھی پوچھیں گے، میں سولہ آنے سچ ہی بتاؤں گا۔"

"دیکھتا ہوں تم اپنے اس وعدے میں کتنے آنے پورے اترتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "تم چودھری حق نواز کے ملازم ارشاد کی حیثیت سے لاہور والے میاں نذیر کو بے وقوف بنانے کے بعد... مجھے بتاؤ، تمہاری چودھری حق نواز یا ... کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟" [illegible]

[illegible] نفی میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ "میں تو بس حکم کا غلام ہوں تھانیدار صاحب!"

"تم کس کے حکم کے غلام ہو؟"

"چھوٹے چودھری صاحب کے جناب!" اس نے بتایا۔

"چھوٹے چودھری۔۔۔ مطلب چودھری حق نواز؟"

میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں سرکار۔۔۔ میں چودھری احسان صاحب کی بات کر رہا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔۔۔ تم چودھری فرید احمد کے بڑے بیٹے احسان احمد کا ذکر کر رہے ہو؟" میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "چودھری احسان کو میاں نذیر یا چودھری حق نواز سے کیا تکلیف تھی؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب!" وہ بے بسی سے بولا۔ "مجھ سے چودھری احسان نے جو کہا، وہ میں نے کر دیا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔"

"تم یہ تو تسلیم کرتے ہو نا کہ ارشاد کا نام استعمال کر کے تم نے میاں نذیر سے دوستی کی پھر اسے بہلا پھسلا کر چمن دا قلعے لے آئے اور چودھری احسان سے ملوا کر میاں کی چودھری سے دوستی کروا دی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے میاں نذیر کو بتایا کہ یہ علاقہ قلعہ دیدار سنگھ ہے اور چودھری احسان کو تم نے چودھری حق نواز کی حیثیت میں میاں نذیر سے متعارف کرایا تھا؟"

"جی، میں مانتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا اور یہ سب میں نے چھوٹے چودھری صاحب کے کہنے پر کیا ہے۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ چودھری احسان نے چودھری حق نواز بن کر میاں نذیر سے پچاس ہزار روپے اینٹھا کر پچاس ایکڑ زمین کے جعلی کاغذات اسے تھما دیے تھے؟" میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ "اور آٹھ فروری کو جو میاں نذیر یہاں آیا تھا تو اس کے بعد پلٹ کر لاہور واپس نہیں گیا؟"

"زمین کی خرید و فروخت اور جعلی کاغذات والے معاملے کی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "باقی میں نے آٹھ فروری والے دن میاں نذیر کو اس علاقے میں دیکھا تھا۔ وہ چودھری احسان کے ڈیرے کی طرف گیا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا تو چودھری احسان [illegible] پھر بتا تھا کہ ... اپس لاہور چلا گیا ہوگا مگر آپ بتا رہے ہیں

ہیں کہ وہ آٹھ نو دن سے لاپتا ہے۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے۔“

”اگر تم چودھری احسان یا اس کے باپ چودھری فرید کی چودھری حق نواز سے دشمنی کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے ابھی بتادو۔“ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں اس جھمیلے سے نکال لوں گا لیکن اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم نے کوئی اہم بات مجھ سے چھپائی ہے تو سمجھ لو، میں تمہیں پھانسی کی سزا یا پھر عمر قید کروا کر ہی دم لوں گا۔“

وہ میرے قدموں میں گر کر گڑگڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب! آپ چاہیں تو میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”تم نے مجھے سب کچھ سچ بتایا ہے اس لیے قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا اور پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ، کیا بڑا چودھری فرید احمد اس بات سے واقف ہے کہ تم نے چودھری احسان کے کہنے پر میاں نذیر سے فریب اور مکاری کا کھیل کھیلا ہے؟“

”میرا خیال ہے بڑے چودھری صاحب اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”باپ بیٹے میں زیادہ بنتی نہیں ہے۔ چودھری احسان اپنی پھوپی نادرہ کے بہت قریب ہے۔ نادرہ کی کوئی بات وہ ٹالتا نہیں۔“

وجاہے کے اس طویل انٹرویو میں بالآخر مجھے کام کی ایک بات مل ہی گئی تھی۔ نادرہ کا نام سامنے آتے ہی سب کچھ روزِ روشن کے مانند مجھ پر عیاں ہوگیا تھا۔ نادرہ، چودھری حق نواز اور اس کے بیوی بچوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔ ممکنات میں تھا کہ اس نے اپنے بھتیجے چودھری احسان کے ساتھ مل کر چودھری حق نواز کے خلاف یہ گھناؤنی سازش تیار کی ہو تاکہ وہ قانون کی گرفت میں آجائے اور باقی کی زمین وجائداد بھی متنازع ہوکر رہ جائے۔

میں نے پرویز عرف وجاہے کو سلطانی گواہ بنا کر اس کا بیان حلفی قلم بند کرلیا پھر اس بیان کی روشنی میں پہلے چودھری احسان احمد اور اس کے بعد اس کی پھوپی نادرہ کو گرفتار کرلیا۔

ان دونوں افراد کی گرفتاری کوئی آسان کام نہیں تھا مگر میں بھی ٹھہرا ایک مشکل پسند...... میں نے چودھری فرید احمد اور چودھری حق نواز کی دھمکیوں کو اپنے جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے ان دونوں کو [illegible]

بعد ان کی زبانوں سے سچ اگلوایا۔ حیرت کی بات تھی کہ چودھری فرید اپنے بیٹے اور چودھری علی نواز [illegible] اس خفیہ جوائنٹ وینچر سے قطعی ناواقف تھے۔

میری کامیابی پر دو افراد سب سے زیادہ خوش ہوئے تھے نمبر ایک...... چودھری حق نواز، کیونکہ میں نے اس کو بے نقاب کرکے اسے ذلیل و رسوا ہونے سے بچالیا تھا اور دو...... میاں نذیر...... جی ہاں، میاں نذیر کو چودھری احسان نے چارے والے گودام میں قید کررکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق چودھری حق نواز کی گرفتاری کے بعد میاں نذیر کو قتل کرکے قلعہ دیدار سنگھ کے علاقے میں پھینکا جانا تھا۔ بہرحال ”جسے خدا رکھے، اسے کون چکھے“ کے مصداق میاں نذیر کی زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے اس لیے میں نے اسے زندہ بازیاب کرلیا تھا۔

ہاں...... ایک تیسرا انسان بھی میری کامیابی پر بہت خوش اور میرا شکرگزار تھا اور وہ تھی میاں نذیر کی بیوی نرگس۔ میں میاں نذیر کو اپنے ساتھ لاہور لے کر گیا تھا کیونکہ ابھی کچھ قانونی کارروائی باقی تھی۔ اس موقع پر میاں نذیر [illegible] کرکے مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔

”میاں صاحب خود کو بہت عقل مند انسان لگتے ہیں۔“ باہمی گفتگو کے دوران میں نرگس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن آج سے میں نے ان کا ایک نیا نام رکھ دیا ہے۔“

ہم دونوں نے چونک کر نرگس کی طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا مگر میاں نذیر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”وہ کیا...؟“

”عقل بند...!“ وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

”عقل بند...!“ میں نے چٹخارہ لیتے ہوئے دہرایا۔ ”بھئی بہت اعلیٰ!“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میاں نذیر جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ”بھلا یہ کس قسم کا نام ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میاں صاحب! اس قسم کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ نے پچھلے ایک سال میں پے در پے جو ان گنت حماقتیں فرمائی ہیں، اس کی روشنی میں بڑھاپے کی جوان اور خوب صورت ساتھی کا دیا ہوا یہ نام آپ پر بہت جچ رہا ہے۔“

میاں نذیر نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے بزبانِ خاموشی کہہ رہا ہو..... بروٹس! یو ٹو...؟

میں نے بھی اپنی گردن کو معنی خیز جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

[illegible]

انسان چاہے کتنی ناانصافی کرجائے... زیادتیوں کا شمار بھی نہ کرپائے مگر... قدرت کے پاس ایک ایک تنکے کا حساب درج ہوتا ہے۔ یہی فارمولا کچھ یہاں بھی فٹ ہوگیا جب قدرت نے اسے ایک بڑے نقصان سے بچایا تو احساس جاگا شاید کسی نیکی کا بدلہ ملا ہے کیونکہ کبھی اس نے کسی کو ناانصافی اور ظلم سے نجات دلائی تھی۔

زیادتیوں کی تلافی کرنے والے چند لوگوں کا

عبرت اثر قصہ

تلافی

عائشہ نصیر

اپنے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے میں دائیں طرف کی لین میں آسانی سے آگئی۔ چند لمحوں بعد ایک پولیس کی گاڑی اپنی لائٹس چمکاتی، سائرن بجاتی میرے پیچھے تھی۔ پہلے تو مجھے لگا کہ وہ صرف گزرنا چاہتی ہے مگر جلد ہی میری یہ خوش فہمی دور ہوگئی۔

وہ پولیس آفیسر اپنی اسموکی بیئر کیمپین ہیٹ ایڈجسٹ کرتے ہوئے میری ڈرائیونگ سائیڈ کی کھڑکی پر جھکا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”لائسنس اور رجسٹریشن پلیز!“

اور میرے خیال میں ایک پولیس اہلکار خراب موڈ میں ہے۔ میں اتنی خوش قسمت کیسے ہوسکتی ہوں؟ بہرحال، میں نے اپنی جھنجلاہٹ اپنے اندر ہی چھپاتے ہوئے شائستگی سے پوچھا۔ ”گڈ مارننگ آفیسر! کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آپ کا لائسنس اور رجسٹریشن چاہیے اور آپ احمقانہ سوال کررہی ہیں۔“

”لیکن آپ نے مجھے روکا کیوں؟ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”جب قانون کا کوئی افسر آپ جیسے کسی کو ہدایت دیتا ہے تو اس کی تعمیل کرنا آپ پر فرض ہے۔ مجھے اپنا لائسنس اور رجسٹریشن دیں اور کوئی مشتبہ حرکت نہ کریں۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

اگر یہ صورتِ حال جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہے تو مجھے اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے...... ورنہ میری حالت بھی فیریون کے ان دو نوجوان سیاہ فاموں سے زیادہ مختلف نہیں ہوگی جنہیں دو رات پہلے پولیس نے گولی ماردی تھی۔

چیک کروں گی۔ اس کے علاوہ ہم ابھی کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ کس اپارٹمنٹ نے نائن ون ون کال کا جواب دیا تھا؟"

"یہ کاؤنٹی شیرف کا اپارٹمنٹ تھا۔ فیئر ووڈ لوگوں کے پاس اپنی پولیس فورس نہیں ہے۔"

"کل میرا ان کے ایک نائب کے ساتھ ٹاکرا ہوا۔" مجھے یہ بات یاد کر کے پھر سے غصہ آیا تھا۔ "وہ کافی غیر مہذب تھا اور مجھے بغیر سگنل دیے لین بدلنے کے لیے ایک بالکل غیر ضروری ٹکٹ ملا۔ کیا آپ شیرف کو جانتے ہیں؟ وہ کیسا ہے؟"

"میں اس سے ملا ہوں۔ اس کا نام اولاف پیٹرسن ہے اور وہ سیاہ فاموں کے لیے غیر ہمدرد ہونے کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ اگر اس کے آدمیوں نے یہ کیا ہے جو کہ لگ رہا ہے کہ انہوں نے کیا ہے، تو وہ اور اس کا اپارٹمنٹ دونوں کورٹ میں ہوں گے مگر جب تک پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آ جاتی، تب تک یہ صرف قیاس آرائیاں ہیں۔ آپ بتائیں مس رائٹر! کیا آپ مقامی ہیں؟"

"میری والدہ ڈیکسس بورو میں پیدا ہوئی تھیں اور میں بچپن میں یہاں آتی تھی۔ جب میں نے ڈارٹ ماؤتھ سے گریجویشن کیا تو میں واپس چلی آئی۔ مجھے یہاں رہنا پسند ہے۔"

"کیا آپ کے پاس صحافت کی ڈگری ہے؟" اس نے سوال کیا۔

میں بتاتے ہوئے تھوڑا جھجکی۔ "نہیں، یہ اصل میں کری ایٹو رائٹنگ ہے۔ یہ کام صرف تب تک ہے جب تک میں گریٹ امریکی ناول نہ لکھ لوں۔"

"آپ کا مطلب گریٹ بلیک امریکی ناول؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"سچ کہوں تو کالج میں بھی اس بلیک اینڈ وائٹ کے تنازع سے دور ہی رہتی تھی۔ میرا زیادہ رجحان ویمن رائٹس کی جانب تھا اور میں اسی کے لیے کام کرنا چاہتی تھی مگر ...... کل کے واقعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"تو آپ نے ابھی تک ناول لکھنا شروع نہیں کیا؟" وہ کافی دلچسپی لے رہا تھا۔

"نہیں ...... لیکن اب کم از کم میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک آغاز ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اگر ہم یہ کیس کورٹ میں لے کر جاتے ہیں اور جیتتے … آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے … میں سمجھ گئی۔

میں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"ہاں ...... مجھے لگتا ہے کہ آپ اس کیس میں میرے لیے کافی مددگار ثابت ہوں گے۔"

☆☆☆

اگلی صبح میں مریم ہیرس کے پاپا سے … کرنے کے لیے فیئر ووڈ واپس آئی۔ میں ان کے گھر کے دروازے سے کچھ دور کھڑی سوچ رہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کروں اور جب میں نے فٹ پاتھ پر قدم رکھا ہی تھا کہ مریم کے والد کے گیراج کا دروازہ کھلا اور ایک آرمی جیپ نکل کر باہر آئی۔ وہ دائیں طرف سے ہوتی ہوئی سڑک کے آخر میں بزنس ڈسٹرکٹ کی طرف مڑ گئی۔

جو کچھ میں نے دیکھا وہ حیران کن تھا۔ ڈرائیور ایک بوڑھا اور شریف آدمی لگ رہا تھا لیکن مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ جھریوں زدہ چہرہ لیکن جسم مضبوط۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ سیاہ بغیر آستین والی شرٹ میں اسٹیئرنگ وہیل کو پکڑنے والے اس کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ یہ کوئی کمزور بوڑھا آدمی نہیں تھا جسے کسی کی مدد یا دیکھ بھال کی ضرورت ہو۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں پاپائے وائکنگ کا ریٹائرڈ ورژن دیکھ رہی ہوں۔

اب فوری طور پر میں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے لگا دی۔ جیپ تین بلاکوں سے آگے جا کر رکی اور ایک کافی شاپ کی پارکنگ میں جا کر رک گئی۔

میں نے بھی اپنی گاڑی روک کر چند لمحے انتظار کیا۔ جب وہ اپنی گاڑی سے نکل کر کافی شاپ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے دیکھا، اس کا قد لمبا تھا لیکن وہ سیدھا اور چست تھا۔ کمزوری کی کوئی علامت اس کے جسم اور چال میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں پارکنگ میں کافی دیر تک انتظار کرتی رہی کہ شاید وہ صرف کافی خریدنے آیا ہو مگر جب وہ باہر نہیں آیا تو میں بھی اپنی کار لاک کر کے اس کافی شاپ میں چلی آئی۔ پاپائے ...... ڈرائیور کاؤنٹر پر بیٹھی ایک چنچل قسم کی بلونڈ ویٹریس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ وہ اسے پیاری اور ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے … پر جا کر بیٹھ گئی۔

"… دیکھ کر اچھا لگا کہ تم یہاں بیٹھ گئیں۔ یعنی مجھے … آج کی … سنہری بالوں والی نے جس … لڑکی لگ رہا تھا، میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ، سوری ...... کیا تم چاہتی ہو کہ میں دوسرے … بیٹھوں؟" میں نے کہا۔

"ارے نہیں، زحمت نہ کرو ...... لیکن چارلی کے زیادہ قریب مت بیٹھنا ...... وہ میرا ہے۔" اس کے انداز میں شرارت تھی۔

میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا جہاں پاپائے … بیٹھا تھا۔

"اس کی بات مت سنو، ہنی! میں تم دونوں کے لیے کافی ہوں۔" وہ اپنے برطانوی لہجے میں بولا تھا۔

میں نے ہنس کر اسے دوستانہ تاثر دیا اور اٹھ کر اس کے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"میرا نام سیلیا ہے۔ تم سے مل کر اچھا لگا۔ کیا میں تمہیں چارلی کہوں؟"

"سب کہتے ہیں ڈیئر! کیا میں تمہیں ناشتا آفر کر سکتا ہوں؟" چارلی ایک خوش مزاج انسان تھا۔ میں خود بھی اس سے بات کرتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"نہ ...... نہیں ...... میرے خیال میں ہمیں لڑکی کو ناشتا نہیں کرنا چاہیے۔"

لڑکی نے میرا آرڈر لیتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔

"کیا تم صرف یہی کھاؤ گی ...... بس، ایک انگلش مفن؟" چارلی نے میرا آرڈر سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

"تم نے تو سنا ہی ہوگا، لڑکیاں اپنی جسامت کے … کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی ہیں بلکہ میں تو … پر حیران ہوں۔ یہ سب جاتا کہاں ہے … بھی ایک اونس اضافی چربی نہیں ہے۔" میں … یہ دکھاوا نہیں تھا۔

"جب میں یہاں سے نکلوں گا تو دو گھنٹے کے لیے جم جاؤں گا۔" اس نے بتانا شروع کیا۔ "اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد گھر جانے سے پہلے میں جھیل کے گرد جاگنگ کروں گا۔ پہلے میں دوڑتا تھا لیکن چند سال پہلے … چوٹ لگ گئی۔"

"کیا تم جوانی کو برقرار رکھنا چاہتی ہو؟ مگر قریب میں کبھی کوئی … ہے۔ یہ یہاں سے تقریباً دو میل …

".... ہاں، وہ یہ ہے۔" اس نے اپنا ناشتا ختم کر دیا تھا۔

"وہ ......" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "یہ میرے لیے بہت دور ہے۔ میں ڈیکسس میں رہتی ہوں۔"

"یہ بات ہے تو کیوں نہ تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں وہاں کی مشینیں دکھاؤں گا اور انہیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی ......"

"ارے واہ ...... اب یہ ایک ایسی آفر ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتی۔" میں خوشی سے چہکی۔

"کل کا دن کیسا رہے گا؟ ہم یہیں مل کر پہلے ناشتا کریں گے، اس کے بعد نکلیں گے۔" اس نے تائید کے لیے میری سمت دیکھا۔

"پرفیکٹ ہے۔" میں دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرتے ہوئے مسکرائی۔ میں یہی تو چاہتی تھی۔

"تم یقین کرو گی ...... وہ چوراسی سال کا ہے۔" اداکاری کرتے ہوئے لڑکی کی اس بات پر میں حیرانی سے بس سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

میرا اگلا اسٹاپ ایمرجنسی روم تھا جہاں سے اس بات کی تصدیق ہوئی کہ پچیس اکتوبر کی شام کو کسی بھی زخمی پولیس اہلکار کا علاج نہیں کیا گیا تھا۔

واپس آفس آنے کے بعد میں نے کورونر کے دفتر کو یہ دیکھنے کے لیے فون کیا کہ آیا ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ جاری کر دی گئی ہے۔ ان کی جانب سے تصدیق کرنے کے بعد میں ڈیکسس ایونیو پر واقع کاؤنٹی شیرف کے محکمہ ہیڈ کوارٹر میں چلی آئی۔

میں نے اپنا کارڈ ریسپشنسٹ کو دیتے ہوئے شیرف پیٹرسن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ شیرف کے پاس میرے لیے صرف دس منٹ ہیں۔

شیرف ایک درمیانی عمر کا لمبے قد والا نارویجین تھا اور جب میں اس کے آفس میں داخل ہوئی تو وہ پہلے ہی اپنی سیٹ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے کہیں بھی نرم خیر مقدمی تاثر نہیں ملا پھر مجھے خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ شیرف پیٹرسن ہے، چارلی نہیں۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" ایک نشست کی طرف … میں پوچھا۔

پہلے میں نے وضاحت کی کہ میں کون ہوں اور کس چیز پر کام کر رہی ہوں۔ اس کے بعد سوال کیا کہ کیا اس نے لیروے البرٹس اور مائیکل ایلس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے؟

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے ابھی اسے پڑھا ہے۔ اس میں ایسا کچھ بھی نہیں جو غیر متوقع ہو۔ وہ گولی لگنے سے مرے ہیں۔“

”وہ تو ظاہر ہے۔“ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔ ”لیکن کیا انہیں گولی مارنا ضروری تھا؟ کیا آپ انہیں صرف گرفتار کر کے اپنی تحویل میں نہیں لے سکتے تھے؟“

”مجھے آپ جیسے لوگوں کو اپنے محکمے کی کارروائیوں کی وضاحت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا انداز سخت تھا۔ ”وہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں اگر وہ پولیس کے روکنے پر بھی نہیں رکتے تو میرے آدمیوں کو تربیت دی جاتی ہے کہ ایسی صورت حال سے انہیں کیسے نمٹنا ہے۔“

”لیکن ان کے دوسرے زخموں کا کیا ہوگا۔ ان کی سوجی آنکھیں، ایک کی ٹوٹی ہوئی ناک اور دوسرے کا ٹوٹا ہوا جبڑا؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ مجھے گھورنے لگا۔ ”میرے تمام افسران قسم کھاتے ہیں کہ ان کو کسی نے انگلی بھی نہیں لگائی اور یہ کہ ان کو جو بھی چوٹیں پہنچی ہیں، وہ پہلے سے موجود تھیں۔ میرے پاس ان کی بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور میں کسی بھی عدالت میں ان کی حمایت کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے سنا ہے کہ البرٹس کا خاندان مقدمے کی تیاری کر رہا ہے۔“ میں نے بات بدلی۔

اس کے چہرے کے تاثرات مزید سخت ہو گئے۔ ”میرے پاس اس موضوع پر کہنے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے مس رابنز...! آپ کا دن بخیر ہو۔“

☆☆☆

اگلے دن میں لیک کاؤنٹی ہاؤس جلدی پہنچ گئی۔ میرے پاس لڑکی کے لیے کچھ سوالات تھے۔

”ہیلو ہنی!“ اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ اچھالی۔ ”چارلی لیٹ ہے۔“

”جانتی ہوں۔ میں اصل میں تم سے کچھ باتیں جاننا چاہ رہی تھی۔ کیا تم اس کی بیٹی مریم کو جانتی ہو؟“

”اوہ... ہاں۔ وہ اس کے ساتھ وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہے۔ کیوں، تم اسے کیسے جانتی ہو؟“ وہ الجھے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

مجھے اسے تفصیل بتانا پڑی کہ میں ملاقات کر چکی ہوں۔ ”وہ اس کی اتنی حفاظت کیوں کرتی ہے؟ چارلی تو ایسے آدمی کی طرح لگتا ہے جو اپنی دیکھ بھال بہتر طرح سے کر سکتا ہے۔“

”چارلی اصل میں ڈسلیکسیا کا شکار ہے۔ اس کے علاوہ وہ تقریباً دس سال تک ایک پرو باکسر رہا تھا اور سر میں پڑنے والے ایک گھونسے کی وجہ سے اسے پڑھنے لکھنے اور اپنے بل ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور سننے میں بھی۔ جب اس کی بیوی زندہ تھی تو یہ سب وہ سنبھالتی تھی لیکن وہ پچھلے سال انتقال کر گئی اور مریم اس کے قریب رہنے کے لیے واپس اس علاقے میں چلی آئی۔ ویسے چارلی اپنے مسائل کو خود پر سوار کرنے والا شخص نہیں ہے۔“

”ہیلو، لڑکیو! کہیں تم دونوں میرے لیے تو نہیں رہیں نا؟“ چارلی آ گیا تھا۔ میرے گال پر بوسہ دیتے ہوئے وہ میرے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

”نہیں، چارلی! ہم نے تمہیں ٹیچر کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ہم بھی بات کر رہے تھے۔“ میں نے پیار سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

اگلے دو گھنٹے میں نے چارلی کو مشینوں پر انگیج کرتے ہوئے دیکھتے اور اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے میں گزارے۔ اس نے ایک مشکل زندگی گزاری تھی۔ لندن بلٹز اور ایسٹ اینڈ اسٹریٹ گینگ سے بچنے کے بعد اس نے ایک پولیس اہلکار کو زخمی کرنے کے جرم میں چھ ماہ جیل کاٹی پھر باکسنگ کا آغاز کیا اور اس کا دس سالہ کیریئر کافی کامیاب رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ امریکا آیا اور گرمیوں کی تپتی دھوپ اور برفانی سردی دونوں میں چھتوں پر کھپریلیں ٹھونکیں۔ وہ ایک سخت جان گرم دوستانہ مزاج کا بوڑھا تھا۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیٹی کے گھر کے باہر کیا ہوا ہوگا۔ حالانکہ میں نے چارلی سے تب تک کچھ بھی نہیں پوچھا تھا جب تک کہ میں نے مسلسل تین ہفتوں تک اس کے ساتھ اپنی دوستی مزید گہری نہیں کر لی تھی۔

اس وقت تک یہ اسٹوری قومی خبر بن چکی تھی۔ خاص طور پر جب ڈینکس کاؤنٹی ڈسٹرکٹ اٹارنی نے کیس کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ فائرنگ کے ذمے دار دو ڈپٹیز کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔

ڈینکس بورڈ میں ہونے والے اس واقعے کی وجہ [illegible]

اسی دوران لڑکی سے مجھے چارلی کی برتھ ڈے کا پتا چلا۔ یہ اس کی سلیبریٹ کرنے کے لیے میں اسے ڈائننگ کے لیے لے گئی۔ وہ اپنے اپروچ کے بارے آگاہ تھی اور جب ہم اپنی تیسری بیئر کو پہنچے تو میں نے اس سے سوال کیا۔

”تو... چارلی..... اس رات مریم کے گھر میں کیا ہوا تھا؟“

☆☆☆

ڈینکس کاؤنٹی شیرف ڈیپارٹمنٹ کے خلاف البرٹس خاندان کے مقدمے کے پہلے دن عدالت میں موجود تھی اور اپنے آپ کو سانس روکے ہوئے پا رہی تھی جب البرٹس کے وکیل، رینالڈ آرمسٹرانگ جیوری کے سامنے اپنے ابتدائی ریمارکس سے خطاب کرنے کے لیے اٹھے۔

”میں آج یہاں البرٹس کے خاندان کی جانب سے ہوں جو لیروے البرٹس کے لیے انصاف کی تلاش میں ہیں جو ایک ہائی اسکول کا فٹ بال اسٹار تھا۔ ایک ایسا نوجوان جس کی زندگی کو نہایت ظالمانہ طریقے سے مختصر کر دیا گیا۔“ اس نے رک کر توقف کیا اور جیوری کے ارکان کے چہروں کی طرف دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمدردی کے جذبات تلاش کر رہا تھا۔

”اس مقدمے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ البرٹس خاندان لیروے کو بالکل بے گناہ مانتا ہے لیکن وہ جوان اور توانائی سے بھرپور تھا اور انہیں یقین ہے کہ موقع ملنے پر اس نے اپنی زندگی کا رخ موڑ دیا ہوتا۔ حکام کی جلد بازی اور بغیر سوچے سمجھے اقدامات نے اس سے یہ موقع چھین لیا۔ شیرف کا ڈپارٹمنٹ بضد ہے کہ لیروے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وہ اس کے جسم پر موجود زخموں کی توجیہہ دینے سے قاصر ہیں جو مار پیٹ کے دوران آئے اور جن کی وجہ سے لیروے کے لیے فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا۔“ آرمسٹرانگ نے ایک بار پھر توقف کیا اور پھر اپنے ریمارکس کو یہ کہہ کر ختم کیا کہ اسے جیوری کی غم زدہ البرٹس خاندان کے نقصان کی تلافی اور ایک منصفانہ فیصلے پر پہنچنے کی صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔

جب ابتدائی ریمارکس مکمل ہوئے تو جج رینالڈس نے مسٹر آرمسٹرانگ سے اپنے پہلے گواہ کو بلانے کو کہا۔

”میں مسٹر چارلس ہیرس کو اسٹینڈ پر بلانا چاہوں گا۔“

چارلی اٹھتے ہوئے [illegible] اور مجھ سے نظر ملتے ہی ہلکا سا مسکرایا۔

[illegible] میں داخل ہوا تھا۔ نیلے رنگ کی ٹائی لگائے چارکول سوٹ میں ملبوس جو اس کے لیے میں نے پسند کیا تھا۔ اس کے بال نفاست سے بنے ہوئے تھے اور داڑھی کی بہترین انداز میں تراش خراش ہوئی تھی۔ مجھے اس کے لیے اس پر فخر محسوس ہوا۔

”کم آن چارلی ڈارلنگ! اپنے کام پر لگو۔“ میں خود سے دھیرے سے بڑبڑائی تھی۔

چارلی کے حلف اٹھانے کے بعد کونسلر آرمسٹرانگ نے تاثر قائم کرنے سے پہلے کچھ غیر متعلق سوال کیے اور پھر اس نے اس سے بائیس اکتوبر کی شام کے واقعات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کو کہا۔

”ویل، میری بیٹی نے مجھے بلایا کہ دو آدمی اس کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں......“

”کیا آپ براہ کرم عدالت کے لیے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی بیٹی کون ہے؟“ آرمسٹرانگ نے مداخلت کی۔

”مریم ہیرس، یقیناً۔“ چارلی نے اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

”اور وہ گھر کی مالک ہے؟“

”یہ آپ بھی جانتے ہیں..... میں بھی جانتا ہوں۔“ چارلی اب قدرے ناراض نظر آنے لگا۔

”اور اس نے کس وقت فون کیا؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”میں نہیں جانتا لیکن اس نے کہا کہ وہ نائن ون ون پر بھی کال کرنے والی ہے اور آپ کے پاس اس کا ریکارڈ ہونا چاہیے۔“ چارلی کا انداز منہ بنانے والا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ ہمارے پاس ہوگا مسٹر ہیرس! تو پھر کیا ہوا؟“

”تو میں وہاں بھاگ کر گیا۔ میں نے دو سایوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، انہوں نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔“

”ایک منٹ مسٹر ہیرس! آپ نے کہا، انہوں نے آپ پر چھلانگ لگائی لیکن آپ کی صحت قابل رشک ہے۔ آپ کے چہرے یا جسم پر کسی قسم کی چوٹ کا کوئی نشان نہیں ہے۔“

”میں نے کہا کہ انہوں نے چھلانگ لگائی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ انہوں نے مجھے کوئی نقصان بھی پہنچایا۔“ چارلی کو اس بار بھی آرمسٹرانگ کی مداخلت پسند نہیں آئی۔

[illegible]

”میں نے تھوڑی ہی دیر میں انہیں لٹا دیا [illegible]

لیفٹ کک، رائٹ کراس، ایک دو، ایک دو۔ مریم دروازے پر آئی اور مجھے بتایا کہ پولیس بس پہنچنے ہی والی ہے تو میں نے اس سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے اس نے کہا کہ میں گھر واپس جاؤں اور دروازہ لاک کر دوں۔ وہ پولیس سے بات کرے گی اور کوشش کرے گی کہ مجھے اس معاملے سے دور رکھے۔ مجھے اس پر بھروسا ہے اس لیے میں نے بالکل ایسا ہی کیا اور جیسے ہی میں نے اپنا دروازہ بند کیا، میں نے پولیس کی کاروں کا سائرن سنا اور میں بس اتنا ہی جانتا ہوں۔''

''مسٹر ہیرس! کیا آپ عدالت کے سامنے یہ واضح کریں گے کہ جب آپ جا رہے تھے تو وہ دونوں در انداز کس حال میں تھے؟''

''میں نے تعمیراتی جوتے پہن رکھے تھے اور جانے سے پہلے میں نے ان دونوں کے گھٹنوں میں لات ماری۔ اس کے بعد وہ کہیں جانے کے قابل نہیں رہے تھے۔'' چارلی نے کمرائے عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر بتایا۔

''تو، مسٹر ہیرس! آپ عدالت کو بتا رہے ہیں کہ پولیس کے پہنچنے سے چند لمحے پہلے دونوں مشتبہ افراد معذور، یہاں تک کہ بے ہوش بھی تھے۔ کیا یہ درست ہے؟'' آرمسٹرانگ نے سوال کیا۔

''ہاں، میں ایسا ہی مانتا ہوں۔'' چارلی نے کہا۔

''اور ان کو پولیس سے بھاگنے میں بہت مشکل پیش آتی؟''

''کوئی ریفری اگر ایک سو پچاس تک گنتی گنتا وہ تب بھی اٹھ نہ پاتے۔'' چارلی کا لہجہ یقین سے پُر تھا۔

آرمسٹرانگ جج کی جانب مڑا۔ ''دیٹس آل یور آنر! مجھے اس گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

جج رینالڈس نے سر ہلایا اور جوناتھن راجرز کی طرف متوجہ ہوا جو شیرف کے ڈیپارٹمنٹ کا وکیل تھا۔

''کیا آپ اس گواہ سے جرح کرنا چاہتے ہیں کونسلر؟''

''اس نئے گواہ سے جرح کرنے سے پہلے میں اپنے کلائنٹس سے بات کرنے کا وقت چاہوں گا یور آنر!''

''او کے مسٹر راجرز!''

جج رینالڈس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر عدالت اگلے روز صبح دس بجے تک کے لیے برخاست کر دی۔

☆☆☆

چند ہفتوں بعد عدالت کا فیصلہ آ گیا جس میں دونوں ڈپٹیز کو جان بوجھ کر اپنے قیدیوں کے شہری حقوق کی خلاف ورزی کا قصوروار پایا گیا اور البرٹس کے خاندان کو پانچ ملین ڈالرز معاوضہ ادا کرنے کی فوری ہدایت کی گئی۔

آرمسٹرانگ اور چارلی دونوں اپنے طور پر بیٹھے بٹھائے اسٹار بن گئے تھے حالانکہ چارلی جلد ہی ٹاک اور نیوز شوز کے لیے تیار ہو کر تھک گیا تھا اور اب پھر سے اپنی سابقہ بے مصرف مگر پُرسکون زندگی کی طرف فرار ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔

دوسری طرف آرمسٹرانگ خوشی سے اپنے نئے ایجنڈے کو فروغ دے رہا تھا۔ میں اسے اتوار کی صبح کے نیوز شوز میں باقاعدگی سے دیکھتی تھی لیکن اس نے میرا فون اٹھانے میں بھی زیادہ وقت نہیں لیا۔

''ہے ..... کیا تم نے اپنا ناول لکھنا شروع کر دیا؟'' اس نے فون اٹھاتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔

''ابھی تک تو نہیں مگر تم کہاں تھے؟'' میں کسی فکر مند اور پریشان بیوی کی طرح استفسار کرنے لگی۔

''میں میڈیا کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور نکل نہیں پا رہا تھا۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر بتایا۔

''نکل نہیں پا رہے تھے یا نکلنا نہیں چاہتے تھے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ ہنسا۔ ''میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا تھا لیکن میں اب ویگاس واپس آ گیا ہوں اور میں نے سوچا تھا کہ تمہیں کال کروں۔ چارلی کیسا ہے؟''

''وہ اچھا ہوا ہے۔ آخری بار جب میں نے اس سے بات کی تھی تو اس نے مجھے بتایا کہ اسے ایک پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے یادداشت کے لیے پچاس ہزار ڈالرز کی پیشکش ہوئی ہے اور کوئی اور چاہتا ہے کہ وہ بزرگوں کے لیے فٹنس ویڈیو بنائے لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ اسپاٹ لائٹ سے تنگ آ چکا ہے۔ اس لیے اس نے دونوں آفرز ٹھکرا دیں۔'' میں نے تفصیل بتائی۔

''اس کے لیے یہ یادداشت تمہیں لکھنی چاہیے سیلینا۔ اس سے تمہیں وہ نظم و ضبط ملے گا جس کی تمہیں اپنی کتاب کو لکھتے ہوئے ضرورت ہوگی۔''

''یہ پہلا مشورہ ہے جو کتاب کے سلسلے میں تم سے سن رہی ہوں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''ہاں ..... گرل فرینڈ کے طور پر ایک کامیاب رائٹر کو رکھنے کا آئیڈیا برا نہیں ہے۔ اب بتاؤ کیا تم میرے ساتھ ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو؟'' اس نے وہی خواہش ظاہر کی جس کا اظہار وہ پہلے بھی ایک بار کر چکا تھا۔

''آں ..... سوچ کر بتاؤں گی۔'' میں نے کھلکھلاتے ہوئے کہا تھا جس سے یقیناً اسے اپنا جواب مل گیا ہوگا۔

×××

ایک مکمل گھر کی خواہش میں اعتبار کی بازی ہارنے والی حسینہ کا قصہ

قدرت بھی کیا چیز ہے... جو راستہ مشکل دکھائی دیتا ہے، وہ کتنی آسانی سے کٹ جاتا ہے اور جو راستہ آسان لگتا ہے گویا تمام مشکلات اسی سفر میں در آتی ہیں۔ وہ جو اس کا مان تھی... جانے کس گمان میں بے ایمانی کر گئی... پھر تو مان کے ساتھ ساتھ دل کو بھی ٹوٹنا تھا سو... ٹوٹ گیا۔ پھر کیسے اس کا مان اور اپنا ایمان دونوں کو وہ ہار نہ جاتی۔

وارث

کرن نعمان

لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر وہ اسپتال کے اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوا تھا جہاں اس کا دل، اس کی زندگی، اس کی جنونی محبت اور اس کی نصف بہتر گل مینا موجود تھی۔ آج صبح ہی اس نے ایک بے حد خوب صورت اور گل گوتھنے بچے کو جنم دیا تھا۔ اس کی شادی کے بعد یہ ایک اور بڑی خوشی اعظم خان کی حویلی میں آئی تھی۔ اس بچے کی صورت اعظم خان کو اپنا پوتا اور حویلی کا وارث مل گیا تھا کیونکہ زمان خان کے ہاں تین بیٹیوں کی ولادت نے انہیں

ہی رہا تھا کہ ولی خان اپنے کمرے سے نکلا اور تیزی سے لائبریری کی طرف بڑھ گیا۔ گل ریز نے اس کے ہاتھ میں کچھ دیکھا تو تھا مگر اندھیرے کے باعث اسے نہ دیکھ سکا۔

"کیا ہونے والا ہے آج کی رات؟" اس کے دماغ کی سوئی اس بات پر اٹک گئی۔ اس کے ہاتھ میں جو اس نے دیکھا تھا وہ دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل دیا مگر لائبریری کے باہر اسے رک جانا پڑا۔ اس نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ گھوم کر پچھلے صحن کی طرف بھاگا جہاں لائبریری کی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ تیز بارش شروع ہو چکی تھی جس نے اسے سر سے پیر تک بھگو دیا مگر آج اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے کان کھڑکی سے جوڑ دیے تھے۔ زمان خان رات دیر تک مطالعے کا عادی تھا۔ پہاڑی علاقوں میں اکثر ہی لائٹ چلی جاتی تھی اس لیے وہ ہمیشہ اپنی ٹیبل پر لالٹین رکھتا تھا۔ اس نے حیرت سے ولی خان کو لائبریری میں داخل ہو کر دروازہ لاک کرتے دیکھا۔

"خیریت تو ہے ولی اب ٹھیک ہے نا؟"

ولی خان کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"خیریت میری زندگی سے کب کی رخصت ہو گئی زمان خان۔"

زمان خان کو اس کا نام لے کر مخاطب کرنا عجیب لگا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو آج؟"

"اسی انداز میں کر رہا ہوں جس انداز میں تم جیسے پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے بھائی سے کی جاتی ہے۔"

"ولی!" زمان خان اپنی پوری طاقت سے چلایا۔

"چلاؤ مت۔ میں نے اس کے چہرے میں تمہارا چہرہ دیکھ لیا ہے۔" کچھ دیر کو دونوں بھائیوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔ "کیا اب بھی تمہارے پاس کہنے کو کچھ ہے رذیل انسان۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میری بے بسی اور اذیت سے حظ اٹھاتے رہے۔ بڑے بھائی تھے۔ ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ وہ تمہارے چھوٹے بھائی کی عزت تھی۔"

زمان خان کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ کچھ عرصے سے اسے لگ رہا تھا کہ یہ بات اب وہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں پائے گا۔ ولی خان نے گل ریز کو دیکھا تھا وہ اس کے چہرے میں اپنا چہرہ بہت پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے لیکن آخر کب تک وہ اسے حویلی آنے سے روکے رکھتا۔ آخر وہ حویلی آ…

اکلوتا وارث تھا اور شاید کہ تب تقریب کو بہانہ بنا کر … کرتا تھا۔

زمان خان نے ولی کے ہاتھ میں … لمبی سانس بھری۔ "تم میرے ساتھ جو کرنا چاہو … ولی مگر ایک بار میری اتنی سی بات سن لو … میں نے جانتے بوجھتے نہیں کیا۔ وہ بھی معصوم … مگر ہم بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تعلق … لیکن ایک جذباتی لمحے میں بہہ گئے۔ … جس دن تم لندن گئے تھے اور میں تمہیں پشاور ایئرپورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔" اس کے لب ہل رہے تھے … ماضی میں کہیں بھٹک رہی تھیں۔

اس دن جب وہ ولی کو پشاور ایئرپورٹ پر الوداع کر کے حویلی واپس آیا تب شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ملازم نے اسے بتایا کہ اچانک معظم خان (ولی کے حقیقی چچا اور سسر تھے) کی طبیعت خراب ہو گئی … لیے زرینہ، بابا جان اور بی بی جان انہیں دیکھنے چلے گئے۔ حویلی میں صرف گل بیتا تھی۔ اس نے جلدی جلدی … اور معظم خان کی طرف جانے کے لیے تیار ہو کر … سے نکلتے ہوئے اس کی نگاہ ان کتابوں پر پڑی جو ولی … سامان کا وزن زیادہ ہو جانے کی وجہ سے چھوڑ دی تھیں۔ اس نے وہ کتابیں اٹھائیں اور گل بیتا کے کمرے کی طرف چل دیا… ارادہ تھا کہ کتابیں اس کے حوالے کر کے … جائے گا مگر کمرے کے باہر ہی اسے اس کی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ دستک دے کر وہ کمرے میں آیا۔ گل بیتا ولی کی تصویر سینے سے لگائے بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔

"گل بیتا! کیا ہوا ہے بچے؟" وہ کتابیں ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔ وہ اس سے عمر میں دس سال چھوٹی … خالہ زاد تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی بھی تھی اس لیے وہ اسے ایسے ہی مخاطب کرتا تھا۔ اسے اپنے قریب دیکھ کر وہ … بیٹھی۔ آنکھوں سے آنسو بدستور بہہ رہے تھے۔ اس نے دوپٹہ سائڈ سے اٹھا کر خود پہ پھیلا لیا۔

"ولی کو یاد کر کے رو رہی ہو؟" اس نے چپ … سر جھکا لیا۔ اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "پاگل لڑکی! ابھی وہ لندن پہنچا بھی نہیں … نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ بھلا یہ دو تین سال کیسے گزارو گی اس کے بنا۔"

دو تین سال کا سن کر وہ بلک بلک کر رو دی … تھا۔ … چھو لیا …

… تھی۔ بے اختیاری میں اس نے گل کا سر … رہی تھی۔ … گل کا دل بھی صاف تھا۔ اسے سینے سے … نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ … مشکل … گل بیتا بچے! ایسے حوصلہ تھوڑی ہارتے … شاباش چپ کرو اور میری طرف دیکھو۔ … میری طرف۔" اور پھر جیسے ہی اس نے اس کی آنکھوں … شیطان اپنا کاری وار کر گیا۔ … دیکھا ان کی دھڑکن کے سُر تال بدل … گئی تھی۔ دل کی … اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے جذبات کا ریلا انہیں بہا کر … لے گیا … گل بیتا کو بھی اس میں بہنے پر مجبور کر دیا۔ … بیٹھے تھے۔

… احساس شرمندگی … گل کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ … گل بیتا کو ولی کی دوری کے ساتھ ساتھ احساسِ گناہ بھی تڑپا رہا تھا۔ ہر گزرتے دن اس … خوف … چند دن بعد وہ … سے نکلے … تب پتا چلا کہ وہ امید سے تھی۔ کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ بچہ ولی خان کا نہیں، زمان خان کا ہو گا۔ … زمان اور گل بیتا کو بھی یہ سوچ نہیں آئی تھی۔ اگر ولی خود … کا ذکر نہ کرتا تو آج وہ وقت … جو ہو رہا تھا۔

"تمہاری جذباتی کہانی سن کر تمہیں معاف نہیں کیا … زمان خان وہ میری بیوی تھی، میری عزت۔ اگر زندہ ہوتی تو آج اسے بھی میری طرف سے یہی سزا ملتی جو میں تمہیں دینے جا رہا ہوں اور یہ یاد رکھنا کہ یہ سزا اس سزا کا ایک عشر عشیر بھی نہیں جو میں بے قصور ہونے کے باوجود چوبیس سال سے بھگت رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ولی خان نے فائر کیا اور گولی سیدھی زمان خان کے دل میں پیوست ہو گئی۔ … ولی خان کو دیکھتے وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ولی خان … کر گل ریز بھاگا چلا آیا اور آتے ہی … دروازہ … دیا مگر جب تک ولی خان اپنا ارادہ پورا کر چکا تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ گل ریز تیزی سے اندر آیا مگر سامنے زمان خان کی خون میں لت پت لاش دیکھ کر دم بخود رک گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ جو شخص اس کے سامنے لاش کی صورت پڑا تھا، اس نے اسے باپ بن کر پالا ہی نہیں … وہی اس کا حقیقی باپ بھی تھا پھر وہ آہستہ آہستہ … کی طرف بڑھا … وہ ہمیشہ اپنا باپ سمجھتا رہا مگر آخر … اس کے باپ کے قاتل کے سوا کچھ بھی نہیں رہا اور … کی طرف … ولی خان …

نفرت سے اسے دیکھ رہا ہے۔

"چلا دیں بابا! مار دیں مجھے کیونکہ یہ جان کر کہ ایک گناہ کی پاداش میں پیدا ہوا ہوں، میں جینا نہیں چاہتا۔ میں ساری عمر آپ کی طرح زندہ لاش بن کر جینا نہیں چاہتا۔ غدار … مجھے بھی۔" گل ریز کا چہرہ دکھ و اذیت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد پھر ایک فائر ہوا اور گل ریز کی سانسیں رک گئیں۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا۔ حویلی میں عورتیں بین کر رہی تھیں۔ اس اثنا میں حویلی کے باہر پولیس کی گاڑیاں آ کر رکی تھیں۔ پولیس اہلکاروں نے آتے ہی جگہ کو گھیرے میں لے کر سب کو باہر نکال دیا، سوائے اس شخص کے جس کے بال اور کپڑے اب بھی بھیگے ہوئے تھے۔ جس کی پتھرائی آنکھیں اب بھی دونوں لاشوں پر جمی تھیں جن میں ایک اس کا باپ تھا، دوسرا حقیقی باپ۔ لاشوں کا بغور معائنہ کر کے انسپکٹر اس کے قریب آیا۔

"ایک کا مرڈر ہوا ہے، دوسرے نے خودکشی کی ہے۔ دونوں سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟"

اس نے کھوئی کھوئی سی نگاہ انسپکٹر پر ڈالی۔ "باپ کا۔"

"ہوں…… اور دوسرا؟"

اب کے بھی اس کے منہ سے یہی نکلا۔ "باپ کا۔"

"دوسرا تایا تھا جی۔" سب انسپکٹر، اعظم خان کی فیملی کو اچھی طرح سے جانتا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ گل ریز اس وقت صدمے میں ہے۔

"ایک بھائی نے دوسرے کا مرڈر کر کے خودکشی کر لی۔ کیا دونوں کے بیچ کوئی تنازعہ تھا؟" انسپکٹر اپنے پیشہ ورانہ انداز میں اس سے سوال کر رہا تھا۔

"جی۔" وہ کسی اور ہی کیفیت میں جواب دے رہا تھا۔

"کیا وراثت کا معاملہ تھا؟"

"نہیں، وہ وارث کا۔" یہ کہہ کر گل ریز دونوں لاشوں پر گہری نگاہ ڈالتا لائبریری سے باہر نکل گیا۔ پیچھے انسپکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وراثت کا ہی تنازعہ ہو گا سر جی! اور اکلوتا وارث تو یہ خود ہے۔" انسپکٹر نے غور سے سب انسپکٹر کی بات سنی اور آخری بار لاشوں پر نظر ڈالی۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ایف آئی آر میں لکھ دو اور لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دو۔"

☆☆☆

❁ عالیہ جہانگیر ...... لاہور

اب جس کے جی میں آئے، وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

❁ شہناز ...... لاڑکانہ

ہم سفر اور بھی سرگرم سفر تھے لیکن
مجھ کو صیاد نے رفتار سے پہچان لیا

❁ یاسر احمد ...... کبیا

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں

❁ میمونہ علی ...... فیصل آباد

خوشی کے آنکھوں میں آنسو سنبھال کر رکھنا
برے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے

❁ عبدالحکیم ...... خانیوال

حساب عمر کا بس اتنا گوشوارہ
تجھے نکال کے دیکھا تو سب خسارہ

❁ یوسف قریشی ...... گوجرانوالہ

کتنے لہجوں کے غلافوں میں چھپاؤں تجھ کو
شہر والے میرا موضوع سخن جانتے ہیں

❁ شاہد نواز ...... خانیوال

اور کے انساں تو محبت سے بچے گا کیونکر
اس خطا پر تو فرشتوں نے سزا پائی ہے

❁ شہناز مغل ...... کراچی

اتنا حصہ تو ہمارا ہو تیری سانسوں میں
دل کی صورت تیرے سینے میں دھڑکتے جائیں

❁ مسرت جعفری ...... خیرپور

خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے مگر تیری کمی ہے

❁ عاصم سعید ...... مظفرگڑھ

اب کے امید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبت ہم کو

❁ محمد الطاف ...... آزاد کشمیر

داستانے اتارہ تو لہو رنگ ہیں پنجے
یہ ظاہری انسان درندے کی طرح ہے

❁ امتیاز احمد ...... پھالیہ

ضمیر و ظرف کی اب ان کے آزمائش ہے
خلوص بانٹ چکا میں تو آشناؤں میں

❁ ڈاکٹر فرحت ...... ساہیوال

آپ محشر میں ابھی قول کے سچے کیا ہیں
انگلیاں اٹھیں گی، وہ آئے مکرنے والے

❁ قیصر مسعود ...... بہاولپور

دل تک پہنچوں آنکھ سے ہوکر یا پھر سوچ کے رستے سے
ہر صورت میں اس کا سایہ میرے ساتھ ہی جاتا ہے

❁ خرم نقوی ...... سرگودھا

سمندر کے سفر رکھے ہوئے ہیں
مرے اندر بھنور رکھے ہوئے ہیں

❁ گلزار حمید ...... کراچی

ہم تو اس کی گلی کی خاک ہوئے
کس طرف کو گیا نہ جانے دل

❁ عظیم احمد ...... جھنگ

خواب میں سر کو چھوڑتا تھا کوئی
خون میں تر بری جبیں کیوں ہے

❁ مرزا وقار ...... جہلم

رقص کرتے میں دیکھتا ہوں سے
وہ جو شعلہ سا ہے خلاؤں میں

❁ راشدہ پروین بھٹی ...... روہڑی

پھر ہوا سوچتی ہے دروازے
پھر کوئی بات ہونے والی ہے

❁ عارفہ جمال ...... کراچی

تمہارے ہاتھ سے لکھے ہوئے خط
مرے سینے میں چاقو ڈھونڈتے ہیں

❁ نورین شارب ...... پنڈ دادن خان

چاند چمکا نہ مرے ساتھ سویرا نکلا
رات کی اوٹ سے بیمار اندھیرا نکلا

❁ اسد احمد ...... حیدرآباد

دھوپ سائے بچھائے بیٹھی تھی
میں ہی دیوار تک نہیں پہنچا

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2022

مُحفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

سگ بیتی

فاطمہ حسام

ہر معاشرے کا چلن دوسرے سے الگ ہوتا ہے... ایسے ہی ایک معاشرے میں بھی انسان کی اپنی الگ جگہ اور کتوں کا اپنا الگ مقام تھا۔ دنیا میں بعض جگہوں پر انسانوں کی قدر نہیں اور کچھ لوگ کتوں کے حقوق بھی ایمانداری سے ادا کرنے میں کسی غفلت کا شکار نہیں ہوتے... بس یہی تضاد اس کائنات کی بنیاد ہے۔

کسی قیمتی اثاثے کی طرح کتوں کی تلاش کا عجیب ماجرا

میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے اپنا نام بنایا ہے۔ اس پیشے نے مجھے دولت، شہرت اور سب کچھ دیا ہے مگر کچھ عرصے سے میرے کام میں مندی کا ... ن ہے۔ ایک میں ہی کیا، اس وقت ہر شخص کووڈ نائنٹین سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ اس وبا سے پہلے میرے پاس نصف درجن کیسز لائن اپ رہتے تھے لیکن اب ہفتہ ہفتہ بھر کلائنٹ کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی دل پر بھاری پتھر رکھ کر وہ کیس پکڑ لیا تھا۔

آنے والے نے اپنا تعارف ہنری کے نام سے کرایا

تھا۔ صرف "ہنری" نہ کچھ آگے اور نہ پیچھے۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا، اسے کافی پیش کی اور شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

"یس مسٹر ہنری! بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

اس نے کافی کے مگ کو بے دلی سے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں گھمایا۔ اس کی یہ اضطراری حرکت ظاہر کرتی تھی کہ وہ اس سے بھی زیادہ کسی گرم شے کی طلب محسوس کر رہا تھا اور میں اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا کیونکہ آفس میں بوتل کھول کر بیٹھنا میرے اصول کے خلاف تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کے کام آتے ہو؟" چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے کہا۔

"ہاں، میں لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں ڈیلسی کی ایک پرابلم لے کر یہاں آیا ہوں۔" وہ کافی کا بڑا سا گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ "اس کے پاس ایک کتا تھا۔ بہت ہی وفادار اور پیارا کتا۔ اس کا نام "استار" ہے۔ استار، ڈیلسی کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ وہ استار کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کر رہی ہے۔ اس نے استار کو کبھی خود سے جدا نہیں کیا تھا مگر اب...... استار غائب ہوچکا ہے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ استار خود ہی کہیں فرار ہوگیا ہو؟" میں نے ایک امکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خیال آرائی کی۔ "وہ مسز ڈیلسی کے ساتھ مزید نہ رہنا چاہتا ہو۔"

"نہیں۔" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔ "استار اپنی مالکن کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ضرور کوئی کم بخت اسے چرا کر لے گیا ہے۔ استار کو بازیاب کر کے واپس لانا ہے۔"

میں نے ابتدا میں بادل نخواستہ یہ کیس لینے کی جو بات کی، اس سے میری مراد یہی تھی کہ میں پالتو جانوروں کی گمشدگی کے کیس نہیں لیا کرتا تھا۔ موجودہ حالات میں تو اچھے خاصے سفید پوش بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس کے مقابلے میں کسی "مسنگ پیٹ" کا کیس پکڑ لینا کوئی شرمندگی کی بات بہرکیف نہیں تھی۔

"کیا تم نے ڈاگ وارڈن کے ہاں استار کو چیک کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ڈاگ وارڈن جیسا کہ تمہیں بھی معلوم ہوگا، ادھر ادھر آوارہ گھومنے والے، لاوارث اور بے سہارا کتوں کو اپنے پاس بٹھا دیتا ہے۔"

"ڈاگ وارڈن یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور کار کے بغیر وہاں پہنچنا ممکن نہیں۔" ہنری نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس کار نہیں ہے۔ تمہارا آفس بس کے روٹ پر پڑتا ہے اس لیے میں تمہارے پاس آگیا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ تم ضرور ہماری مدد کرو گے۔"

"اس وقت مسز ڈیلسی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں ڈیلسی کے پاس لے چلتا ہوں۔" ہنری نے بتایا پھر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ برآمد کیے اور انہیں میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں یہ کافی رہیں گے۔"

ان نوٹوں کی حالت بتاتی تھی کہ انہیں کسی بہت ہی تنگ سی جگہ پر گھسا کر اور چھپا کر رکھا گیا تھا۔ وہ اماؤنٹ اگرچہ میری عمومی فیس سے خاصا کم تھا مگر کسی پالتو جانور کی گمشدگی کا معاملہ حل کرنا میرے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہوتا۔ اوپر سے کڑکی کا دور بھی چل رہا تھا سو میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔

"آپ اس رقم کو ابھی اپنے پاس ہی رکھیں۔" میں نے ہنری سے کہا۔ "میرا اصول ہے کہ میں کام ختم کرنے کے بعد اپنی فیس وصول کرتا ہوں۔"

حالات چاہے کیسے بھی ہوں، انسان کو اپنے اصولوں کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اس سے انا اور خودداری کی جو تسکین ہوتی ہے، اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ میں نے ہنری سے غلط نہیں کہا تھا۔ میں واقعتاً اپنی سروس کا معاوضہ مشن کی تکمیل پر ہی وصول کیا کرتا تھا۔ دوسرے پرائیویٹ سراغ رساں میرے اس اصول کو پاگل پن اور بے وقوفی سمجھتے تھے مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

ڈیلسی کی قیام گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اپنی کار میں ہنری کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ چھوٹا سا مکان بھی ڈیلسی کی طرح عمر رسیدہ اور بوسیدہ سا تھا۔ ہنری نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ مارٹن ہے۔ ایک پرائیویٹ سراغ رساں۔"

ڈیلسی نے میرے عقب میں نگاہ دوڑائی اور قدرے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "ہنری! کیا تم پولیس کے پاس نہیں گئے تھے؟ مجھے ادھر کوئی کانسٹیبل دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟"

ہنری نے کہا۔ "یہ کام پرائیویٹ ایجنسی کا ہی ہے۔ مسٹر مارٹن بہت ہی قابل انسان ہیں۔ آپ انہیں استار کے بارے میں تفصیل بتائیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ یہ آپ کے استار کو ڈھونڈ نکالیں گے۔"

ہنری نے آخری جملہ اپنی طرف سے ٹانک دیا تھا۔ میں نے اس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ وہ بڈھا خاصا شاطر اور مبالغہ پرست بھی تھا۔ میں اپنے کلائنٹس سے اس قسم کے وعدے کرنے کے بجائے پوری تندہی سے کام میں جت جاتا تھا اور مثبت نتائج لے کر آتا تھا۔

ہنری کی تسلی بھری وضاحت نے ڈیلسی کو مطمئن کردیا اور وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے آمادہ ہوگئی۔ میں نے اپنی پاکٹ میں سے ڈائری اور پین برآمد کیا اور ڈیلسی کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "مجھے استار کے بارے میں بتائیں۔"

ڈیلسی کے بدن پر موجود کوٹ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی اور نحیف و نزار خاتون تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے کوٹ کو نہیں بلکہ کوٹ نے اسے پہن رکھا ہے۔

"استار بہت ہی تمیز دار کتا ہے۔" وہ اداسی بھری آواز میں بولی۔ "وہ کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکنا شروع نہیں کردیتا۔ کاٹنے کی بھی عادت نہیں ہے۔ بھوک لگے تو دوسرے کتوں کی طرح وہ ادھر ادھر نہیں بھاگتا۔ وہ نہایت صابر و شاکر کتا ہے۔ گھر میں کہیں گندگی نہیں کرتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

وہ اپنے پیٹ (پالتو جانور) کا ذکر کرتے ہوئے زمانہ حال کا صیغہ استعمال کر رہی تھی جیسے اسے یقین ہو کہ اس کا استار جلد ہی اس کے پاس ہوگا۔

"استار کی کوئی خاص نشانی؟" میں نے ڈائری کے صفحے پر قلم چلاتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس کا رنگ پیلا ہے۔" ڈیلسی نے بتایا۔ "اور اس کے دائیں کندھے پر ایک سیاہ دھبا ہے جو کسی ستارے کے مانند دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کا نام "استار" رکھ چھوڑا ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے ستائشی نظر سے مسز ڈیلسی کو دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کے پاس استار کی کوئی تصویر تو یقیناً ہوگی؟"

"میرے سیل فون میں استار کی کئی تصاویر ہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولی۔ "مگر سر دست سیل فون خراب ہے۔ میں ایک آدھ روز میں اپنے سیل فون کو ٹھیک کروالوں گی۔ اس کے بعد ہی وہ تصاویر آپ کو دکھا سکوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "بس، استار کی کوئی ایک واضح تصویر ہی کافی ہوگی جس میں اس کا چہرہ اور کندھے والا نشان صاف نظر آتا ہو۔"

"میں ایسی تصویر آپ کے نمبر پر سینڈ کردوں گی۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا اور دریافت کیا۔ "آپ نے استار کو آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"ایک ہفتہ پہلے۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "جب بھی کسی ایسی دعوت میں جانا ہوتا ہے کہ جہاں کتوں کو ساتھ لانے کی پابندی ہو تو میں استار کو اپنے گھر کے باہر ایک درخت کے نیچے بٹھا جاتی ہوں۔ وہ بہت ہی فرماں بردار کتا ہے۔ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے پورا تعاون کرتا ہے اور میں جب واپس آتی ہوں تو استار کو اسی درخت کے نیچے اپنا منتظر پاتی ہوں۔ میں اس کی پسند کی ڈھیر ساری کھانے کی چیزیں بھی ساتھ لاتی ہوں جس سے وہ خوش ہوجاتا ہے اور میری وقتی جدائی کو فراموش کردیتا ہے لیکن گزشتہ پیر کی رات جب میں ایک پارٹی سے لوٹی تو استار کو درخت کے نیچے نہ پاکر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے آس پاس اور گھر کے اندر ہر جگہ اسے جھانک لیا لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ تب میری حیرت، پریشانی میں بدل گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے استار نے خود کو غائب کردیا تھا۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں کو اس جادوگر کے انداز میں حرکت دی جو کسی مجمع کے سامنے جادو کے زور پر کبوتر یا خرگوش کو غائب کردیتا ہو۔

"میں نے استار کو بہت آوازیں دیں۔" ڈیلسی اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "مگر وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ میں اسے با آواز بلند پکارتی چلی گئی اور اب بھی میں مسلسل اس کی تلاش میں ہوں......"

بات کی تکمیل پر شدت جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں "استار" کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور میرا پہلا ٹارگٹ تھا "پی سی اے ایس" ...... بے گھر اور آوارہ کتوں کی حفاظت اور نگہداشت کا مرکز "پیرائن سٹی اینیمل شیلٹر" یعنی پی سی اے ایس۔ ڈیلسی نے استار کی ایک تصویر مجھے بھیج دی تھی۔ مذکورہ تصویر کی پکچر کوالٹی اگرچہ بہت اچھی نہیں تھی تاہم اس کی صورت اور کندھے کا سیاہ ستارہ نما نشان صاف پہچان میں آرہا تھا۔

اے آر او ایچ (اینیمل ریسکیو اور ہیومن) والوں کو تم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ تمہارے خلاف زہر افشانی کیوں کرتے رہتے ہیں؟"

"یہ ان کے نکمے پن اور بدعنوانی کی دلیل ہے۔" وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ ادارہ حکومت نے جانوروں کے تحفظ کے لیے قائم کیا تھا مگر انہیں صرف تنخواہ لینے سے مطلب ہے۔ وہ ایک پیسے کا کام نہیں کرتے۔ لوگ اپنے گمشدہ پیٹس کی رپورٹس ان کے پاس درج کراتے ہیں اور اس کے بعد پھیرے پر پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی گمشدہ جانور کا کوئی مالک ان کی ناقص کارکردگی پر برس پڑے تو اس سے کہتے ہیں کہ جاکر وارڈن کے شیلٹر میں چیک کرو۔ اس شہر کا سب سے بڑا "پالتو جانور چور" وارڈن مارکس ہی ہے۔ وہ لوگوں کے پیٹس کو اغوا کرکے اپنے پاس قید کرلیتا ہے اور پھر بھاری معاوضہ لے کر اس کے مالک کو واپس کردیتا ہے۔"

"میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں مارکس!" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "اگر تمہارے اسٹاک میں اسٹار موجود ہے تو مجھے دے دو۔ میں تمہیں تھوڑے پیسے دے دوں گا۔ میں درحقیقت ایک پریشان حال بڑھیا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسٹار کے سوا اس کا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں ہے۔"

"دیکھو وارڈن!" وہ آگے کو جھکتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ "اگر تمہارا مطلوبہ کتا میرے پاس ہوتا تو اسے بلامعاوضہ تمہارے سپرد کردیتا۔ میں تمہاری خاطر اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔"

مجھے اس کے الفاظ سے سچائی جھلکتی دکھائی دی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "تو مجھے بتاؤ میں اسٹار کی تلاش میں کدھر کا رخ کروں؟"

"ایجنسی...!" اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"میں اس سے ملاقات کرچکا ہوں۔" میں نے بتایا پھر اسٹار کی تصویر پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویر ایجنسی نے ہی مجھے اپنے ریکارڈ سے نکال کر دی ہے۔ اس کے شیڈ میں جو کتے تھے، میں انہیں بغور چیک کرچکا ہوں۔ اسٹار وہاں موجود نہیں ہے۔"

"اوہ...!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر کہا۔ "کیا تم لزارس سے مل چکے ہو؟"

"نہیں!" میں نے نفی میں گردن ہلادی۔

"وہ "ہوپ فل ہارٹس" کے نام سے کام کررہا ہے۔" وارڈن نے بتایا۔ "[illegible]

جانوروں کو ریسکیو کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے اس نے اسٹار کو کہیں دیکھا ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں لزارس سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر مارکس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کے آفس سے نکل آیا۔

"ہوپ فل ہارٹس" میرے راستے میں پڑتا تھا۔ واپسی کے سفر میں، میں نے ہوپ فل ہارٹس پر کار روک دی اور جاکر لزارس سے ملا۔ اس نے میری بات پر زیادہ توجہ نہیں دی اور بیچ ہی میں بول پڑا۔

"تمہاری یہ ڈیلسی پیٹرسن کوئی پاگل بڑھیا لگتی ہے۔"

میں نے خفگی بھرے انداز میں پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ایک کتے کی گمشدگی پر بھلا کوئی کسی پرائیویٹ ڈیٹیکٹو کو ہائر کرتا ہے؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور تم بھی اپنی فیس کھری کرنے چل نکلے؟ خدا کے بندے، پالتو جانوروں کو تلاش کرنا تو "اے آر او ایچ" کا کام ہے۔ ڈیلسی کو سمجھاؤ کہ وہ "اے آر او ایچ" کے آفس میں اپنے لاپتا کتے کی رپورٹ درج کرادے۔"

لزارس کے اس خشک بلکہ غیر اخلاقی رویے کے بعد مزید بات چیت کی گنجائش نہیں نکلتی تھی لہٰذا میں اس کا شکریہ ادا کیے بغیر ہی واپس آگیا۔

اب دن ڈھل رہا تھا۔ آج دن بھر کی دوڑ دھوپ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ ان لمحات میں، میں خاصا اداس بھی تھا کیونکہ سخت محنت اور کوشش کے باوجود اسٹار کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں نے دل کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے اپنی کار میں تیز موسیقی آن کردی۔

☆☆☆

وارڈن مارکس کی زبانی یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ "اے آر او ایچ" نامی حکومت کا قائم کردہ ادارہ اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے کالج کے اسٹوڈنٹس کا استعمال کررہا تھا۔ یہ ادارہ بننے کے بعد سے گھریلو پالتو جانوروں کی چوری اور گمشدگی کے واقعات میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا تھا کیونکہ یہ لوگ کالج اسٹوڈنٹس کی مدد سے خود ہی پالتو جانوروں کو اغوا کرا رہے تھے تاکہ ان کی موجودگی کا جواز زندہ رہے۔

عین ممکن ہے کہ مارکس اس ادارے کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے چکر میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہو کیونکہ وہ لوگ بھی اس کی جان اور کاروبار کے پیچھے ہاتھ دھو کر [illegible]

تو پھر یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔

میں ضعیف العمر ڈیلسی کے بارے میں سوچنے لگا جس کا عزیز از جان کتا پچھلے ایک ہفتے سے لاپتا تھا۔ میں نے ڈیلسی کے چہرے پر اسٹار کی جدائی کا صدمہ دیکھا تھا۔ کتا ایک ایسا جانور ہے جو اپنے مالک سے غیر مشروط محبت کرتا ہے۔ اگر انسان کی کار یا جیولری چوری ہوجائے تو اس کی جگہ دوسری کار اور دوسری جیولری لی جاسکتی ہے مگر ایک وفادار کتے کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا کیونکہ وہ انسان کا سچا ہم سفر ہوتا ہے۔

کئی بار میں نے یہ بھی سوچا کہ اس مہم سے باز آجاؤں۔ میں نے کون سی ڈیلسی سے کوئی فیس لے رکھی ہے جو اس کام کو مکمل کرنے کے لیے پابند ہوں لیکن یہ خیال لمحہ بھر کے لیے ہی میرے ذہن سے گزرتا تھا کیونکہ اس میں میری مرضی شامل نہیں ہوتی تھی۔ میں تو اپنے اصولوں پر کاربند رہنے والا انسان ہوں۔ ہنری نے تو مجھے فیس دینے کی کوشش کی تھی مگر میں نے خود ہی اسے منع کردیا تھا۔

میں نے گھر پہنچ کر خود کو فریش کیا اور ڈنر کے بعد اپنے کمپیوٹر کے سامنے جم کر بیٹھ گیا۔ میں سرکاری ادارے "اے آر او ایچ" کے علاوہ نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کو بھی سرچ کرنے لگا۔ ان سب اداروں کا تعلق گھریلو پالتو جانوروں کی پرورش، نگہداشت اور حفاظت سے تھا۔ ان میں "ہوپ فل ہارٹس" مجھے سب سے زیادہ سرگرم دکھائی دیا۔ یہ ادارہ بنیادی طور پر مصیبت زدہ جانوروں کی مدد کرتا تھا۔ ان لوگوں نے ایسے جانوروں کے لیے شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس بنا رکھا تھا جہاں پر لاوارث کتوں اور دیگر پیٹس کو رکھا جاتا تھا۔ لزارس اسی ادارے کے لیے کام کرتا تھا مگر اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اس کا رویہ مجھے عجیب سا بلکہ خاصا مشکوک لگا تھا۔ لزارس کے پاس مجھے وارڈن مارکس نے بھیجا تھا۔ میں نے سوچا اسی سے لزارس کی شکایت کروں گا۔

یہ موقع مجھے آئندہ روز مل گیا۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ہنری آن ٹپکا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور بردباری جھلک رہی تھی۔ وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر مستفسر ہوا۔

"اسٹار کا کچھ پتا چلا؟"

سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی تک ڈیلسی کے کتے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان پایا تھا لیکن میں نے ہنری کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاصے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"میں اسٹار کے بہت نزدیک پہنچ چکا ہوں۔ ایک دو روز میں، میں اسے بازیاب کرکے مسز ڈیلسی کے حوالے کردوں گا۔"

میرا جواب بلاشبہ منافقت اور غلط بیانی سے بھرپور تھا لیکن بعض اوقات موقع پر ہم پرائیویٹ سراغ رسانوں کو اپنے کلائنٹس کی تسلی اور اطمینان کی خاطر اس قسم کی چھوٹی موٹی دروغ گوئی کرنا پڑتی ہے اور ظاہر ہے اس میں ہماری بدنیتی شامل نہیں ہوتی۔

ہنری نے میرے جواب پر کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کیا اور اپنی جیب سے دو تصاویر نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ ان میں سے ایک کتے اور ایک کتیا کی تصویر تھی۔ دونوں پالتو جانور نہایت ہی اسمارٹ اور خوبصورت اور ڈیشنگ تھے۔ بالکل اسٹار کی طرح۔ میں نے نگاہ اٹھا کر ہنری کی طرف دیکھا۔ میرے دیکھنے کے انداز میں سوال واضح طور پر پڑھا جاسکتا تھا۔

"دونوں تصاویر مسز ڈیلسی نے آپ کے لیے دی ہیں۔" ہنری نے سپاٹ آواز میں کہا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کیا یہ دونوں پیٹس بھی مسنگ ہیں؟"

"ہاں مگر انہیں تلاش کرنا تمہاری ذمے داری نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ تصاویر مجھے دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"ان میں سے یہ چیچی ہے۔" وہ فیمیل ڈاگ پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا تعلق مسز للی سے ہے اور یہ دوسرا بارٹی ہے۔ بارٹی، فریڈی نامی ایک شخص کی ملکیت ہے۔ للی اور فریڈی خاصے امیر لوگ ہیں۔ اگر اسٹار کی تلاش میں تم چیچی اور بارٹی تک بھی پہنچ جاتے ہو تو تمہیں بہت زیادہ مالی فائدہ ہوسکتا ہے۔ مسز ڈیلسی تمہیں پسند کرنے لگی ہیں اور وہ تمہارا بھلا چاہتی ہیں اسی لیے انہوں نے یہ تصاویر تمہارے لیے بھجوائی ہیں۔"

"تم واپس جاکر مسز ڈیلسی کو میرا تھینکس بولنا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "ایسے نیک دل لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔"

ہنری نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ "چیچی اور بارٹی کب سے لاپتا ہیں؟"

"چیچی پچھلے دس دن سے مسز للی کے ساتھ دیکھی نہیں گئی۔" اس نے بتایا۔ "اور بارٹی بھی کم و بیش اتنے ہی عرصے سے غائب ہے۔ دونوں کے مالکان نے "اے آر او ایچ" میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا رکھی ہے [illegible]

کرنا چاہتا ہوں۔"

"او کے!" میں نے کہا۔

کلوفی اپنے گیجٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ وہ میرے پہلو میں کو ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ہدایت اور اپنی احتیاط کے مطابق لگ بھگ چار سو فٹ کے فاصلے سے... فارم ہاؤس کا چکر لگایا۔

"بات بن گئی مسٹر مارٹن!" وہ خوشی سے مسرور لہجے میں بولا۔

میں نے کار کو روک دیا اور اس سے پوچھا۔ "مجھے بھی بتاؤ کون سی بات بن گئی ہے؟"

"اس فارم ہاؤس کی حفاظت اور نگرانی کے لیے سیکیورٹی کیمروں کے علاوہ موشن لائٹس اور انتہائی حساس نوعیت کے آلات کا استعمال کیا گیا ہے۔"

"یہ سب میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں بچے!" میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ "مسلح سیکیورٹی گارڈز اس کے علاوہ ہیں۔ اب بتاؤ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں سیکیورٹی کیمروں کو ہیک کر سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "ادھر ادھر نصب مختلف سینسرز کو جام کر سکتا ہوں۔ الارم کی بولتی بھی بند کر سکتا ہوں...... بس!"

"یہ بھی بہت ہے۔" میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔ موشن لائٹس اور سیکیورٹی گارڈز کو چل دینا مجھے اچھے سے آتا ہے۔"

"مجھے اس کام کے لیے ایک پُرسکون جگہ چاہیے ہوگی۔" اس نے کہا۔

"جیسا کہ تمہارا ائرکنڈیشنڈ روم......؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"آپ غلط سمجھے مسٹر مارٹن!" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب تھا ہمیں کار کو کسی محفوظ مقام پر روکنا ہوگا تا کہ میں کسی کی مداخلت کے بغیر اطمینان سے اپنا کام کر سکوں۔"

"سوری بوائے!" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "وہ 'ائرکنڈیشنڈ روم' والی بات میں نے مذاق میں کی تھی۔"

"اٹس او کے مسٹر مارٹن!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اپنی اہلیت اور قابلیت کا لوہا منوانے کے لیے ایسی باتیں تو [illegible]"

اس نے مجھ پر ایک کاری ضرب لگائی تھی لیکن اب کی بار میں نے اسے کوئی چبھتا یا طنزیہ جواب نہیں دیا اور کسی محفوظ مقام کی تلاش میں کار آگے بڑھا دی۔

جیسا کہ میں نے بتایا، اس علاقے میں درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی لہٰذا جلد ہی مجھے اپنی مطلوبہ جگہ مل گئی۔ میں نے کار کو درختوں کے جھنڈ کے پیچھے پارک کیا اور کلوفی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ جگہ کیسی ہے؟"

"پرفیکٹ......!" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر کام سے لگ جاؤ۔" میں نے کہا۔

"مجھے جن فریکوئنسیز اور جی پی ایس کنکشن کی ضرورت تھی، وہ سب یہاں آسانی سے مل رہے ہیں۔" اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مسٹر مارٹن! مجھے یقین دلائیں کہ ہم کچھ بھی غیرقانونی نہیں کرنے جا رہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔"

"تمہارا مستقبل محفوظ اور روشن ہے بچے!" میں نے کلوفی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "اس بات کا یقین رکھو کہ اس فارم ہاؤس میں ایک غیرقانونی کام ہو رہا ہے اور ہم ان کے مذموم کاروبار کو بے نقاب کر کے قانون کی مدد کر رہے ہیں۔ اس وقت ہم قانون کے رکھوالے اور وہ کمبخت لزارس ایک خطرناک مجرم ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

"گاٹ اٹ!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ "اتنے فاصلے سے میں صرف آدھے گھنٹے کے لیے تمہیں سیف پیچ دے پاؤں گا۔ اسی مدت کے دوران میں تمہیں اپنا کام مکمل کر کے واپس آنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اتنی مہلت میرے لیے کافی سے زیادہ ہوگی۔ تم اپنا کام شروع کرو۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ اپنے گیجٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

کلوفی نے سیکیورٹی کیمروں اور مداخلت کاری کی نشاندہی کرنے والے آلات کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ اب بھی کوئی میری طرح کا بن بلایا مہمان یعنی مداخلت کار [illegible] کے نزدیک سے گزرتا تو الارم [illegible] سے تمام سیکیورٹی گارڈز ریڈ الرٹ ہو جاتے [illegible] ایسی کوئی وقت یا پریشانی نہیں تھی۔ مجھے صرف [illegible] لائٹس تھوڑے تھوڑے فاصلے پر [illegible]

کم مقدار میں تھیں جس کے نتیجے میں اردگرد کا ماحول روشن ہو جاتا تھا۔ "ہوپ فل بارکس" والوں نے اعلیٰ نسل کے کتوں کی فروخت کا بڑا معقول انتظام کر رکھا تھا جس کا لزارس ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔

سامنے کی نسبت پچھلی جانب سے فارم ہاؤس میں داخل ہونا زیادہ محفوظ تھا۔ میں تاریکی میں آگے بڑھتا گیا اور پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں فارم ہاؤس کی پچھلی دیوار تک پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں تک خیریت رہی تھی۔

اگلا مرحلہ فارم ہاؤس کے اندر داخل ہونے کا تھا۔

پچھلی دیوار خاصی موٹی اور مضبوط تھی۔ اس کی بلندی بھی آٹھ فٹ رہی ہوگی۔ جوانی کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا جب میں اتنی اونچی دیواروں کو بآسانی پھلانگ جایا کرتا تھا مگر اب بھی ایسا نہیں تھا کہ میں اس دیوار کی دوسری جانب نہ جا سکوں۔

میں نے اپنے گردوپیش میں نگاہ دوڑائی اور اچک کر دیوار کے کنارے کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ اس کے بعد میرے بازوؤں اور کمر کی کارکردگی کا امتحان تھا اور میرے یہ اعضا اس آزمائش میں کامیاب رہے۔ میں نے اپنے جسم کو دیوار کے اوپر پہنچایا اور اگلے ہی لمحے میں کسی بلی کے مانند فارم ہاؤس کے اندر کود گیا۔

اندر، باہر جیسا گھپ اندھیرا نہیں تھا بلکہ اندر کے ماحول میں ہلکا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں سنگی دیوار سے پیٹھ لگائے دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی اس سنگی دیوار نے مجھے کتوں والے پنجروں تک پہنچا دیا۔ ایسے ہی آہنی پنجرے میں نے اس خوبصورت خاتون اینجی ہیملٹن کے فارم ہاؤس میں بھی دیکھے تھے۔

میں خود کو درختوں اور دیوار کے درمیان چھپا کر نہایت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ایک ایک پنجرے میں بند کتوں کا جائزہ لینے لگا۔ دو منٹ کی کوشش کے بعد کامیابی نے میری قدم بوسی کی۔ ایک الگ تھلگ پنجرے میں وہ تینوں مجھے نظر آ گئے۔ میں نے اسٹار، پپّی اور بارلی کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

انہیں شاید دوسرے کتوں سے علیحدہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ کمینہ لزارس ایک آدھ روز میں ان کی ڈلیوری کسی امیر شخص کو دینے والا تھا۔

میں نے اپنے کیمرے کی فلیش لائٹ کو آف موڈ پر رکھ کر مختلف زاویوں سے ان تینوں اسمارٹ کتوں کی تصاویر بنا لیں۔ ہر تصویر میں وہ فارم ہاؤس کے پنجرے میں [illegible] بھی دکھائی دیتے تھے۔

میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب مزید وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کلوفی نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی تھی جس میں سے بیس منٹ گزر چکے تھے لہٰذا میں نے واپسی کی راہ لی۔

فارم ہاؤس سے واپس ٹاؤن کی طرف آتے ہوئے میں نے اپنی کار کا اسٹیئرنگ کلوفی کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ مجھے کئی ایک ضروری فون کرنا تھے جو ڈرائیونگ کے دوران ممکن نہیں تھے۔ جب ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو میں نے اپنا سیل فون سنبھال لیا اور یکے بعد دیگرے سٹی پولیس چیف، وارنر، بارکس اور [illegible] حسینہ اینجی کو علی الترتیب فون لگانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

میرے اور کلوفی کی کاوشوں نے بدذات لزارس کی کمینگی کا پردہ فاش کر دیا تھا۔ اس معاملے میں چونکہ پولیس شامل ہو گئی تھی اس لیے مین اسٹریم نیوز چینلز اور سوشل میڈیا نے خوب بڑھ چڑھ کر اس ایشو کو کوریج دی تھی جس کے نتیجے میں کلوفی اور میں ہیروز کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ پولیس نے اسٹار، پپّی اور بارلی کے علاوہ بعض دوسرے قیمتی کتوں کو بھی بازیاب کر کے ان کے مالکان کے حوالے کر دیا تھا۔

لزارس تمام ثبوتوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا لہٰذا اس کی بچت یا بچاؤ کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اس پر مقدمہ چلا اور ایک بھاری جرمانے کے علاوہ اسے آٹھ سال کی جیل بھی ہوئی۔ لزارس جیسے بدفطرت لوگوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے مسز اینجی ہیملٹن سے اپنی فیس وصول نہیں کی کیونکہ مسز ڈلی اور مسٹر فریڈی نے اپنے عزیز از جان کتوں پپّی اور بارلی کی بازیابی کی خوشی میں مجھے خاصی تگڑی رقم کے چیک دے دیے تھے۔ ایسے میں غریب اینجی کے [illegible] لوٹ لینا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

اسٹار کی تلاش کے دوران میں غیرمحسوس انداز میں مجھے کتوں سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ یہیں پر تھما نہیں بلکہ آنے والے دنوں میں میری یہ محبت کتوں سے ہوتے ہوئے کتوں والی تک جا پہنچی تھی۔

جی ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک ماہ کے اندر ہی میری اس جادوئی محبت نے اینجی ہیملٹن کو اینجی مارٹن بنا دیا ہے۔

xxx

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :9

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عیرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ نشینوں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

خطرناک آدمی ہے اور ضرور اقبال کی طرح یہ بھی کوئی بڑا کرمنل یا کسی بڑے ڈان کا حواری ہے۔"

"اس کے متعلق ہمارا ایک گمان یہ بھی ہے کہ یہ اقبال کا کوئی مخالف یا دشمن گروہ ہے جو ہماری مدد کی آڑ میں سہراب کو اپنے احسان تلے دباتے ہوئے اسے مستقبل میں اپنے مطلب کے لیے کیش کرسکتا ہے۔"

فوزیہ نے بھی راحیلہ کی بات کے تناظر میں یہ کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

"یہ بات میرے ذہن میں پہلے سے ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے لیے ابھی سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چھوٹا خان یا درپردہ اس کا کوئی باس اگر کچھ سوچے ہوئے بھی ہے تو اسے یہ علم ضرور ہوگا کہ میں بہرحال کوئی کرمنل نہیں ہوں اور نہ ہی قانون شکنی کرنا میرا کبھی مقصد رہا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اپنے مخالف گروہ کے سربراہ اقبال کی بیخ کنی کے سلسلے میں اگر میری وجہ سے اسے کوئی موقع ہاتھ آیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے کہ اس کی مدد لے لی جائے بلکہ وہ مدد میں لے ہی چکا ہوں۔"

القصہ — میں نے چھوٹا خان سے فون پر رابطہ کیا۔ اس نے مجھے نمبر دے رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ملتان میں رہتا ہے اور کراچی میں بھی اس کی سکونت رہتی ہے۔ یہ سیل فون نمبر اس کی کراچی والی کسی رہائش گاہ کا تھا۔ دوسری طرف جانے والی تیسری بیل پر کسی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو!" ایک سپاٹ سی مردانہ آواز دوسری جانب سے ابھری تھی۔

"چھوٹا خان سے بات ہوسکتی ہے؟" میں نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔

"تم کون ہو بابا؟" دوسری جانب سے بھی اسی لہجے میں پوچھا گیا۔

"میرا نام سہراب ہے اور چھوٹا خان میرا دوست ہے۔"

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ دوسری جانب اچانک تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری رہی پھر جب دوبارہ وہ شخص بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ یا رعب دار ہونے کے بجائے ایک دم خفیف سا ہوگیا اور فوراً بولا۔

"اچھا، اچھا — سہراب سائیں! میں پہچان گیا آپ کو — سائیں چھوٹا خان نے مجھے تمہارے بارے میں بتا رکھا تھا کہ جیسے ہی تمہارا کوئی فون آئے، انہیں اطلاع کردوں۔ بس تسلی کے لیے مجھے فقط اتنا بتادو کہ کیا آپ وہی سہراب علی خان ہو جسے سائیں [illegible] ضمانت پر رہا کروایا تھا؟"

"میں وہی ہوں سائیں!" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ اس کی تسلی ہوگئی تو وہ بولا۔

"بہترین ہوگیا۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے سائیں کہ میری تسلی ہوگئی۔ اب بات یہ ہے کہ وہ تو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں لیکن انہوں نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی سہراب کا کوئی فون آئے، انہیں خبر کردوں۔ آپ اپنا نمبر بتادیں جہاں سے فون کررہے ہو۔ وہ آئیں گے تو خود ہی آپ سے رابطہ کرلیں گے۔"

میں نے اسے یہاں کا نمبر بتادیا اور یہ بھی کہ میں زیادہ دیر اس نمبر پر نہیں مل سکوں گا۔ اس شخص نے اپنا نام عطا دتا بتایا تھا۔

"بہترین ہوگیا سائیں!" وہ بولا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

سدرہ اسی رات دس بجے والی ٹرین میں فوزیہ کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوگئی۔ مجھے ابھی آپا شگفتہ اور اس کی بیٹی نگہت کی تھوڑی بہت جاسوسی کرنا تھی۔

راحیلہ اور فوزیہ میرے کراچی نہ جانے پر فکرمند ہوگئی تھیں۔ مجھے چھوٹا خان کے فون کا بھی انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ آئے گا، عطا دتا کے ذریعے اسے میرا پیغام ملے گا تو وہ فوراً مجھ سے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

رات دس بجتے ہی میں گھر سے باہر نکل آیا۔ قریب ہی دودھ والے کی دکان تھی۔ وہاں لوگ ٹھنڈی گھونٹ والی بوتلوں کا دودھ پیتے یا بیٹھی لسی۔ میں بھی اسی طرف چلا گیا۔ وہاں گاہکوں کا رش دیکھنے میں آرہا تھا۔ زیادہ تر تعداد نوجوانوں کی تھی۔ مختصر سے احاطے میں بھی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ باقی لوگ کھڑے کھڑے دودھ یا لسی پینے میں مشغول تھے۔ چند لوگ بائیک پر بھی تھے اور ان کے ہمراہ کوئی خاتون یا لڑکی بھی ہوتی۔

میں نے بھی دودھ کی بوتل لے لی اور کھڑے ہوکر پینے لگا۔ یہاں سے مجھے آپا شگفتہ کے گھر کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ دروازے والی دیوار دوسری جانب تھی لیکن اگر کوئی وہاں آتا جاتا تو مجھے نظر آجاتا جبکہ دروازے پر کھڑا کوئی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

اچانک ایک بائیک بھوں — بھوں کرتی آئی [illegible]

دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ یہ وہی نوجوان لڑکا تھا جسے میں نے آج تقریباً سہ پہر میں دیکھا تھا۔ وہ سیدھا اسی مکان کے سامنے جاکر رکا اور دو بار مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔

میں دودھ کی بوتل پیتے ہوئے اسی سمت تکتا رہا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ لڑکی اندر سے برآمد ہوئی۔ اس نے اب کے نقاب نہیں پہنا ہوا تھا۔ ایک چادر سی ضرور اوڑھ رکھی تھی۔ وہ اسی پھرتی اور چابکدستی سے اچھل کر اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی جیسا کہ میں اس کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ یہ دونوں کسی فائٹ کلب کے ممبر ہوسکتے ہیں کیونکہ ایک بڑی اور نامعلوم تربیت گاہ کا میں بھی ممبر رہ چکا تھا۔ بھلا ایسی باتیں میں کیسے دوسروں میں فوری طور پر محسوس نہیں کرلیتا۔

میری دودھ کی بوتل ختم ہوگئی۔ بختیارے کی دی ہوئی پرانے ماڈل کی کرولا کار کی چابی میری جیب میں تھی۔ میرا ارادہ ان کے تعاقب میں جانے کا ہوا۔ ابھی میں دوڑ کر گھر کے سامنے کھڑی کار میں سوار ہونے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ انہیں ادھر ہی آتے دیکھ کر پرسکون ہوگیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں یہاں لسی یا دودھ پینے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ان کی جانب سے نظریں ہٹا کر ایک عدد میٹھی لسی کے گلاس کا بھی آرڈر دے دیا۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے میرے قریب آکر رک گئے۔ لڑکے نے ایک دو بار بلاوجہ شوخی میں بائیک کے ایکسلریٹر کو زور سے "بھوں — بھوں" کیا اور سوئچ آف کردیا۔ دونوں بائیک سے اتر گئے۔

میں نے بظاہر سرسری نظر ان پر ڈالی اور دودھ والے سے لسی کا گلاس لے لیا۔

لڑکے نے بائیک کو سائڈ اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور لڑکی اس پر تنک کر بیٹھ گئی۔ لڑکے نے دودھ والے کو ہانک لگائی۔

"چودھری صاحب! دو گلاس میٹھی لسی۔"

"ابھی حاضر کرتا ہوں۔" اونچے تخت پر بڑا سا چوبی گڑوا رکھے ایک پہلوان نما لنگی پہنے شخص نے کہا اور پھر لسی گھوٹنا شروع کردی۔

میں بظاہر ان دونوں سے لاتعلق اور دانستہ لسی کے گلاس سے آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا کہ یہ جلدی ختم نہ ہوجائے۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ لڑکی بائیک کی گدی پر بیٹھی رہی اور لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم امی جان کی فکر نہ کرو وسیم [illegible] ذرا —" لڑکی نے کہتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔ وہ بہت آہستہ باتیں کررہے تھے۔ میں ان سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر لاتعلق سا کھڑا گلاس ہلا ہلا کر پی رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا، جب تمہارے بابا کا تم دونوں ماں بیٹی کی زندگی میں کوئی دخل ہی نہیں تو پھر آخر تمہیں کیوں ان کی اتنی فکر ستاتی ہے؟" لڑکے نے جس کا نام وسیم معلوم ہوا، قدرے جھلا کر کہا۔

"یہ تعلق — کیسے نہیں ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "امی جان سے نہیں تو یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ میرے تو وہ بہرحال بابا ہیں اور رہیں گے۔ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں نہ میں انہیں بھلا سکی ہوں۔"

"تو کیا انہیں انٹرویو دینے کے لیے مجھے کراچی جانا پڑے گا؟" لڑکے نے کہا تو لڑکی ہنس دی۔ اسی وقت انہیں لسی کے دو گلاس تھمادیے گئے۔ دونوں نے چند گھونٹ بھرے۔ اس دوران ایک وقت دونوں نے میری جانب بھی دیکھا تھا اور میں فوراً ان سے نظریں ہٹا کر اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ارے نہیں بابا! میں نے بتایا تو تھا تمہیں۔ بابا صرف مجھ سے ملنے کے لیے اتنی دور کا سفر کرکے آتے ہیں۔ کبھی اپنے کسی آدمی کو بھیج دیتے ہیں میری خیر خیریت کے لیے — اور کچھ رقم بھی دینے کے لیے۔"

"تمہاری امی جان کو اقبال چوک والے بنگلے کا علم ہے جہاں تم دونوں باپ بیٹی کی ملاقات ہوتی ہے؟"

"بالکل ہے۔ انہیں سب معلوم ہے مگر وہ باپ بیٹی کی محبت کے درمیان حائل ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔ امی جان کی یہ بات مجھے بے حد پسند ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ مجھے اقبال چوک والے بنگلے میں ہی انٹرویو دینا ہوگا؟"

"یہ تم نے کیا انٹرویو — انٹرویو کی رٹ لگا رکھی ہے؟" لڑکی مصنوعی خفگی سے بولی۔

اسی وقت تین اوباش سے لڑکے دو بائیکس پر وہاں آپہنچے۔ ایک نے لڑکی پر کوئی جملہ کسا۔ تینوں اتر گئے۔ وسیم نامی لڑکا طیش میں آگیا۔ لڑکی نے اسے پنگا لینے سے منع کردیا۔ بظاہر معاملہ ٹھنڈا ہوگیا۔ ان تینوں لڑکوں نے لسی اور دودھ کا آرڈر دیتے ہوئے پھر لڑکی پر جملہ کسا۔ اس بار بہت ہی گھٹیا اور بے ہودہ جملہ تھا جسے سن کر وسیم ہی نہیں، اس کی دوست لڑکی بھی بری طرح طیش میں آگئی۔

"تم ٹھہرو وسیم! [illegible]" لڑکی نے غصے سے دانت پیستے

ہوئے کہا اور میری نظروں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ لڑکی نے لسی کا گلاس اپنے دوست کو تھمایا اور چادر اتار کر اسے گھما کر رول کرتے ہوئے اپنی کمر پر بیلٹ کی طرح کس لیا۔

تب ہی میں نے دیکھا وہ اندر سے خاصی چست پینٹ اور اسی طرح کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ ایسے میں وہ مزید اسمارٹ اور خوبرو نظر آ رہی تھی۔

وہ ان تینوں اوباشوں کے قریب گئی اور پھر اگلے ہی لمحے پھرتی ہی تھیں، دکان پر کھڑے لوگوں کی بھی آنکھیں پھیل گئیں۔ لڑکی نے رائٹ کک کو اسی طرح گھما کر ایک اوباش لڑکے کے سینے پر رسید کیا کہ وہ اچھل کر سڑک پر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے اس پر حملہ کرنا چاہا تو وہ لڑکی دوسری ٹانگ پر گھومی اور رائٹ کک کی ضرب اس کی پسلیوں میں رسید کر ڈالی۔ دوسرے اوباش لڑکے کے منہ سے اوغ کی کریہہ آواز خارج ہوئی اور تیسرے نے دودھ کی بوتل پھینکی اور بائیک کی جانب دوڑا۔

''ارے رے ۔۔۔۔ رے ۔۔۔۔ اب کہاں جا رہے ہو۔ ساری شوخی نکل گئی ایک زنانی کی مار سے۔'' وسیم نامی لڑکا چہک کر بولا۔ ''ابھی تو میں نے ہاتھ نہیں دکھایا۔''

باقی دو مضروب لڑکوں نے بھی وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔

''انہوں نے غلط جوڑے سے پنگا لے لیا۔ اب انہیں کون بتاتا کہ اپنے وسیم بادا اور نزہت بی بی کیا شے ہیں۔'' پہلوان دودھ والے نے بھی ہانک لگائی۔ لوگ ستائشی نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھنے لگے۔

دودھ والا کسی کو بتا رہا تھا کہ یہ نوجوان جوڑا کراٹے کلب کا ممبر ہے۔ یہ آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی جبکہ میری مشتاق اور کھوجی نظروں نے پہلے ہی ان کی چال کی چابک دستی سے یہ بات تاڑ لی تھی کہ وہ دونوں عام لڑکا لڑکی نہیں ہیں۔

وہ دونوں ایک بار پھر آرام سے لسی پینے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میری لسی کا گلاس ختم ہو چکا تھا لیکن میں ابھی ان دونوں کی مزید باتیں سننے کو بے قرار تھا مگر مجبوری تھی اسی لیے میں نے بل دیا، گلاس رکھا اور پلٹ گیا۔

رات کی تاریکی میں گلی کی سڑک سنسان ہونے لگی تھی۔ میں ذرا آگے جا کر ایک [illegible] اسی دکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

[illegible] سدرہ کا۔ لڑکا اور لڑکی کے نام مجھے معلوم ہو چکے تھے۔ دیکھا جاتا تو ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ آیا نزہت لڑکی وسیم [illegible] اقبال کی بیٹی ہی ہے یا کوئی اور۔

دفعتاً بائیک کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں تاریک گوشے میں دبکا رہا۔ وہ دونوں گھر کی طرف آ رہے تھے۔ میرے قریب سے گزرے ہی تھے کہ بائیک کا انجن بند ہو گیا۔ نزہت اتر گئی۔ اس کا گھر قریب تھا۔ وسیم کک مار مار کر بائیک کو اسٹارٹ کرنے لگا مگر بائیک نے اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہ لیا۔

''اوہ ۔۔۔۔ یہ کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔'' وسیم نے جھنجلا کر بائیک کو کوسا۔

''او کے، نزہت! تم جاؤ۔ کوئی تار وار ڈھیلا ہو گا، میں دیکھ لوں گا۔'' وسیم نے اس سے کہا۔

''نہیں، تم دیکھ لو کیا پتا کسی شے کی ضرورت پڑ جائے تمہیں۔'' نزہت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ دونوں میں پیار نظر آتا تھا۔ میں ابھی تک تاریک گوشے میں کھڑا تھا، اگر غور سے اس طرف دیکھتے تو میرا ہیولا انہیں نظر آ جاتا۔

مجھے ایک بار پھر امید ہو چلی تھی کہ شاید میرے مطلب کی کوئی بات کریں مگر بائیک ۔۔۔۔۔۔ کے علاوہ اور کوئی موضوع اب ان کے پاس نہ رہا تھا۔

بالآخر میں کچھ سوچ کر ان کی مدد کے لیے تاریک گوشے سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔

''میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟''

مجھے اچانک سامنے سے نمودار ہوتے دیکھ کر دونوں ہی چونک کر میری جانب متوجہ ہوئے۔

''آپ کی تعریف؟'' وسیم نے خشک لہجے میں مجھ سے کہا۔ نزہت بڑے غور اور تیز نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا قد وسیم سے نکلتا ہوا تھا اور ڈیل ڈول بھی اس سے سوا ہی تھا۔ پینٹ شرٹ اور پیروں میں جوگر ٹائپ بوٹ میں نے بھی چڑھا رکھے تھے۔

''تم وہی تو نہیں جو ابھی کچھ دیر پہلے پہلوان کی دکان پر ...''

''میں وہی ہوں۔'' میں نے نزہت کی بات کاٹ کر جواب میں کہا۔

''تم یہاں کھڑے کیا کر رہے تھے؟'' اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''لو بھئی، بریار گناہ لازم ۔۔۔۔ آپ نے تو الٹا مجھ سے ہی سوال جواب کرنا شروع کر دیے۔ معاف کرنا، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں اپنا راستہ لیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں جانے [illegible] اچانک عقب سے [illegible]

''اے مسٹر! ٹھہر جاؤ۔''

[illegible] میں مجھے پکارا۔ میں رک گیا مگر اس کی جانب پلٹنے کی [illegible] نزہت کو وسیم سے کہتے سنا۔ [illegible] ہمارے مکان کی جاسوسی کر رہا ہے۔'' [illegible]

''ادھر آؤ ۔۔۔۔'' وسیم کا لہجہ تحکمانہ اور خاصا اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، ان کی جانب گھوما اور اسی طرح دوسری جانب منہ کیے بولا۔

''میں آگے بڑھے ہوئے قدم پیچھے نہیں اٹھاتا اور پیچھے آواز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو کہنا ہے ادھر آ کر اور میرے سامنے کھڑے ہو کر بولو۔ میں صرف تین سیکنڈ تک تمہارے آنے کا انتظار کروں گا۔''

[illegible] ہے۔ ورنہ کس کی جرأت ہے ہمیں للکارنے کی۔'' نزہت نے پھر وسیم سے کھسر پھسر کی۔

ٹھیک اسی وقت کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس سے تاریک سڑک کا یہ گوشہ چندھیانے لگا۔ [illegible] ایک جیپ تیزی سے ایک موڑ کاٹ کر آئی اور اس کے ٹائر چرچرائے۔

میں نے دیکھا۔ اس میں سوار چار تنومند لڑکے ٹن چکو پکڑے اور ہاتھوں میں کلپ لگائے کود کر نیچے اترے۔ میں گھوم گیا۔ جیپ وسیم اور نزہت کے قریب کھڑی تھی۔ ان چاروں نے آناً فاناً ان دونوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

میں نے دیکھا، وسیم اور نزہت بھی ایک لمحے کو پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا دونوں سے کوئی پرانا ''حساب کتاب'' چل رہا تھا جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے نزہت نے وسیم سے میرے بارے میں کہا تھا کہ یہ بھی کا آدمی لگتا ہے۔

بہرکیف، میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ میں ان سب سے چند قدموں کے فاصلے پر اب ان کی جانب رخ کیے دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔

لڑکوں میں ایک نسبتاً قدآور اور کسرتی جسم کے مالک لڑکے نے میری جانب ہانک لگاتے ہوئے چنگھاڑ کر کہا۔

''اوئے، تو جا یہاں سے ۔۔۔۔ پرائے جھگڑے میں بلاوجہ رگڑا جائے گا۔''

''نہیں، میں تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وہیں کھڑے کھڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اوئے تیری تو ۔۔۔۔'' وہی لیڈر نما لڑکا ٹن چکو گھماتا ہوا میری جانب بڑھا۔

''[illegible] دونوں پر نظر رکھو، پہلے میں اس تاریک گلی کے لاٹ صاحب کو نمٹا لوں۔''

مجھے کہتے والی گالی نے پیچھے سے اوپر تک بری طرح جلا کر رکھ دیا۔

وہ تیزی اور مہارت سے ٹن چکو گھماتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا اور میں اسی طرح اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھے مطمئن انداز میں ٹانگیں پھیلائے کھڑا رہا اور پھر جیسے ہی وہ قریب آیا اور اس نے ٹن چکو کا وار مجھ پر کیا تو میں نے کھڑے کھڑے فقط اپنی ایک ٹانگ اس مہارت سے بلند کر کے اس کے گردش کرتے ٹن چکو میں اڑا دی کہ وہ زنجیر سمیت میری ٹانگ میں لپٹ گیا۔

مجھے ٹن چکو کی زنجیر کی جکڑن سے تکلیف تو پہنچی تھی مگر وہ اس تکلیف سے زیادہ نہ تھی جو کہتے والی گالی سے مجھے پہنچی تھی۔ میں نے اپنی ٹانگ کو ایک جھٹکا دیا اور ٹن چکو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میری ٹانگ میں لپٹا رہ گیا۔ میں نے ابھی تک اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں سے نہیں ہٹائے تھے۔

لیڈر لڑکے کی ہی نہیں بلکہ وسیم اور نزہت سمیت اس کے باقی تینوں جنگجو نظر آنے والے ساتھیوں کے چہروں پر حیرت اور کچھ ''دلچسپی'' سی لہرائی تھی۔

''میں تم جیسے آوارہ اور سڑک چھاپ کتوں سے اپنے ہاتھ گندے کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ انہیں صرف لاتوں سے ہانکا جاتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے ٹن چکو سے لپٹی ہوئی ٹانگ کو پھر اٹھایا۔ ایک لمحہ ہکا بکا سے کھڑے لیڈر لڑکے کے چہرے کے سامنے چند سیکنڈ تک کچھ انچ فاصلے پر کیے رکھا اور پھر اسی سے اس کے سینے، گردن اور چہرے پر بجلی کی سی تیزی سے ضربات رسید کرتا چلا گیا۔ ہاتھوں سے چلانے والے ٹن چکو کو میں صرف ایک ٹانگ سے چلا رہا تھا اور یہ مظاہرہ ان متوقع فائٹر کلب کے ممبران کے لیے نیا ہی تھا۔

یوں ٹن چکو کے دونوں موٹے اور لمبے دستے تالیاں پیٹتے اس کی تواضع کرتے رہے اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے بہتیرے جتن کرتا رہا مگر میرے اندر تو جیسے پارہ دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔

اپنے لیڈر کا یہ حشر دیکھ کر اس کے باقی تینوں ساتھی اپنے ''اصل'' دشمنوں (وسیم اور نزہت) کو بھلا کر میری جانب لپکے ہی تھے کہ تب وسیم اور نزہت بھی ایک وقت میری مدد کو حرکت میں آئے اور پھر اچھا خاصا جنگ کا سماں طاری ہو گیا۔

اردگرد کے گھروں سے کچھ لوگ نکل آئے اور تب ہی اچانک پولیس سائرن کی آواز ابھری۔ شاید کوئی گشتی پولیس [illegible]

میں سمجھ گیا کہ تجمت اپنے اسی اقبال چوک والے بنگلے کا رخ کیے ہوئے تھی جس کے بارے میں اس نے اپنے دوست وسیم کو بتا رکھا تھا اور جہاں وہ اپنے باپ سے ملنے آتی تھی، جب وہ کراچی سے سیالکوٹ آتا تھا۔

تجمت کو متوقع طور پر یہاں کا رخ کرتے دیکھ کر میرے دل میں اچانک ایک خیال ابھرا کہ کہیں اقبال کراچی سے آیا ہوا تو نہیں ہے؟ اگر ایسا تھا تو میں ادھر ہی اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا لیکن پہلے اس کے لیے ضروری تھا کہ اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ آیا یہ وہی ''گینگسٹر'' اقبال باس تھا یا کوئی اور اقبال تھا۔

یہاں کی گلیاں چوڑی تھیں۔ اردگرد چھوٹے بڑے مکانات اور خوبصورت بنگلے بھی بنے ہوئے تھے۔ رکشا آخری سرے والے بنگلے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ نیچے اتری، کرایہ ادا کیا اور بڑے سے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

میں کار کو آگے لے گیا اور ایک درخت کے نیچے کھڑی کر کے نیچے اتر آیا۔ گردوپیش کا جائزہ لیا۔ چند ہی لوگ آتے جاتے دکھائی دیے۔ کچھ اور کاریں بھی بنگلوں کے اندر باہر کھڑی تھیں۔ میں مذکورہ بنگلے کی طرف چل دیا۔

تجمت اندر داخل ہو چکی تھی۔ میں نے سامنے سے گزرتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں بنگلے کی طرف دیکھا اور اس کا نمبر وغیرہ ذہن نشین کر لیا۔ بنگلا ایک منزلہ تھا یعنی ون یونٹ تھا۔ سرخ اور سفید رنگ اور آگے پھلواری سی بنی ہوئی تھی۔ بمشکل چار پانچ کنال کا ہی لگا۔

میں آگے نکل گیا۔ اس کے بعد ایک گلی میں گھوما۔ یہ نسبتاً تنگ گلی تھی۔ وہاں سے گزرتا ہوا میں دوسری جانب آیا تو یہ بنگلوں کے پچھواڑے کی گلی تھی جسے عرف عام میں ''گندی گلی'' کہا جاتا ہے۔ اس طرف سیلن اور تھوڑا بہت سیوریج کا پانی بھی جمع تھا۔

میں مطلوبہ بنگلے کی عقبی دیوار کے قریب آ گیا۔ دن کا وقت تھا۔ رات ہوتی تو میں نقب لگانے کی کوشش کرتا مگر ارادہ اب بھی میرا ایسا ہی تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا کہ اندر کیسے داخل ہوا جائے کیونکہ میرا اندر جا کر سن گن لینا از حد ضروری تھا۔

میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ سامنے کے مکان والے کمرے کی کھڑکی سے کوئی مجھے دیکھ کر یا دیوار پھلانگنے کی کوشش میں شک میں پڑ کر شور مچا دیتا تو [illegible] مطلع [illegible]

اسی لیے میں عام راہ گیر کی طرح چلتا ہوا دوسری جانب بڑھا تو اچانک بنگلے کی عقبی دیوار کے بیچ گلی دکھائی دی۔ میں بغیر سوچے سمجھے اس میں گھس گیا۔ یہاں مجھے ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ حقیقتاً وہ کھڑکی نہیں در حقیقت ایک سنگل پٹ والے دروازے کی تھی۔ باہر کی نسبت اس گلیاری میں، میں محفوظ تھا۔ یہ سنگل پٹ کا دروازہ کھولنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اندر سے بند تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ تالا بھی لگا ہو۔ میں نے اس کی لاک والی جگہ پر جیب سے ایک سوا نکال کر زور آزمائی شروع کر دی۔

اس سے ابھی خاصی کھڑبڑ کی آواز ابھری تو میں ایک محتاط اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ بنگلے کا بعید ترین گوشہ ہوگا۔ کسی کا کم ہی اس طرف آنا ہو سکتا تھا۔ باقی باہر والے میری یہ ''کارروائی'' دیکھنے سے قاصر ہی تھے۔ اس طرف دیکھنے کے لیے اول تو ان کا دھیان کم ہی جاتا ہوتا بھی تو انہیں گردن گھمانا پڑتی۔ پھر یہ گھر کے ساتھ والی عام مستعمل گلیاری تھی جہاں گھر کا مکین ہی کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں دروازہ کھول کر اس کا لاک بیکار کر چکا تھا مگر اس طرح کہ دوبارہ اسے صحیح حالت میں فٹ کر دوں۔

دھڑکتے دل سے میں اندر داخل ہوا تو ہلکی ہلکی تاریکی پڑ رہی تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے دوبارہ بند کر دیا۔ اب میں ایک اسٹور کے اندر موجود تھا۔

میں نے سب سے پہلے لاک اور کھانچا درست کر کے دوبارہ لگا دیا۔ باہر سے کنڈی یوں بھی نہیں لگی ہوئی تھی اور اس کی ضرورت بھی شاید نہیں سمجھی گئی تھی کیونکہ دروازہ اندر ہی لاک تھا۔ تالا بھی درمیانہ اور زنگ آلود نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا عرصے سے اسے کھولا ہی نہ گیا ہو۔

بہرحال، میں نے بند تالے سمیت کنڈی لگا دی۔ قبضہ درست کیا اور پھر اندر کھلنے والے دروازے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس سے کان چپکا کر دوسری جانب کی سن گن لی۔ دوسری جانب گہرا سکوت تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ وہ اندر کی جانب کھلا۔ شکر ہے کہ اسے باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ہوتی بھی تو میں کوئی نہ کوئی تدبیر اس کی بھی کر ہی لیتا۔

میں ایک کھلے ہال میں تھا۔ یہ لاؤنج کے ساتھ ہی محسوس ہوا۔ دائیں بائیں اور سامنے کے رخ پر کمروں کے دروازے اور برآمدہ تھا۔ ایک کمرے سے باہر [illegible]

جب تجمت اس بنگلے کے بارے میں اپنے دوست وسیم کو بتا رہی تھی تو مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ بنگلا زیادہ تر خالی ہی پڑا رہتا ہے یا کوئی ایک آدھ نوکر یا چوکیدار ہوتا ہو۔

یقیناً اس وقت بھی اسی وجہ سے سناٹا اور خالی پن تھا۔

برآمدے کے ایک بڑے ستون کی جانب کھسک کر میں مذکورہ کمرے کی کھڑکی کے قریب آن کھڑا ہوا۔ یوں کہ اگر کوئی بیرونی دروازے یا اندر سے برآمد ہوتا تو میں آڑ میں چھپ جاتا کیونکہ میرے عقب میں اوپر جانے والے زینے کا ایک خلا تھا۔

''انکل! میں نے بتایا تھا آپ کو کہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔'' کان لگانے پر مجھے اسی لڑکی تجمت کی آواز سنائی دی۔ ''یہ جوجی کے بدمعاش لڑکوں کی شرارت تھی۔ اس کے باوجود پولیس وسیم کو بھی ان کے ساتھ گرفتار کر کے لے گئی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کبیر کو وسیم نے یا میں نے بالکل بھی نہیں مارا تھا۔ وہ تو کوئی اجنبی لڑکا تھا، ہماری ہی عمر کا۔ کبیر نے سب سے پہلے اسے للکارا تو وہ غصے میں آ گیا۔''

''وہ نوجوان کون تھا؟'' ایک مردانہ بھاری آواز آئی۔

''پتا نہیں کون تھا۔ پہلے تو ہم اسے جوجی کا آدمی ہی سمجھے تھے مگر ہم سے شاید غلطی ہوئی۔ وہ تو ہمارے لیے نیک ثابت ہوا تھا۔ اسی نے کبیر کی ٹھکائی لگائی۔''

''کیا پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا؟'' مردانہ آواز آئی۔

''نہیں۔ وہ نہ جانے اچانک کس طرف کھسک گیا تھا۔'' میں مردانہ آواز پر غور کرنے لگا جو مجھے کسی طور بھی شناسا نہیں معلوم ہوئی تھی۔ لڑکی اس مرد کو ''انکل'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

میں ابھی ان کی گفتگو سننے کی کوشش میں تھا۔ اندر جھانکنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے وہ جوجی کا ہی آدمی ہو۔''

''ہرگز نہیں انکل! اگر وہ جوجی کا آدمی ہوتا تو ان کے ساتھی کبیر کا اس قدر برا حشر نہ کرتا۔ نہ ہی کبیر اس سے جا بھڑتا۔ انکل! مجھے اس وقت وسیم کی فکر ہو رہی ہے۔ پلیز! اس کے لیے کچھ کریں یا پھر پاپا کو انفارم کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کچھ کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! ابھی دونوں چلتے ہیں اور متعلقہ تھانے جا کر معلوم کرتے ہیں۔ آؤ۔''

مرد نے کہا پھر اندر خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں شاید کمرے [illegible]

اپنے سابقہ راستے کی جانب کھسک گیا۔ اس کے بعد وہاں سے باہر آ گیا۔

میری کار کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس میں سوار ہوا۔ اسے تیزی سے گھما کر بنگلے کی طرف لایا تو اندر سے بھی ایک [illegible] ماڈل کی کار باہر نکل کر شاہراہ کی جانب مڑ رہی تھی۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں تجمت کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اسٹیئرنگ پر ایک درمیانی عمر کا شخص موجود تھا۔

میری کوشش تھی کہ تجمت کی نگاہ مجھ پر نہ پڑنے پائے ورنہ وسیم تو نہیں البتہ تجمت مجھے پہچان سکتی تھی۔

میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے ایک تھانے جا پہنچا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ میں باہر ہی ذرا فاصلے پر ایک گیراج کے پاس اپنی کار لے گیا اور بظاہر کار ٹھیک کروانے لگا۔

پرانی کار تھی اسی لیے چھوٹی موٹی خرابی مکینک حضرات نے نکال ہی لی اور میں نے اسے مرمت کی اجازت دے دی اور خود بھی کھڑا ہو کر کار کی مرمت ہوتے دیکھنے لگا لیکن میرا دھیان تھانے کی عمارت کی طرف تھا۔

وسیم اور ان لڑکوں کو ادھر ہی لایا گیا ہوگا اسی لیے انہوں نے یہاں کا رخ کیا تھا۔

ان دونوں کو واپس نکلنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا اور اتنا ہی مکینک نے میری کار کی جزوی مرمت کرنے میں لگایا۔ میں نے اسے پیسے ادا کیے اور کار اسٹارٹ کر کے دوبارہ ان کے تعاقب میں لگ گیا۔

کار میں اب بھی وہ دونوں ہی موجود تھے۔ وسیم ان کے ہمراہ نہیں تھا۔ شاید وہ اس کی ضمانت نہیں کروا پائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ دونوں دوبارہ بنگلے کا رخ کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ واپسی کے سفر پر جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا رخ کسی اور طرف تھا۔

معروف شاہراہوں سے گزرنے کے بعد ان کی کار مضافات کی جانب گامزن ہو گئی۔

''نہ جانے اب یہ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ اور نظریں ونڈ اسکرین پر جمائے رکھتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر خود کلامی کی۔

اس روٹ پر دیگر مسافر گاڑیوں کی آمد و رفت بھی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ دس، بارہ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کی کار دائیں جانب کے ایک کچے کے علاقے میں اتر گئی۔

[illegible]

نے سوال کیا۔
"مجھے افسوس ہے، ان حملہ آوروں نے انہیں ہلاک کر ڈالا ہے۔"
"او میرے خدا......" وہ فوراً بے حال ہو گئی۔
"ان کی لاش باہر زمین پر پڑی ہے۔ خود تمہیں بھی طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑسکتا۔" میں نے گو مگو کے لہجے میں کہا۔
"میں خود کو سنبھال لوں گی۔ تمہارا شکریہ۔" وہ بولی۔
"میں جانتی ہوں تم پولیس کا سامنا کیوں نہیں کرنا چاہتے۔ اس رات بھی تم خاموشی سے کھسک گئے تھے۔" وہ پھر اشتباہ آمیز لہجے میں بولی۔
"مسٹر لکی! میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ اس رات جو اتفاق ہوا سو ہوا لیکن آج بھی ایسا ہی کچھ اتفاق ہوا تھا۔ افسوس کہ مجھے دیر ہو گئی لیکن مزید دیر ہو جاتی تو وہ ڈاکو تمہاری کار سمیت تمہیں بھی ساتھ لے جاتے۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش لے جا چکے تھے۔"
تب اس نے غور سے اندر کا جائزہ لیا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کی کار نہیں ہے جس میں بیٹھ کر وہ یہاں تک اپنے انکل کے ساتھ آئی تھی اور ڈاکوؤں کے نرغے میں پھنس گئی تھی۔
"یہ تمہاری کار ہے؟"
"ہاں۔"
"مجھے میرے گھر اتار دو۔"
"لاش کا کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔
وہ سوچنے لگی پھر بولی۔ "تب تم مجھے گھر کے بجائے انکل والے بنگلے میں ہی لے چلو۔ اقبال چوک میں ہے۔ وہاں ان کے دو اور ساتھی موجود ہیں۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔"
ایسے نازک وقت میں مجھے اس کی تجویز بظاہر مناسب لگی۔ کچھ سوچ کر میں نے ہامی بھر لی۔
اس کے بعد میں نے انکل کی لاش اٹھا کر ڈکی میں ڈال دی پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے تھوڑی ریورس کی پھر واپسی کی راہ لی۔
"کیا یہ لوگ تمہارے کوئی دشمن تھے یا پھر میرے اندازے کے مطابق کوئی راہزن؟" میں نے کار مناسب رفتار میں واپسی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"راہزن تھے۔" وہ مختصراً بولی۔ میری جانب سے اس کا شک دور نہ ہوسکا تھا۔ وہ بولی۔
"تم ہمارا کب سے تعاقب کر رہے تھے اور کیوں؟"
"خاصی [illegible]

ڈالا۔" میں مسکرا کر بولا۔ میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔
"تم ہو کون؟ ہمارے دشمنوں کے ساتھی بھی نہیں لگتے۔ ہمارے پیچھے بھی لگے ہوئے ہو۔ وہ اتفاقات ایسے بھی متواتر کبھی نہیں ہو سکتے۔"
"میں تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔" میں نے [illegible] سے کہا۔
"کیوں؟"
"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"
"بکواس نہیں مسٹر......"
"سہراب......!" میں نے اسے اپنا نام بتا دیا۔
"جو بھی ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ کون ہو اور کیوں میری جاسوسی کر رہے ہو؟"
"یہ بتاؤ، بیگم کا کیا بنا؟" میں نے موضوع بدلا۔ "اس رات پولیس جوجی کے بدمعاشوں کے ساتھ تمہیں بھی گرفتار کر کے لے گئی تھی؟"
"اوہو...... میرا خیال ہے پھر تم جوجی کے مخالف گروپ کے ساتھی ہو۔ تم نے اس کے اہم آدمی کی مخبری کی تھی۔"
"میں نے کہا نا خاصی ذہین ہو تم، ٹھیک سمجھیں۔ میں نے اندھیرے میں چلنے والے تیر کو اسی کی کمان سے چلنے دینے میں کوئی عار نہیں سمجھا کیونکہ ابھی میں اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا نہ ہی مقصد...... ابھی میں تم اور تیل کی دھار کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔"
"خوب، تو پھر ہم دوست ہوئے۔ خواہ مطلب پرست ہی سہی۔" وہ بولی۔ اس کے ساتھ ہی کراہی۔ "آہ......"
"کیا ہوا؟" میں پریشان ہو گیا اور ذرا گردن موڑ کر چند سیکنڈز کے لیے عقبی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا زخمی بازو سہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"درد ہو رہا ہے۔"
"بیکار راستہ ہے۔ گاڑی جھٹکے کھا رہی ہے حالانکہ میں نے رفتار کم ہی رکھی ہوئی ہے۔"
"تم جوجی کے کون سے مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہو؟" اس نے تھوڑا سستانے کے بعد پھر پوچھا۔
"یہ غیر اہم باتیں بعد میں کرلیں گے۔ پہلے مجھے اپنے انکل کے بارے میں بتاؤ اور یہ بھی کہ تم اپنے انکل کے ساتھ اس ویرانے میں کس سے ملنے جا رہی تھیں اور کیوں؟"
[illegible]

تھوڑی سی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔
سفر اب خاموشی سے جاری تھا۔
نصف گھنٹے بعد ہم اسی اقبال چوک والے بنگلے پر پہنچ گئے جہاں میں خفیہ طور پر نقب لگا چکا تھا اور اب بغیر نقب کے اندر داخل ہو گیا۔
چوکیدار اور ایک ملازم موجود تھے۔ وہ ظاہر ہے نگہت کو جانتے تھے مگر مجھے نہیں۔ اجنبی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور نگہت کو اس حالت میں دیکھ کر تشویش زدہ بھی نظر آنے لگے۔
نگہت نے ان سے میرا تعارف ایک "محسن" کی حیثیت سے کرایا تو وہ دونوں مجھے ممنون بھری نظروں سے دیکھنے لگے لیکن جب ان پر یہ انکشاف ہوا کہ کار کی ڈکی میں انکل کی لاش جس کا نام بعد میں مجھے عدیل معلوم ہوا، موجود ہے تو ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔
بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ انکل عدیل یہاں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اقبال کا قریبی ساتھی تھا۔ یہی نہیں وہ جگنو کا بڑا بھائی بھی تھا۔ جگنو کے بارے میں پتا چلا تو مجھے ایک نئی ہی صورت پڑتے دکھائی دی۔ جگنو کا اصل نام کچھ بھی ہو مگر وہ ایک بڑا بدمعاش تھا اور سیالکوٹ کی ایک بڑی سیاسی شخصیت کا دستِ راست بھی تھا۔
مجھے تو کیا، خود نگہت کو بھی اپنے مقتول انکل کے بارے میں اس کا علم نہ تھا۔
مقبول اور ارشد کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں آپس میں تشویش زدہ انداز میں کھسر پھسر کرتے بھی دیکھا۔ ایک آواز میرے کانوں میں بھی پڑی۔
"جگنو کو فوراً اطلاع کرنا ہو گی۔"
"ہاں، وہ ہم سے حساب لے گا۔"
"ہم سے کیوں؟ کیا ہم نے مارا ہے؟"
"کچھ بھی ہو، وہ سب کو رگڑے میں لے گا۔"
"وڈی گڑبڑ پڑ گئی ہے۔ اب تو خود اقبال صاحب ہی آکر جگنو کی تسلی کرائیں تو کرائیں ورنہ......"
"اللہ خیر ہی کرے۔"
انہوں نے فوراً پولیس کو اطلاع کر دیا۔ نگہت نے جیسا کہ مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا اسی لیے انہیں بنگلے میں پہنچانے کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔
اب یہاں کئی قباحتیں مرحلہ وار میرے ذہن میں خونی گدھوں کی طرح منڈلانے لگیں۔

میں نگہت کو اپنا اصل نام بتا چکا تھا۔ وہ اگر کسی مدد کے سلسلے میں، جس کا مجھے پورا یقین تھا، کراچی اپنے باپ اقبال کو فون کرنے ...... کی کوشش کرتی تو میرا نام لے کر اسے چونکا سکتی تھی۔
دوسرا یہ کہ اب نگہت نے پولیس کو انوالو کر دیا تھا اور وعدے کے مطابق ان سے میرا نام چھپایا تھا مگر ایسا کب تک ہو سکتا تھا؟ پولیس تو اپنے سائے سے بھی چونک جاتی ہے۔ لاش اور زخمی نگہت کو سیالکوٹ کے مضافات سے یہاں تک اپنی کار میں لانے والا کون تھا؟
بے شک نگہت نے پولیس والوں کو یہی بتایا ہو کہ مدد کرنے والے نے اسی وعدے سے اس کی مدد کی تھی کہ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور کار میں یہاں تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
نگہت نے یہی بہانہ کر دیا ہو کہ وہ کار کا نمبر نہ دیکھ سکی۔ ظاہر ہے وہ اندر بے ہوش پڑی تھی۔ پولیس بنگلے کے ان دونوں نوکروں سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی۔
اسی لیے مجھے اپنا یہ ذرا اپنی جگہ پریشانی اور تشویش کا سبب بنا رہا۔ بعد میں مجھے پچھتاوا ہوا کہ اس طرح میں نے خود کو مزید مشکوک بنا لیا تھا۔ بہتر تھا اگر میں ایک عام راہگیر کی حیثیت سے ہی پولیس کی تھوڑی بہت پوچھ گچھ کا سامنا کر لیتا۔ بہرکیف بسا اوقات کئی الجھنیں ایک ساتھ آن پڑیں تو ایک آدھ ایسی "ازچن" رہ ہی جاتی ہے جس پر بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے۔
میں انہی پریشان کن خیالات میں واپس اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا کہ دفعتاً مجھے ایک موٹر سائیکل سوار پر شبہ ہوا کہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے میں اسی کی جانب سے انجان بن گیا مگر اس پر اپنی پوری توجہ بھی مرکوز رکھے رہا۔
ایک چوراہے پر میں رکا۔ وہ موٹر سائیکل سوار میری کار کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ سگنل کی بتی سرخ تھی۔ میں بیک ویو مرر سے اسے پہچاننے اور اس کا مقصد بھر جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ تب ہی میں بری طرح چونکا۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔
وہ بنگلے کا چوکیدار تھا۔ جس کا نام مجھے ارشد معلوم ہوا تھا اور ملازم کا مقبول۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ یہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ دونوں ملازم میری جانب سے شک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یوں مقبول نے اپنے ساتھی ملازم ارشد کو میری جانچ کے لیے میرے پیچھے

غیروں کا زخم تو زخم ہوتا ہے مگر... درد صرف اپنا محسوس ہوتا ہے... ان کا بھی یہی حال تھا۔ اپنا دکھ... اپنا غم... اپنا بچہ لیکن جانے کیسی چبھن تھی جس کے حصار میں قید ہو کر سب کے زخم اور سب کے غم اپنے ہی لگے...

تباہ کاریوں میں مبتلا معاشرے کی بے حسی کا عجیب انداز

میرا بچہ

صفدر علی حیدری

کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر گیا ہو پھر یوں لگا جیسے سپر سٹور کی چھت ریزہ ریزہ ہو کر اس کے اوپر آن گری ہو۔ دھماکے کی بازگشت کان پھاڑ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اب کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔ وہ ہوش میں تھا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا، بس یہی اس کے زندہ ہونے کی واحد دلیل تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ بم دھماکے کی بازگشت ختم ہوئی تو انسانی چیخوں، آہوں، سسکیوں اور بھاگنے دوڑنے کی آوازوں نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک دم خوفناک سا بنا دیا تھا۔

اس نے دوسرے لوگوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھا تو اس نے بھی ہمت مجتمع کی کہ شاید وہ بھی اٹھ کر بھاگ دوڑ سکے پھر یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ اپنے جسم کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی تو ٹانگوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

اس نے اٹھ کر حالات کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس کا گرنا اسے بچا گیا تھا ورنہ شیشوں کے ٹکڑے اس کا وجود چھلنی کر دیتے۔ پھر اسٹور شیشوں سے بھرا ہوا تھا اور اب ہر جگہ ان کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

کئی ایک لوگ اس نے ایسے دیکھے جن کی حالت دیکھ کر اس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ کوئی کم ہمت یا بزدل آدمی نہیں تھا مگر ان لوگوں کی حالت ہی ایسی تھی کہ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔

☆☆☆

محمد سلیم کا تعلق کراچی کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے والد تقسیم کے وقت بھارت سے پاکستان آئے تھے۔ کراچی میں آکر اپنا کاروبار شروع کیا اور یہاں کے ماحول میں رچ بس گئے۔

انہوں نے سبزی منڈی میں آڑھت کی دکان کھول لی تھی۔ اس کاروبار سے ان کا گزر بسر اچھی طرح ہو جاتا تھا۔ ابا جی بڑے ہوئے تو انہیں بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ دادا جی کی وفات سے گھر کے مالی معاملات پر کچھ خاص اثر نہ پڑا کہ تب تک وہ مکمل طور پر کام سیکھ چکے تھے۔

سلیم نے جیسے تیسے میٹرک کیا تو اسے بھی اس کام کو اپنانا پڑا۔ پھر باپ کی زندگی میں ہی اسے اس میں اچھی خاصی مہارت ہو گئی۔ ماں باپ نے اپنی پسند سے اس کی شادی کر دی مگر پوتے پوتیوں کو کھلانے کی حسرت دل میں لیے وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ ایک ٹریفک حادثے نے دونوں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

شادی کے کوئی دس سال بعد اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تو گھر میں گویا خوشیوں کے جلترنگ سے بج اٹھے۔ وہ تو مایوس ہو چکے تھے کہ شاید اولاد ان کے مقدر میں نہیں۔ اس کی بھلی مانس بیوی نے دبے دبے لفظوں میں دوسری شادی کا بھی کہہ دیا مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے پیار ہو گیا تھا اور وہ یہ قدم اٹھا کر اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

[illegible]

ہر وقت اداس کا چہرہ اتنا اب وہاں خوشیوں کا راج تھا۔ ان کے دن خوشی میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ دیکھتے دیکھتے عرفان چھ سال کا ہو گیا اور اسکول جانے لگا۔ اس کی باتیں انہیں سرشار کر دیا کرتیں۔

وہ لاڈلا ابھی تو بہت تھا۔ کسی کام کا ارادہ کر لیتا تو اسے کر چھوڑتا۔ اس دن بھی اس نے ضد کی کہ شاپنگ پر ساتھ جائے گا۔ ماں روکتی رہی مگر وہ جلدی سے بائیک پر سوار بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اچانک اسے یاد آیا کہ عرفان بھی اس کے ساتھ تھا۔

"میرا بچہ... میرا بچہ... عرفا... ن... عرفان... عرفان۔"

وہ پوری شدت سے چلایا تھا۔

مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ کہیں باہر نہ ہو۔ باہر آیا تو بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایمبولینس کے سائرن بج رہے تھے۔ شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ باہر بھی کم تباہی نہ ہوئی تھی۔

بلکہ اصل تباہی تو باہر ہی ہوئی تھی کہ وہاں بم پھٹا تھا۔

ایک آدمی نے اسے پریشان دیکھا تو اس سے حال چال پوچھنے لگا۔

"بھائی میرا بیٹا کھو گیا ہے... اس کی عمر کوئی چھ برس ہے۔"

"اس کا لباس سفید تو نہیں تھا؟"

"ہاں ہاں، اس نے سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔"

"وہ... تو... اسے تو ایمبولینس میں لے گئے ہیں، وہ زخمی تھا... مگر اس کی سانس چل رہی تھی۔"

اور اسے یوں لگا جیسے زمین کی گردش ایک دم تھم گئی ہو تھی۔ وہ کسی لٹو کی طرح گھوم گیا اور اگر وہ اجنبی اسے تھام نہ لیتا تو وہ زمین پر گر گیا ہوتا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، دعا کریں... اللہ تعالیٰ اسے زندگی دے۔ چلیں میں آپ کو اسپتال لیے چلتا ہوں۔ ایسی حالت میں آپ کا ڈرائیو کرنا ٹھیک نہیں۔"

"بہت شکریہ......"

وہ کوئی آدھے گھنٹے میں اسپتال کے گیٹ پر تھے۔ وہاں پولیس کے افراد بکثرت موجود تھے، میڈیا کی گاڑیاں بھی پہنچ چکی تھیں۔

مگر اسے ہوش ہی کب تھا کہ ان پر غور کرتا۔ اس کا تو رُواں رُواں دعا کر رہا تھا کہ اس کا عرفان خیریت سے ہو۔

☆☆☆

"آئیں ناظرین آپ کو اس حادثے کے عینی شاہد سے ملاتے ہیں۔ آپ تو اس وقت دھماکے سے سوگز کے فاصلے پر تھے۔ آپ بتائیں کہ جب دھماکا ہوا تو آپ کو کیا محسوس ہوا۔"

"میں اس وقت ایک اسٹور کے اندر تھا۔ دھماکے کی وجہ سے میں فرش پر گر گیا۔ اور سارا ماحول ہوتے تو ہر طرف تباہی کی تصویریں دیکھیں... میں اگر گرنے جاتا تو آج شاید زندہ نہ ہوتا۔ اس بم دھماکے میں میرا بیٹا عرفان بھی زخمی ہوا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے اسپتال آیا ہوں۔ ہائے میرا بچہ... کہاں ہے میرا بچہ... عرفان... عرفان..." میرا اس کے ہاتھ سے جانے کی دہائی کر گئی۔

"ابی جی کیا ہوا؟ کیا ہوا آپ کو؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔"

"ہم... میرا عرفان... میرا عرفان..."

"ارے یہ تو سلیم صاحب ہیں... ارے یہ اسپتال کیا کر رہے ہیں؟"

"تت... تم میرے ساتھ اسپتال چلو، ابھی اسی وقت..."

"مگر آپ کی طبیعت..."

"کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو۔ ٹھیک ہوں میں۔ تم چلو میرے ساتھ ابھی اسی وقت۔"

اور وہ دونوں تیزی سے ایک ٹیکسی سے اسپتال پہنچیں۔ وہاں ایمرجنسی روم کے باہر اس کا شوہر ادھر سے ادھر چکراتا پھر رہا تھا۔

"کہاں ہے میرا بچہ... کہاں ہے؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے... کہاں ہے وہ؟ تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو... ؟"

اپنی بیوی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے تو جان کر اسے کال بھی نہیں کی تھی کہ وہ اسے کیا جواب دے گا پھر پتا نہیں اسے کس نے بتایا اور وہ کیسے یہاں پہنچ گئی۔

"وہ... وہ ایمرجنسی میں ہے۔ اس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر تسلی دلا رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو ہمارے عرفان کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھ لینا آج ہی وہ گھر جائے گا۔"

جانے اس نے بیوی کو تسلی دی تھی یا خود کو...

"ہم... میں ملوں گی اس سے۔ ابھی تم لے کر چلو مجھے اس کے ساتھ۔"

وہ بے قابو ہو رہی تھی۔ اس کی ممتا مچل رہی تھی تڑپ رہی تھی۔

آخر اس کی اکلوتی اولاد تھی اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی بچے گا یا...

"تم ادھر بیٹھو... میری بات سنو پلیز اس کے لیے دعا کرو، ماں کی دعا تو عرش ہلا دیتی ہے۔ خدا کے لیے میرے بیٹے کے لیے، اپنے عرفان کے لیے دعا کرو۔" وہ اسی وقت فرش پر بیٹھی اور سجدے میں گر گئی۔ اس کو سجدے میں گرتا دیکھ کر وہ بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا اور سجدے میں گر گیا۔

"اے رب تو نے دس سال بعد ایک پھول دیا تھا جس کی خوشبو سے میرے گھر کا ایک ایک کونا مہکا ہوا ہے۔ اس کو سلامت رکھنا، کبھی نہ مرجھانا... ہر مصیبت سے بچانا..." وہ ابھی سجدے میں ہی تھے اور ڈاکٹر اسے جانے میں لگے تھے۔ تو...

چاہے تو وہ بچ سکتا ہے۔ زندگی کی طرف واپس لوٹ سکتا ہے۔ ہماری مدد فرما۔ ہماری دعا کو قبول فرما لے۔ ہم پر اپنا کرم کر دے۔ تو نے جس دولت سے نوازا تھا، اسے ہمارے پاس رہنے دے۔ ایک ہی بیٹا ہے میرا۔ اسے مجھے لوٹا دے، واپس کر دے۔ اس کی جدائی ہمیں مار ڈالے گی۔ ہماری دعائیں ہماری التجائیں سن لے پاک پروردگار......"

جانے کتنی دیر وہ رب کے حضور گڑگڑاتا رہا، روتا تڑپتا اور دعائیں مانگتا رہا کہ اچانک کسی نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا تو سفید کوٹ میں ملبوس ایک آدمی تھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب ہوں گے۔ وہ فوراً اٹھا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا بچہ ٹھیک تو ہے نا...... وہ بچ گیا ہے نا؟"

"سوری! ہم نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی لیکن...... جو خدا کو منظور......"

"نہیں...... نہیں...... نہیں......" بے چاری ماں چیخ ہی تو پڑی تھی۔ لگتا تھا اس کا دل کٹ گیا ہو اور پھر وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ فوراً ہی اسے بیڈ پر لٹا یا گیا۔

وہ صدمے سے بے ہوش ہوئی تھی سو گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میں ایک نظر اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ سسک رہا تھا۔ آنسو تھے کہ اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ اس کا معصوم وجود سفید چادر نے ڈھانپ لیا تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا اور اس کی یہ ہار ایک ایسا بھاری پتھر تھی کہ اس کے والدین اسے اٹھا نہیں پا رہے تھے۔ وہ آگے بڑھا...... اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے چادر کا کونا پکڑ لیا...... مگر چیخ مار کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ بھلا کیسے اس کا مرا ہوا منہ دیکھ سکتا تھا پھر وہ دھاڑیں مارتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ اب کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ ہمت کے پرزے پرزے ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر ہمت کی اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے چادر کا کونا ہٹایا اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

"مم...... میں کک...... کہاں ہوں؟"

"تم میرے پاس ہو اپنے شوہر کے پاس۔"

"اور عرفان کہاں ہے...... میرا عرفان...... عرفان......"

اچانک اسے یاد آیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو چکی ہے۔

"عرفان...... عرفان...... عر...... فا...... ن۔"

"جی امی! میں آپ کے پاس ہی تو ہوں...... یہ دیکھیں۔"

"عرفان...... میری جان...... میرے بچے...... تم...... تم زندہ ہو...... یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟"

"کیا ہوا...... کیوں چلا رہی ہو؟" اچانک اس کی آنکھ کھلی تو سامنے اپنے شوہر کو پایا۔

"وہ...... وہ...... عرفان...... میں نے عرفان کو خواب میں دیکھا۔ وہ یہیں تھا میرے پاس...... کاش وہ خواب نہ ہوتا۔ اے کاش میری آنکھ کبھی نہ کھلتی...... اے کاش۔"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ "کیوں رو رہی ہو......" وہ بولا۔ "یہ دیکھو تمہارا عرفان تمہارا پاس ہے۔"

ہیں...... اور وہ عرفان کو اپنے پاس دیکھ کر حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔

"میرے بچے...... میری جان......"

وہ جلدی سے اس سے لپٹ گئی۔

عرفان بھی زخمی ہوا تھا اور ایک اور لڑکا بھی جو اسی کی عمر کا تھا۔

عرفان کو معمولی سی چوٹ آئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

"جسے ہم اپنا بچہ سمجھ کر دعائیں مانگتے رہے وہ بے چارہ ہمارا بیٹا نہیں تھا۔ میرا خدا کتنا مہربان ہے کتنا رحیم و کریم ہے اس نے ہمارے بچے کو بچا لیا۔ ہم اس کا جس قدر شکر کریں کم ہے۔ کاش ہماری دعائیں اس بچے کو بھی لگ جاتیں...... کاش وہ بچہ بھی زندہ رہ جاتا۔"

"ہاں میرا رب بڑا کریم ہے...... بڑا رحیم ہے...... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے رب کہ تو نے میرا بچہ مجھے لوٹا دیا۔"

میاں بیوی دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی تھے اور افسردگی کے بھی۔ انہوں نے اپنے بچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔

"یا اللہ! جو لوگ تیرے بندوں کو ایسی آزمائشوں میں ڈالتے ہیں، اے میرے پاک پروردگار! تو انہیں یا تو نیک ہدایت دے یا پھر اس زمین کو ان کے بوجھ سے آزاد کر دے تاکہ تیرے مزید بندے اس آزار کا شکار نہ ہو جائیں۔ ایسے ظالم لوگوں کو تباہ و برباد کر دے۔"

xxx

شہر کا سب سے بڑا اور مشہور تاجر الیاس پاشا مہدی سوڈانی سے جا ملا اور محمد سعید پاشا پر بہت جلد یہ راز کھلا کہ بیشتر شہریوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ تنہا رہ گیا ہے۔ جو لوگ اب بھی شہر میں موجود تھے وہ محمد سعید پاشا کے لیے نا قابل اعتبار تھے۔ وہ خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ شہر کا یہ مشہور تاجر الیاس پاشا اپنے ساتھ کچھ فوجی بھی لے گیا تھا۔

مہدی سوڈانی

ضیا تسنیم بلگرامی

انیسویں صدی کے آخری عشرے کی وہ شخصیت جس نے سلطنتِ برطانیہ کو بے بس کر دیا تھا۔ بڑے بڑے تجربہ کار اس کے مقابلے میں ناکام رہے۔ ذوقِ یقین کے اس پیکر کا نام تھا محمد احمد جو اچانک مہدی بن گیا اور مصر اور برطانیہ کو سوڈان سے نکال باہر کیا۔ ایک ایسے شخص کے محیر العقول کارنامے جو سو سال پہلے اپنے عزم و حوصلے سے بہت کچھ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جھوٹے دعوائے مہدویت کے باوجود اس سے ہمدردی کی گئی اور اس کا نام احترام سے لیا گیا کیونکہ وہ اپنے مقصد میں مخلص تھا لیکن اس نے اپنے جانشین اپنے جیسے نہیں چھوڑے اور اس کا وہی ناخوشگوار انجام ہوا جو متوقع تھا۔

ایک دانا، دین دار اور مخلص انسان کا زندگی نامہ

دوسرا حصہ
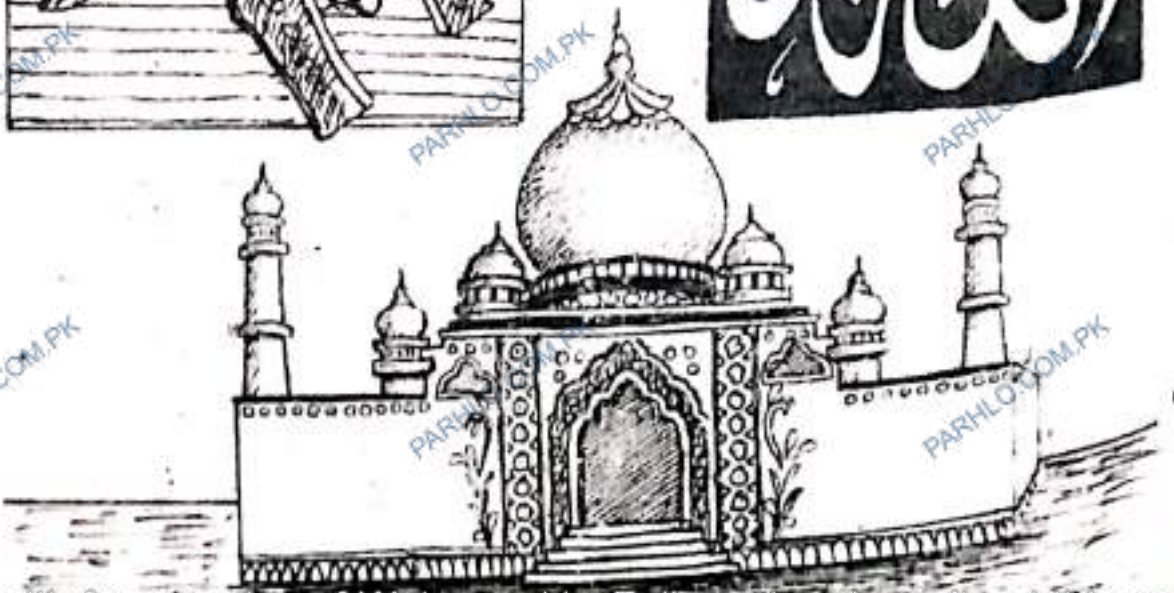
محمد سعید پاشا کے پاس جو فوج تھی وہ کل دس ہزار تھی اور باہر مہدی سوڈانی کے پاس صرف چھ ہزار درویش تھے۔ ان سب کے پاس نیزے بھی تھے، تلواریں بھی اور بندوقیں بھی۔ یہ بندوقیں دشمن سے چھینی گئی تھیں۔

اب تک مہدی سوڈانی نے جو فتوحات حاصل کی تھیں، ان کا تعلق کھلے عام میدانی جنگوں سے تھا لیکن ایک فصیل رکھنے والا شہر کس طرح فتح کیا جاسکتا ہے، مہدی سوڈانی کو اس کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ کافی دن محاصرے میں گزارنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ ابیض کو فتح کرنا آسان کام نہیں ہے۔

اب مہدی سوڈانی نے اپنے درویشوں سے پوچھا۔ ”ہم بظاہر ان چھ ہزار درویشوں کی مدد سے ابیض کو فتح نہیں کرسکتے۔ تم سب حساب لگا کر بتاؤ کہ ہمارے درویشوں کی کل تعداد کتنی ہے اور اگر ان سب کو یہاں بلوالیا جائے تو کیا شہر ابیض کی تسخیر آسان ہو جائے گی؟“

درویشوں نے حساب کرکے بتادیا کہ درویشوں کی کل تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔

مہدی نے ابیض پر حملہ کردیا۔

شہر بند فوج کو آسانی تھی کہ وہ فصیلوں پر سے فائرنگ بھی کرسکتی تھی اور سنگ باری بھی اور تیروں کی بوچھاڑ بھی کی جاسکتی تھی جبکہ درویشوں کے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ ان کی تعداد بھی کم تھی اور سامان جنگ بھی محدود۔

شروع میں معمولی جھڑپیں ہوئیں مگر مہدی سوڈانی کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ یہ جنگ اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتی لیکن وہ اس جنگ کا خطرہ مول لے چکا تھا۔

محمد سعید پاشا نے بے دریغ فوجی طاقت استعمال کی اور درویشوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ درویشوں نے تیر چلائے اور فائرنگ کی تو اس سے ان کو فائدے کے بجائے نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے درویشوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ تیروں کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا اور بندوقوں کی گولیاں بھی جواب دے گئیں۔

محمد سعید پاشا نے جب یہ دیکھا کہ درویشوں کی حالت پتلی ہے تو اس نے شہر کے باہر درویشوں پر فیصلہ کن حملہ کردیا۔ اب درویشوں کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتے۔

اس جنگ میں مہدی سوڈانی کا حقیقی بھائی محمد اور اس کے خلیفہ عبداللہ التعایشی کا بھائی یوسف بھی مارے گئے۔

دوسری طرف مصری فوج کے صرف تین سو آدمی مارے گئے تھے۔

مہدی سوڈانی نے پسپائی اختیار کی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ مستحکم اور مضبوط فصیلوں والے شہروں پر حملہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ایسے شہروں کا محاصرہ کرکے محصورین کو بھوکوں مار کر حوالگی شہر پر مجبور کردیا جائے گا۔

مہدی نے مختلف علاقوں سے کمک طلب کرلی اور ابیض کا ایک بار پھر محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ ساڑھے چار ماہ جاری رہا۔ شہر کے لوگ بھوکوں مرنے لگے اور اس بار محمد سعید پاشا کی ہمت بھی جواب دے گئی۔

شہر والوں نے بغاوت کردی اور محمد سعید پاشا کو مجبور کردیا کہ وہ شہر کو مہدی سوڈانی کے حوالے کردے۔ شہر کے دروازے کھل گئے اور مہدی اپنے درویشوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوگیا۔ سرکاری عملہ گرفتار کرلیا گیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں محمد سعید پاشا بھی شامل تھا۔

ابیض شہر پر قابض ہوتے ہی پورے کردوفان پر قبضہ مکمل ہوگیا۔ اب مہدی سوڈانی نے اپنے مقبوضہ علاقے کے انتظام کی طرف توجہ دی۔ انتظامی صیغوں کو تین محکموں میں تقسیم کیا۔

(1) سپاہ (2) قضا (3) مال۔

سپاہ کا انتظام اپنے خلیفہ عبداللہ التعایشی کے سپرد کیا۔

محکمۂ قضا احمد بن علی کے سپرد کیا۔ یہ شخص پہلے بھی قاضی رہ چکا تھا۔ اس کے عہدے کا نام قاضی الاسلام رکھا۔

محکمۂ مال کا افسر اعلیٰ احمد بن سلطان کو مقرر کیا۔ یہ مہدی کا بہت قریبی دوست تھا۔ مالی معاملات کے انصرام کے لیے بیت المال قائم کیا گیا۔ بیت المال میں ہر قسم کی آمدنی جمع ہوتی تھی مثلاً مال غنیمت، زکوٰۃ، عشور، فطرہ اور جرمانوں کی رقمیں۔ یہ جرمانے ان سے وصول کیے جاتے تھے جو قانون شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب قرار پاتے تھے۔

مہدی [illegible] اور سکون نصیب تھا۔ کوئی ان پر ظلم نہیں کرسکتا تھا۔

مہدی کے اپنے لباس، خوراک اور طرز معاشرت میں سادگی پائی جاتی تھی۔ وہ انتہا درجے کی زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اسے ہر وقت احکام شریعت کے اجرا کی دھن سوار رہتی تھی۔ اس نے اپنے قلمرو میں وہ تمام حدیں جاری کردی تھیں جو شریعت اسلام نے مقرر فرمائی ہیں اور اس نے اسی سال ایک منشور شائع کیا۔ اس منشور سے اس کی باطنی مذہب اور زاہدانہ خیالات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس نے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔

”اے بندگان خدا! اپنے رب بزرگ و برتر کی قدر کرو۔ اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو خصوصی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ جانتے ہو وہ نعمت کیا ہے؟ میرا بحیثیت مہدی ظاہر ہونا اور یہ تمہارے لیے دوسری امتوں پر شرف خاص ہے۔

”میرے دوستو! میرا اصل نظریہ ہے کہ تم کو راہ ہدایت دکھاؤں تو تم بھی خدا کے رستے میں مہاجرت اختیار کرو۔ جھوٹی مکمل دنیا کو اپنا نصب العین بناؤ۔ دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے منقطع ہو جاؤ یہاں تک کہ راحت و آسائش کا خیال تک دل سے نکال دو۔ اگر دنیا کوئی اچھی چیز ہوتی تو خدا اس کو تمہارے لیے آراستہ کرتا۔ ان لوگوں کو دیکھو جن کو ہر قسم کی دنیاوی آسائشیں حاصل تھیں لیکن ان پر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کی تمام راحتیں مصائب سے بدل گئیں اور آسائش زندگی کی شراب تکلیفوں کا زہر بن گئی۔

”اگر دنیا کی راحت میں کوئی بھلائی ہوتی تو ایسا کیوں ہوتا؟ اور [illegible] یہی نہیں بلکہ ابھی آخرت کا دردناک عذاب ان کے پیچھے آتا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم یہ سب دیکھتے ہو اور پھر بھی دنیاوی راحت و آسائش کی تمنا اور دنیاوی زندگی کی آرزو کرتے ہو۔ خدا سے ڈرو اور دنیا کی آسائشوں کو ٹھکرا دو۔ اللہ کے سچے بندوں کی رفاقت اختیار کرو۔ اس کی راہ میں جہاد کرو کہ یہی زندگی بھی ہے۔ اللہ کی راہ میں ایک مسلمان کا گھوڑا ذرا حرکت میں لانا ستر برس کی عبادت کے ثواب سے بڑھ کر ہے۔

”عورتوں پر بھی خدا کی راہ میں جہاد فرض ہے۔ جو عورتیں میدان جہاد میں خدمات انجام دے سکتی ہیں ان کے لیے گھر سے باہر نکلنے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے جہاد کریں۔

”جوان اور پردہ نشین عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ گھروں میں پاک زندگی بسر کریں اور اپنے نفس سے جہاد میں مصروف رہیں۔ بلا ضرورت شرعی گھر سے باہر نہ نکلیں۔ اونچی آواز سے باتیں نہ کریں کہ غیر مردان کی آواز سنیں۔ نماز پابندی کے ساتھ وقت پر ادا کریں۔ اپنے شوہروں کی اطاعت فرض سمجھیں۔ اپنے جسموں کو کپڑوں سے چھپائے رکھیں۔ جو عورت ستر پوشی نہ کرے اسے سزا دی جائے۔

”شراب پینے والے کو اسّی کوڑے لگائے جائیں۔ اگر شراب خور کا ہمسایہ اس کو سزا دینے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو امیر شہر کو اطلاع دے ورنہ اس کو اخفائے جرم میں اسّی کوڑوں اور سات دن قید کی سزا دی جائے۔

”میرے دوستو! تم مخلوق خدا پر شفقت کرو۔ احکام خداوندی کی مخالفت نہ کرو۔ اوامر کی پابندی لازمی ہے۔ میرے احکام کو سنو اور اطاعت کرو۔ تبدیل و تحریف کا خیال بھی دل میں نہ آنے دو۔ خداوند تعالیٰ نے جو نعمت تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرو اور کفران نعمت سے باز رہو۔“

محمد احمد نے اپنے بعض معتمد افسروں کو سوڈان کے اطراف میں تبلیغ مہدویت کے لیے روانہ کیا۔ عثمان دقنہ جو مہدی کا معتقد خاص تھا، مشرقی سوڈان میں پہنچا اور وہاں کے قبائل کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش شروع کردی۔ اس نے اپنے متبعین کو اکٹھا کیا اور ایک سپاہ تیار کی اور مہدی کا مذکورہ بالا منشور شائع کیا۔ اس شخص کو یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور مشرقی سوڈان کے قبائل جوق در جوق مہدویت کا حلقہ اپنے گلوں میں ڈالنے لگے۔ عثمان دقنہ نے یہاں بھی ایک بیت المال قائم کیا اور زکوٰۃ و عشور کی رقمیں اس بیت المال میں جمع ہونے لگیں۔

گورنر عبدالقادر پاشا خرطوم میں یہ خبریں سن رہا تھا اور پریشان تھا کہ اس پر کس طرح قابو پایا جائے۔ آخر دولت انگلشیہ سے مشورے ہونے لگے۔ مصری حکومت بھی سوڈان کے معاملے میں خود کو بے بس محسوس کررہی تھی اور وہ دیکھ رہی تھی کہ آہستہ آہستہ پورا سوڈان مصری حکومت کے اقتدار سے نکلتا جارہا ہے۔

اب مصری حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ اگر مہدی سوڈانی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور سوڈان سے مصری گورنر اور دوسرے اعلیٰ حکام کو نکال باہر کیا تو پھر اس کا دوسرا ہدف مصر ہوگا اور قاہرہ سوڈان سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

خدیو مصر کو یہ بھی [illegible] تھا کہ مہدی سوڈانی کی تعلیمات [illegible] عام مسلمانوں کو اپنی [illegible] حکومت کو اندیشہ عوام کی طرف سے تھا کہ اگر عوام میں اسلامی روح دوڑ گئی تو حکومت ان کے سامنے [illegible]

بس ہو جائے گی اور یہ بے بسی پورے مصر کو اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دے گی۔

خرطوم کے گورنر عبدالقادر پاشا نے مصری حکومت کو رپورٹ دی۔ ”سوڈان کے حالات سنگین ہیں اور جس قدر ملک میرے قبضے میں ہے، اس کے نکل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر اس فتنے کی روک تھام کے لیے کوئی مؤثر اور تیز تر کارروائی نہ کی گئی تو پورے سوڈان پر مہدی کا قبضہ ہو جائے گا۔“

خدیو مصر نے یہ رپورٹ انگلستان روانہ کر دی اور اس مسئلے میں انگلستان سے مدد چاہی پھر جس طرح مصری حکومت کو تشویش لاحق ہوئی تھی، اسی طرح دولت انگلشیہ بھی فکرمند ہوئی۔

برطانوی حکومت مہینوں اس پر غور کرتی رہی۔ ارباب حکومت اس موضوع پر بحث و مباحثہ کرتے رہے اور آخرکار یہ طے پایا کہ برطانیہ کو بھی مصر کے ساتھ مل کے مہدی سوڈانی کے خلاف فوجی کارروائی کرنا چاہیے۔ انگلستان کے مشہور جنرل ہکس کو اس مہم کے لیے نامزد کیا گیا۔

جنرل ہکس نے اپنی مدد کے لیے دو دوسرے جنگ آزمودہ انگریز فوجی افسروں کا انتخاب کیا۔

چونکہ عبدالقادر پاشا ہمت ہار چکا تھا اس لیے اس کو خرطوم سے واپس بلا لیا گیا تھا اور اس کی جگہ علاؤالدین پاشا کو خرطوم کا گورنر مقرر کیا گیا۔

علاؤالدین پاشا نے خرطوم پہنچتے ہی اس مہم کے لیے نیل ارزق کے مشرقی حصے سے اونٹ جمع کرنے شروع کر دیے اور فوج بھی تیار کی گئی۔

علاؤالدین پاشا کا کام اگست 1883ء تک مکمل ہو گیا اور 8 ستمبر کو جنرل ہکس نے متحدہ فوج کا جائزہ لیا۔ اس سپاہ میں چار مصری دستے، پانچ سوڈانی دستے اور ایک دستہ توپچیوں اور سواروں کا تھا۔ مصری فوج سلیم بیگ عوفی، سید بیگ عبدالقادر ابراہیم پاشا حیدر اور رجب بیگ صدیق کے ماتحت تھی۔

سپاہ کی کل تعداد گیارہ ہزار تھی جس میں سے سات ہزار مصری پیدل فوج تھی اور اونٹوں کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار تھی اور پانچ سو گھوڑے تھے۔ جرمنی کے مشہور ادارے کرپ کی توپیں، دس پہاڑی توپیں اور دوسری قسم کی توپیں تھیں۔ 20 ستمبر کو یہ سپہ دوئم پہنچ گئے۔ یہاں علاؤالدین پاشا کی ایک بہت بڑی فوج ان کا انتظار کر رہی تھی۔

جنرل ہکس نے اپنی فوج کو دوئم سے ابیض کی طرف لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فاصلہ ایک سو چھبیس میل تھا۔ اس نے راستے میں چند چوکیاں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ اگر اسے شکست ہو جائے تو واپسی میں دشمن اس کا راستہ نہ منقطع کر دے۔

جنرل ہکس آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ تیس میل کے فاصلے پر پہلی چوکی قائم کر دی جائے گی لیکن مہدی سوڈانی نے انگریز جنرل کے اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔

مہدی سوڈانی چھیانوے میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ جنرل ہکس، مہدی سوڈانی کے عزائم سے بے خبر جیسے ہی یہاں پہنچا تو چاروں طرف سے درویشوں میں گھر گیا۔ درویشوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور انہوں نے انگریز جنرل کو اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ مہدی سوڈانی کے خلاف مورچا بندی کرتا۔ چشم زدن میں لشکر کا صفایا کر دیا گیا۔ اس قیامت خیز معرکے میں اخباری نمائندے بھی مارے گئے۔ یہاں تک کہ جنرل ہکس کی لاش بھی مقتولوں میں شامل تھی۔ آلات حرب پر درویشوں کا قبضہ ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ صرف تین سو آدمی جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ بوڑھے تھے اور انہیں رحم کھا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بقیہ وہ لوگ تھے جو لاشوں کے نیچے چھپ گئے تھے۔ ان زندہ بچ جانے والوں میں جنرل ہکس کا خانساماں محمد نور بارودی شامل تھا اور اسی شخص نے جنرل ہکس کی ہزیمت اور تباہی کے تمام واقعات مصری حکومت تک پہنچائے تھے۔

درویشوں کو اپنی فتح کے نتیجے میں بہت کچھ ملا۔

سوڈان کے اکثر قبیلے ابھی تک تذبذب کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنرل ہکس، مہدی اور اس کے درویشوں کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ چنانچہ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ جنرل ہکس مارا گیا، اس کی فوج برباد ہو گئی، مہدی سرخرو ہوا اور درویش اپنے دشمنوں پر غالب آئے تو ان خبروں نے سوڈان کے مرتد قبیلوں کو محمد احمد کی مہدویت پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

مہدی کو ایسی شاندار فتح حاصل ہوئی تھی کہ اس کا اثر مصری فوج پر پڑا۔ یہ مصری سپاہی ملازمتیں چھوڑ چھوڑ کر مہدی سوڈانی کے پاس پہنچنے لگے۔ یہ پہلے مہدی پر ایمان لاتے اس کے بعد مہدی کے درویشوں میں شامل ہو جاتے۔

یہ خبریں قاہرہ اور لندن پہنچیں تو صف ماتم بچھ گئی اور ایک بار پھر مصری حکومت اور دولت برطانیہ کے درمیان صلاح مشورے ہونے لگے۔

درویشوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ مہدی سوڈانی نے عثمان دقنہ کو حکم دیا کہ وہ درویشوں کا لشکر لے کر سواکن کی طرف بڑھے۔ یہ علاقہ مصر اور سوڈان کے درمیان بحیرۂ قلزم پر واقع ہے۔

عثمان دقنہ نے سنکات اور توکر کا رخ کیا تو مصری فوج اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ سواکن ابھی دور تھا۔

عثمان دقنہ نے دونوں جگہ مصری فوج کو شکست دی۔

خطرات کے پیش نظر محمد پاشا طاہر پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ سواکن سے چلا۔ انگریز سفیر ڈاک ماکرف اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اس مخدوش علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ڈیڑھ سو درویشوں نے ایک گھنٹے بعد ہی ان پر حملہ کر دیا۔

محمد پاشا طاہر کو شکست ہوئی اور اس کے جن سپاہیوں نے اپنی جانیں بچائی تھیں، وہ بھاگ کر سواکن میں پناہ گزین ہو گئے۔

یہ خبریں مصری حکومت کے لیے بہت تشویش کا باعث تھیں۔ انگریزوں نے مصری حکومت کو تسلی دی اور خدیو مصر کو یقین دلایا کہ وہ ایک نہ ایک دن مہدی سوڈانی اور درویشوں پر قابو پا لیں گے اور اس مقصد کے لیے جنرل ویلنٹائن بیکر کا نام پیش کیا۔

ایک بار پھر مصری فوج تیار کی جانے لگی لیکن اب حالات اتنے بدل چکے تھے کہ مصری سپاہی اس جنگ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ چھپ چھپ کر راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ مصری فوج کے جو افسر اور سپاہی کسی وجہ سے انکار نہیں کر سکتے تھے، وہ زار و قطار رونے لگے لیکن ان کا یہ رونا کسی کام نہ آیا اور انہیں مہدی کے مقابلے میں سوڈان جانا پڑا۔ کچھ سپاہیوں نے راستے ہی سے بھاگ کر مہدی کے درویشوں میں شمولیت اختیار کی۔

اس مہم میں دوسرے تجربہ کار فوجی انگریز بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جہازوں میں سوار ہو کر سواکن کے جنوب میں بڑھے چلے گئے اور ایک جگہ 4 فروری 1884ء کو جہازوں سے اترے اور خاموشی سے مشرق کی سمت روانہ ہو گئے۔

جنرل بیکر ایک اندازے کے مطابق عثمان دقنہ کی پشت پر پہنچ کر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مصری اور سواکن کے کچھ لوگ درویشوں کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے عثمان دقنہ کو جنرل بیکر کے ارادوں کی خبر پہنچا دی اور عثمان دقنہ بھی صرف بارہ سو درویشوں کے ساتھ بیکر کی طرف بڑھا اور اچانک دونوں میں مڈبھیڑ ہو گئی۔

جنرل بیکر کو درویشوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہ تھا اس لیے وہ پیچھے ہٹا اور اپنی پیدل فوج کے ذریعے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔

مصری تو پہلے ہی سے مہدی اور اس کے درویشوں سے خوفزدہ تھے۔ انہوں نے بے دلی سے مقابلہ کیا اور کچھ نے مقابلے کے بغیر ہی راہ فرار اختیار کی۔

جنرل بیکر کو اس صورت حال کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا پھر بھی اس چالاک جنرل نے راہ فرار اختیار کی اور خاص سواکن پہنچ کے دم لیا۔ دوسرے انگریز فوجی افسر مارے گئے۔

درویشوں کو مال غنیمت میں چار توپیں، پانچ لاکھ کارتوس اور تین ہزار بندوقیں ہاتھ لگیں۔

اس شکست نے برطانیہ اور مصر کو ایک بار پھر بہت زیادہ تردد اور انتشار میں مبتلا کر دیا۔

درویشوں نے سواکن کو چاروں طرف سے گھیر لیا جبکہ سواکن کی حفاظت کے لیے بہت تھوڑی سی مصری فوج رہ گئی تھی۔

کردوفان اور دارفور پہلے ہی مہدی کے قبضے میں جا چکے تھے۔ گویا اب مہدی کی حکومت خرطوم کے قریب سے چو میل کے فاصلے تک پھیل گئی تھی۔

مشرق میں حبشہ تک سنار کا تمام علاقہ اس میں شامل تھا۔

مغرب میں دارفور اور کردوفان تھے اور شمال مشرق کی طرف سواکن تک اس کی سرحد جا ملی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں مہدی کا اثر علاقہ الفشیر تک پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں وہاں انگریز گورنر سلاطین موجود تھا۔ وہاں کے مقامی لوگوں نے اس کے نام کو معرب کر لیا تھا اور اسے سلاطین پاشا کہنے لگے تھے۔

[illegible]

آئے۔ سلاتین پاشا نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے مصری افسر باغیانہ خیالات رکھتے ہیں۔

یہ تو اسے یقین تھا کہ وہ جنگ کر کے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اپنی جان بھی بچانا چاہتا تھا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ وہ مہدی کی طرف ارادت مندی کا ہاتھ بڑھائے اور مصلحت سے کام لے کر مسلمان ہو جائے۔ وہ فی الحال مہدی کی نیاز مندی میں چلا جائے پھر جب بھی فرار ہونے کا موقع ملے تو اپنی جان بچا لے گا۔

یہ سارے فیصلے کرنے کے بعد اس نے ایک خط مہدی کو لکھا۔ ''میں آپ کی محترم شخصیت سے متاثر ہو کر آپ کی نیاز مندی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ واقعی مہدی آخر الزماں ہیں اور آپ کی مسلسل فتوحات اور حیرت انگیز کامیابیاں مجھے آپ پر ایمان لانے پر مجبور کر رہی ہیں کہ میں آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کر لوں۔ مجھے امید ہے مسلمان ہونے کے بعد آپ مجھے اپنے خاص درویشوں میں شامل فرما لیں گے۔ میں جس جگہ کا گورنر ہوں اس کے لیے آپ کو فوج کشی نہیں کرنا پڑے گی۔ میں یہ سارا علاقہ جنگ و جدل کے بغیر ہی آپ کے حوالے کر دوں گا۔''

اس نے دوسرا خط اوگل نامی ایک انگریز کو لکھا۔ ''میں یہاں مہدی اور درویشوں کے نرغے میں آ گیا ہوں اور زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں جان بچانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ذرا معلوم کر کے بتاؤ کہ اب کس جنرل کو مہدی کے مقابلے پر بھیجا جا رہا ہے تاکہ میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ مجھے مہدی کی نیاز مندی میں کتنے عرصے رہنا پڑے گا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔''

اوگل کے پاس سلاتین پاشا کے لیے واضح جوابات نہیں تھے۔ وہ پہلے تو ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا اور آخر ناکام و نامراد واپس آیا۔ مصر اور برطانیہ دونوں ہی مہدی سوڈانی کے مقابلے میں بے بس نظر آ رہے تھے۔ اوگل نے سوچا اگر وہ جواب میں سلاتین پاشا کو تفصیل سے کچھ لکھے گا اور اگر یہ خط پکڑا جائے گا تو دونوں مصیبت میں پھنس جائیں گے اور سلاتین پاشا قتل کر دیا جائے گا۔

سلاتین پاشا تو پہلے ہی اظہار نیاز مندی کر چکا تھا اور اوگل، سلاتین پاشا کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مہدی نے سلاتین پاشا کا نام عبداللہ رکھا اور اس کو حکم دیا کہ وہ العبید آ جائے۔ سلاتین پاشا العبید پہنچا اور وہاں سے مہدی کے ساتھ خرطوم کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب انگلستان نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے جنگ و جدل سے پرہیز کیا جائے اور سیاسی حکمت عملیوں سے کام لے کر مہدی کو قابو میں لایا جائے۔

سوڈان میں کئی جگہ مصری اور انگریز فوجیں پھنسی ہوئی تھیں اور ان کو بہ حفاظت وہاں سے نکالنا ایک دشوار کام تھا۔ آخر انگلستان کی نظر جنرل گارڈن پر گئی۔ یہ شخص اس سے پہلے سوڈان میں گورنر جنرل رہ چکا تھا اور اس کی لیاقت اور مستعدی کے مصر اور انگلستان یکساں معترف تھے۔ وہ سوڈان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کو برطانوی حکومت نے ہدایت کی کہ جس طرح بھی بن پڑے وہ تمام سرکاری محصور فوجوں کو سوڈان سے نکال لائے اور سیاسی حکمت عملیوں سے مہدی سوڈانی کو زیر دام لائے۔ گو کہ یہ نہایت پر خطر ذمے داریاں تھیں لیکن جنرل گارڈن نے نہایت دلیری اور استقلال سے یہ ذمے داری قبول کر لی۔

برطانیہ نے جنرل گارڈن کو ہائی کمشنر کی حیثیت سے سوڈان روانہ کر دیا اور خدیو مصر کی طرف سے جنرل گارڈن کو سوڈان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔

وہ لندن سے سیدھا وہاں کے لیے روانہ ہوا اور بروقت پہنچ کے سوڈان کی آزادی کا اعلان جاری کر دیا۔ تمام محصولات نصف کر دیے گئے۔ تمام باشندوں کی جرم بخشی ہوئی۔

اہل سوڈان کو لونڈی غلام رکھنے اور ان کی خرید و فروخت کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اسی اعلان کے ذریعے محمد احمد مہدی کو سلطان [illegible] مقرر کیا گیا اور جنرل گارڈن نے چند تحائف بھی مہدی کی خدمت میں بھیجے۔

جنرل گارڈن کا خیال تھا کہ مہدی اور سوڈان کے لوگ ان مراعات سے بہت خوش ہوں گے اور جنرل گارڈن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے مگر مہدی نے جنرل گارڈن کی مراعات کو مسترد کر دیا اور اس کے تحائف واپس کر دیے اور لکھا۔ ''میں کفار سے کسی بخشش اور عطا کا روادار نہیں۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو اور سچے دین اسلام کی پیروی اختیار کرو۔ اس سے تمہیں دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل ہو گی اور تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی جان بچ جائے [illegible]

جنرل گارڈن، مہدی کا خط پڑھ کے آپے سے باہر ہو گیا اور مہدی کو یہ مختصر جواب بھیج دیا۔ ''میں تم سے مزید خط کتابت نہیں کر سکتا۔''

جنرل گارڈن خرطوم پہنچ گیا۔

برطانوی افواج اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گئیں کیونکہ جنرل گارڈن کے پہنچنے سے پہلے ان کی حالت بڑی مایوس کن تھی۔ خرطوم میں داخل ہونے کے بعد بہت جلد جنرل گارڈن کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے یہاں آ کے غلطی کی ہے اور مہدی کسی وقت بھی خرطوم پر حملہ کر دے گا۔ بہ حالت محاصرہ وہ کب تک مہدی کا مقابلہ کر سکے گا؟ فی الحال اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن اس کے خیال میں ایک بات طے تھی کہ محصور خرطوم میں ضروریات زندگی وافر مقدار میں ہونا چاہئیں۔ کم از کم سال بھر کے عرصے میں جنرل گارڈن کو کہیں سے کمک مل سکتی تھی اور کمک ملتے ہی وہ شہر سے نکل کے مہدی سوڈانی کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسی منصوبہ بندی کے تحت جنرل گارڈن نے ضروری اشیا کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔

جنرل گارڈن جانتا تھا کہ شہر خرطوم اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے طبعی طور پر ایک قلعہ ہے۔ اس کے دو اطراف یعنی شمال اور مشرق دریائے نیل سے محیط ہیں۔ مغرب اور جنوب کی طرف نہایت مضبوط شہر پناہ ہے اور شہر پناہ کے باہر ایک نہایت گہری خندق ہے۔

یہاں جو برقی سلسلہ تھا اس کا تعلق قاہرہ سے تھا۔ مہدی نے اس سلسلے کو منقطع کر دیا اور قاہرہ سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ قاہرہ کو جنرل گارڈن کی کوئی خبر نہ تھی اور جنرل گارڈن قاہرہ سے بے خبر تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز بھی انتشار میں مبتلا تھے اور مصری بھی پریشان نظر آ رہے تھے۔

دریائے نیل میں طغیانی آئی تو جنرل گارڈن نے کشتیوں کے ذریعے قاہرہ سے خط کتابت کا سلسلہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کرنل ہیمل اسٹورٹ کو قاہرہ ایک خط بھیجا۔ اس جہاز میں انگریز سفیر پاور اور فرانسیسی سفیر بھی سفر کر رہے تھے۔ جہاز کا نام عباس تھا۔ جنرل گارڈن نے اپنی پریشان حالی کی ایک مفصل روداد قاہرہ بھیجی تھی مگر بدقسمتی سے یہ جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

کرنل اسٹورٹ اور اس کے ساتھی کشتیوں میں سوار ہو کر کنارے پہنچ گئے۔ اس گاؤں کے لوگ انگریزوں سے بے حد نفرت کرتے تھے چنانچہ گاؤں والوں نے انہیں ''فرنگی بے دین'' کا لقب دیا اور قتل کروا ڈالا۔ جنرل گارڈن کی روداد بھی ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئی۔

ان حالات میں مہدی کا لشکر خرطوم کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اندرون شہر لوگوں کی ہمدردیاں مہدی کے ساتھ تھیں۔ جنرل گارڈن ان کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس طرح اس کے خلاف بغاوت ہو سکتی تھی۔

انگلستان یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ جنرل گارڈن کا مصر سے رابطہ منقطع ہو چکا ہے اور جنرل گارڈن کو جس مقصد کے لیے خرطوم بھیجا گیا تھا وہ بھی پورا نہیں ہوا۔ سوڈان میں پھنسی ہوئی انگریزی فوجوں کو نکالنے کا منصوبہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔

ان دنوں برطانیہ کے وزیر اعظم گلیڈ اسٹون تھے۔

گلیڈ اسٹون نے اپنے دوستوں سے مشورے کے بعد ایک سب سے زیادہ تجربہ کار شخص کو اس مہم کو سر کرنے کے لیے منتخب کیا۔ یہ شخص اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے لارڈ کا خطاب حاصل کر چکا تھا۔ اس کا نام تھا لارڈ ولزلی۔

وزیر اعظم برطانیہ نے لارڈ ولزلی کو حکم دیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنی فوج اور جنرل گارڈن کو بچا کر سلامت نکال لائے۔ حتی الامکان کوشش کی جائے کہ مہدی سے جنگ نہ ہو۔

گلیڈ اسٹون نے لارڈ ولزلی کو اپنی حکومت کا فیصلہ سنایا۔ ''حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ سوڈان کو خالی کر کے اس کی قسمت مہدی کے ہاتھ میں دے دی جائے اور مصر کی سرحد وادی حلفا تک رہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ مہدی سے جنگ نہ کریں اور حکمت عملی سے اپنی افواج اور جنرل گارڈن کو سوڈان سے نکال لائیں۔''

لارڈ ولزلی لندن سے روانہ ہوا اور اسکندریہ پہنچ گیا۔ اسکندریہ میں اس کے ہم وطن موجود تھے۔ وہاں سے وہ [illegible] قاہرہ چلا گیا۔ یہاں انگریزی افواج کا سپہ سالار جنرل اسٹیفن سن عضو معطل کی طرح پڑا ہوا تھا۔ لارڈ ولزلی نے اس سے ملاقات کی [illegible]

نہیں ہونی چاہیے۔ اس نے کہا۔ ”جناب! آپ جنگ کے بغیر کس طرح اپنی افواج کو سوڈان سے اور جنرل گارڈن کو خرطوم سے واپس لا سکتے ہیں؟“
لارڈ ولزلی نے جواب دیا۔ ”فوج تو میرے ساتھ رہے گی۔ جہاں کہیں جنگ کی ضرورت ہوگی، جنگ کی جائے گی اور جہاں کہیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی، سیاسی حکمت عملیوں سے کام لیا جائے گا۔“
اور دونوں میں سوڈان تک پہنچنے کے راستوں پر بحث ہونے لگی۔
اسٹیفن سن نے لارڈ ولزلی کو سمجھایا۔ ”اگر آپ خشکی کا راستہ اختیار کریں گے تو سواکن سے بربر تک دشواریوں کے باوجود پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ کو بربر سے خرطوم تک نیل کے ذریعے سفر کرنا پڑے گا اور یہ تقریباً چار سو میل کا سفر ہوگا۔“
لارڈ ولزلی نے بھی اپنا فیصلہ سنایا۔ ”جناب اب تک ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا اور ہمیں ہزیمتوں کا منہ دیکھنا پڑا، اس کی وجہ یہی خشکی کے راستے ہیں۔ اس وقت مصری مسلمان اور سوڈانی مسلمان ہمارے لیے ناقابل اعتبار ہیں۔ جب ہم خشکی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، مہدی سوڈانی کو اس کی خبر ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں اور نہایت تیز رفتاری سے سفر کر کے ہمیں راستے میں ہی دبوچ لیتے ہیں۔ خشکی کا راستہ کتنا ہی قریب کا کیوں نہ ہو، میں اس خطرے کو مول نہیں لوں گا۔ مجھے تم یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ سفر دریائے نیل سے اختیار کروں تو مجھے کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا؟“
اسٹیفن سن کو لارڈ ولزلی کے اس فیصلے سے اختلاف تھا کیونکہ اس میں وقت کا زیاں پایا جاتا تھا۔ اس نے مایوسی سے جواب دیا۔ ”اگر آپ دریائے نیل سے یہ سفر اختیار کریں گے تو آپ کو ساڑھے سولہ سو میل کا سفر کرنا ہوگا اور یہ فاصلہ آپ بہت دنوں میں طے کریں گے اور کم از کم میں اس معاملے میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میں یہاں کی افواج انگریزی کا سپہ سالار ہوں اس لیے آپ تنہا اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“
لارڈ ولزلی نے حکومت برطانیہ کا وہ خفیہ فرمان اسٹیفن سن کے سامنے رکھ دیا جس میں اسٹیفن سن کو مطلع کیا گیا تھا کہ لارڈ ولزلی مشورے کی حد تک تو پابند ہے کہ اسٹیفن سن سے مشورے کرے لیکن لارڈ ولزلی پر یہ واجب نہیں کہ وہ اسٹیفن سن کے مشورے مان بھی لے۔ لارڈ ولزلی وہی کرے گا جو خود مناسب سمجھے گا۔
اس خفیہ فرمان نے اسٹیفن سن کو خاموش کر دیا لیکن اس نے لارڈ ولزلی سے پوچھا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے یہ ضرور بتائیں کہ آپ نے خشکی کے مختصر ترین راستے پر آبی طویل ترین راستے کا انتخاب کیوں کیا؟“
لارڈ ولزلی نے جواب دیا۔ ”مجھے اصولاً اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے لیکن جواب دینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ مہدی سوڈانی کی طاقت خشکی کی حد تک ہے جس سے وہ متواتر فائدے اٹھا رہا ہے۔ اب ہمیں اس سے مقابلے کے لیے اس محاذ کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے لیے نیا اور کمزور تر ہو۔ ہم دریائے نیل میں ساڑھے سولہ سو میل کا فاصلہ بے خوف و خطر طے کر جائیں گے۔ مہدی سوڈانی کے پاس ہمارا راستہ روکنے کے لیے نہ تو جہاز ہیں نہ کشتی ہے اور نہ بحری فوج...... اور میرے خیال میں ہم اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مہدی سوڈانی کو ہمیں الجھائے رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہم چھوٹی موٹی جنگوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے تاکہ اسے ہمارے اصل عزائم کا پتا نہ چلے۔“
اسٹیفن سن نے کہا۔ ”لیکن آپ کو تو مہدی سے جنگ کرنے سے روکا گیا ہے اور آپ مسلسل جنگ کی باتیں کیے جا رہے ہیں؟“
لارڈ ولزلی نے جواب دیا۔ ”لیکن میں اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے ہر وہ کارروائی کروں گا جس سے مجھے میرا مقصد حاصل ہو جائے۔“
لارڈ ولزلی بحری راستے سے خرطوم روانہ ہو گیا اور 3 نومبر کو ڈنگولا شہر کے کنارے پہنچ گیا۔
یہاں کا حاکم محمد یاور تھا اور لارڈ ولزلی کی معلومات کے مطابق اس شخص نے مہدی کے خلاف زبردست مزاحمت کی تھی اور ڈنگولا کو مہدویوں سے بچائے رکھا تھا۔
محمد یاور، لارڈ ولزلی کے استقبال کے لیے ساحل پر آیا۔ ساحل پر ہی لارڈ ولزلی کے اعزاز میں شامیانے کھڑے کیے گئے اور انہی شامیانوں کے نیچے لارڈ ولزلی نے محمد یاور کی پذیرائی کی اور کہا۔ ”بظاہر یہ میرے استقبال کی خوشی میں [illegible] اور بہت بہادر اور باتدبیر انسان ہے۔ اس نے ڈنگولا کو مہدی اور درویشوں سے اب تک بچائے رکھا ہے۔ حکومت برطانیہ [illegible]

میں محمد یاور کو بہادری کا تمغہ دوں اور کے سی ایم جی کا خطاب دوں۔“
محمد یاور نے لارڈ ولزلی کا شکریہ ادا کیا اور حکومت برطانیہ کی قدر افزائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس عزت افزائی کا مستحق تو نہ تھا لیکن جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے اس کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میں نے یہاں جو کچھ کیا ہے، اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ کسی تمغے یا خطاب کے لالچ میں نہیں کیا۔“
محمد یاور نے جنگل میں جا کے غسل کیا اور دوسرا لباس پہنا۔ جس لباس میں اس نے لارڈ ولزلی سے ملاقات کی تھی اور اس سے ہاتھ ملایا تھا، اس لباس کو اس نے آگ میں ڈلوا دیا کیونکہ اس کے خیال میں لارڈ ولزلی سے ملنے اور ہاتھ ملانے اور اس سے لباس کے مس ہونے سے محمد یاور کا لباس ناپاک ہو گیا تھا۔ وہ پکا مسلمان تھا اور جو کچھ اب تک ہوا تھا، اس پر شرمندہ تھا۔ وہ مہدی اور اس کے درویشوں کو پکا مسلمان سمجھتا تھا۔
لارڈ ولزلی یہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔
خرطوم میں جنرل گارڈن کو کچھ پتا نہ تھا کہ اس کی مدد کے لیے لارڈ ولزلی بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اسی لیے اس نے کسی ترکیب سے قاہرہ ایک پیغام بھیجا۔ یہ پیغام 13 جولائی کو روانہ کیا گیا اور یکم نومبر کو پہنچا۔ اس پیغام میں لکھا تھا۔ ”ہم خیریت سے ہیں اور چار مہینے تک خرطوم کو اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔“
حساب لگایا گیا تو چار مہینے گزر چکے تھے۔ اب اسٹیفن سن اور دوسرے انگریزوں کو فکر لاحق ہو گئی کہ معلوم نہیں جنرل گارڈن اب کس حال میں ہوگا۔
دسمبر کے آخر میں لارڈ ولزلی کورٹی نامی شہر کے سامنے پہنچ گیا۔ ابھی یہاں سے خرطوم بہت دور تھا۔ لارڈ ولزلی نے یہاں سے حکومت کو لکھا۔ ”یہاں سے میں کچھ توقف سے سفر کروں گا کیونکہ مجھے سامان رسد جمع کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ یہ سامان رسد میں جنرل گارڈن اور اس کے حامیوں کے لیے جمع کر رہا ہوں۔ وہاں رسد کی سخت قلت ہے اور گرد و نواح کا سارا ملک ویران ہو چکا ہے۔ بھاری سامان رسد کے بغیر خرطوم جانا کسی طرح مناسب نہیں۔“
کورٹی میں لارڈ ولزلی نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کی معلومات کے مطابق کورٹی سے متمہ تک خشکی کا راستہ بالکل محفوظ تھا۔ متمہ سے کشتیوں کے ذریعے خرطوم پہنچا جا سکتا تھا۔ اس طرح راستے کی طوالت کم ہو جاتی۔ وہ خود تو دریائے نیل کے ذریعے خرطوم کی طرف روانہ ہو گیا اور کچھ حصہ براہ خشکی متمہ بھیج دیا۔ جو دستہ خشکی سے سفر کر رہا تھا وہ میجر جنرل سر ہربرٹ اسٹورٹ کے زیر احکام تھا۔
سر ہربرٹ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بارہ سو سپاہی اور دو ہزار اونٹ کورٹی سے خدگل نامی بندرگاہ کی طرف روانہ کر دیے کیونکہ اس بندرگاہ سے متمہ نامی بندرگاہ تک زیادہ فاصلہ نہ تھا اور اگر راستے میں کہیں درویشوں سے مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تو ایک حصہ تو محفوظ رہتا۔
دوران سفر لارڈ ولزلی کو جنرل گارڈن کی طرف سے ایک پرزہ موصول ہوا۔ لانے والا کشتی میں آیا تھا۔ اس پرزے پر لکھا تھا۔ ”بہمہ وجوہ خرطوم میں خیریت ہے۔ سی۔ جی۔ گارڈن 14 دسمبر 1884ء۔“
اس شخص نے لارڈ ولزلی کو بتایا۔ ”پرزے کی عبارت مغالطے کے لیے ہے کہ اگر میں پکڑا جاؤں اور میرے پاس سے یہ پرزہ برآمد ہو جائے تو مہدی اور اس کے درویش اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ جنرل گارڈن اور اس کی فوج کے حوصلے بلند ہیں اور [illegible] آپ کے نام جنرل گارڈن کا زبانی پیغام یہ ہے۔ ”جنرل گارڈن اور فوج کو قلت خوراک کی وجہ سے انتہائی مشکلات کا سامنا ہے۔ خوراک کا سامان ختم ہونے کے قریب ہے۔ کسی قدر میدہ اور تھوڑے سے بسکٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہماری مدد کو جلد از جلد پہنچو۔“
اس شخص نے بتایا کہ دوسرا پیغام جنرل گارڈن نے اپنے کسی دوست کے پاس قاہرہ بھیجا ہے۔ یہ پیغام بھی مختصر اور زبانی تھا۔ ”بھائی! بس اب خاتمہ ہے۔ یقین ہے کہ ہفتے عشرے میں ہماری نئی مصیبتوں کا آغاز ہوگا۔ اگر اہل ملک ہماری مدد کرتے تو بہت [illegible]۔“

☆☆☆

[illegible] نے اپنا اختیار کر رکھی تھی۔ یہ فوج کرنل بارڈ کی نگرانی میں تھی۔ اسے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ میجر جنرل سر ہربرٹ [illegible]

راستے سے متمہ کی طرف جا رہا ہے۔ کرنل بارو نے سوچا کہ اس کی اطلاع کے مطابق راستے میں جگہ جگہ درویش موجود ہیں۔ انہیں اس نئی انگریزی فوج کی آمد کی خبر ضرور ہو جائے گی اور میجر جنرل سر ہربرٹ اعلیٰ میں بلاوجہ مارا جائے گا۔ اس نے سر ہربرٹ کو اطلاع بھیجی کہ آگے انہیں ابو طلیحہ نامی ایک قصبہ ملے گا۔ اس قصبے کے شمال مشرق میں پہاڑیاں ہیں اور ان پہاڑیوں پر مہدی کے درویش دیکھے گئے ہیں۔

جنرل سر ہربرٹ کو جب یہ پیغام ملا تو اس وقت وہ ابو طلیحہ پہنچ چکا تھا مگر اس پیغام نے جنرل کو خبردار ضرور کر دیا تھا۔

مہدی سوڈانی کے آدمیوں نے بھی اس لشکر کو متمہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی گھات میں بیٹھ گئے تھے۔ ابھی سر ہربرٹ نے مزید تین چار میل کا راستہ طے کیا ہو گا کہ اچانک درویشوں نے حملہ کر دیا۔

17 جنوری کی صبح ان دونوں فوجوں میں جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں سر ہربرٹ کو ایسا زخم لگا کہ وہ گھوڑے سے زمین پر آ گرا اور اس کی کمان سر چارلس ولسن نے سنبھال لی۔

جنگ نے خوفناک شکل اختیار کر لی۔ اب سر چارلس ولسن نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ کو فوراً چھوڑ دینا چاہیے اور فوج کو درویشوں کے ساتھ الجھا کر کسی طرح دریائے نیل کے ساحل تک پہنچ جانا چاہیے۔

درویشوں نے بطور خاص میجر جنرل سر ہربرٹ پر حملہ کیا۔ وہ اس شخص کو خرطوم کی طرح بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس مہم میں میجر جنرل سر ہربرٹ کی فوج کے ساتھ بہت سے اخباری نمائندے بھی سفر کر رہے تھے۔

درویشوں نے اتنا بھرپور اور جارحانہ حملہ کیا کہ سر ہربرٹ اپنی کامیابی کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ زخمی تو وہ تھا ہی۔ درویشوں نے انگریزی فوج کا صفایا کرتے ہوئے سر ہربرٹ کو قتل کر دیا۔

چارلس ولسن مایوسی کے عالم میں مصروف سپاہیوں کو کچھ بتائے بغیر کچھ فوج کو لے کر وہاں سے نیل کے ساحل کی طرف فرار ہو گیا۔

21 جنوری 1885ء کو چار جہاز مصری طرف سے آتے دکھائی دیے۔ یہ دخانی جہاز تھے۔ مصری سمجھے کہ یہ خرطوم سے صحیح خبر لے کر آئے ہیں اور انہیں اس خیال سے بے حد خوشی ہوئی لیکن یہ تاجروں کے جہاز تھے۔ ان کے پاس جنرل گارڈن کا ایک رقعہ بھی تھا۔ یہ رقعہ 29 دسمبر 1884ء میں لکھا گیا تھا۔ اس میں جنرل گارڈن نے لکھا تھا۔ ”ہم خرطوم میں بالکل امن و عافیت سے ہیں اور کئی سال تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔“

مگر زبانی حقیقی پیغام یہ تھا۔ ”میں نے خرطوم کو بچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن اب ماننا پڑے گا کہ ہماری حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور ہمیں چاروں طرف سے یاس و قنوطیت نے گھیر رکھا ہے۔ میں یہ بات اپنی حکومت سے ناراضگی کی بنا پر شکایتاً نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ حقیقتِ حال سے آگاہ کر رہا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر خرطوم دشمن کے پاس چلا جائے تو ہم کسالہ نامی جگہ پر بھی اپنے قبضے کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔“

جہاز بوردین کے مصری افسر عبدالحمید بے نے کسی طرح سر چارلس ولسن کو یہ پیغام بھیج دیا کہ خرطوم کے محصورین کی حالت بہت نازک ہے اور جنرل گارڈن کی فوج حکومت کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی ہے اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو، وہ خرطوم پہنچ جائے۔ یہ کام دس دن کے اندر اگر انجام کو پہنچ جائے تو مناسب ہو گا۔ اس کے بعد کمک کی ضرورت نہیں رہے گی۔

23 جنوری کو سارا دن روانگی کی تیاریاں ہوتی رہیں اور 24 جنوری کو چند جہاز خرطوم کی طرف روانہ ہو گئے۔

25 جنوری کا دن گزرا تو شہریوں نے مہدی سوڈانی کو ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ جنرل گارڈن اپنی فوج کو جھوٹے دلاسے دے کر خود جھوٹا قرار پا چکا ہے اور اب فوج اس کی کسی بات کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں اس لیے اسے ایک فیصلہ کن حملہ کر دینا چاہیے۔

اس پیغام کے ساتھ ہی مہدی کی توپوں نے آگ اگلنا شروع کر دی اور خرطوم کا حملہ زدہ علاقہ کرۂ نار بن گیا۔

شہر کی عیسائی آبادی بہت پریشان تھی اور ایک مشہور تاجر مارونی حقیقتِ حال جاننے کے لیے جنرل گارڈن سے ملنے گیا۔ محافظوں نے اسے روک دیا تو مارونی نے اپنے نام اور حیثیت سے محافظوں کو مطلع کیا اور کہا۔ ”تم جنرل گارڈن کو میرے بارے میں بتاؤ کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

(جاری ہے)

ماخذات

مشاہیرِ مشرق جرجی زیدان۔ مخابرات مصر و سوڈان مطبوعہ دہلی۔ حیات لارڈ کچنر، سر جارج آرتھر

چور اگر چور ہی رہے تو اس کے گرد دائرہ تنگ کرنا تھوڑا آسان ہوتا ہے مگر جب چور کو چوکیدار بنا دیا جائے تو اس کی خطرناکی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا... وہ بھی تو محافظ تھے مگر بدنیتی کے ہاتھوں ذلت اٹھانے پر مجبور ہو گئے کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے کاموں میں...

انتہائی عقلمندی سے بے وقوفی کے گڑھے کھودنے والوں کی تماشا گری

آڑ

عمران قریشی
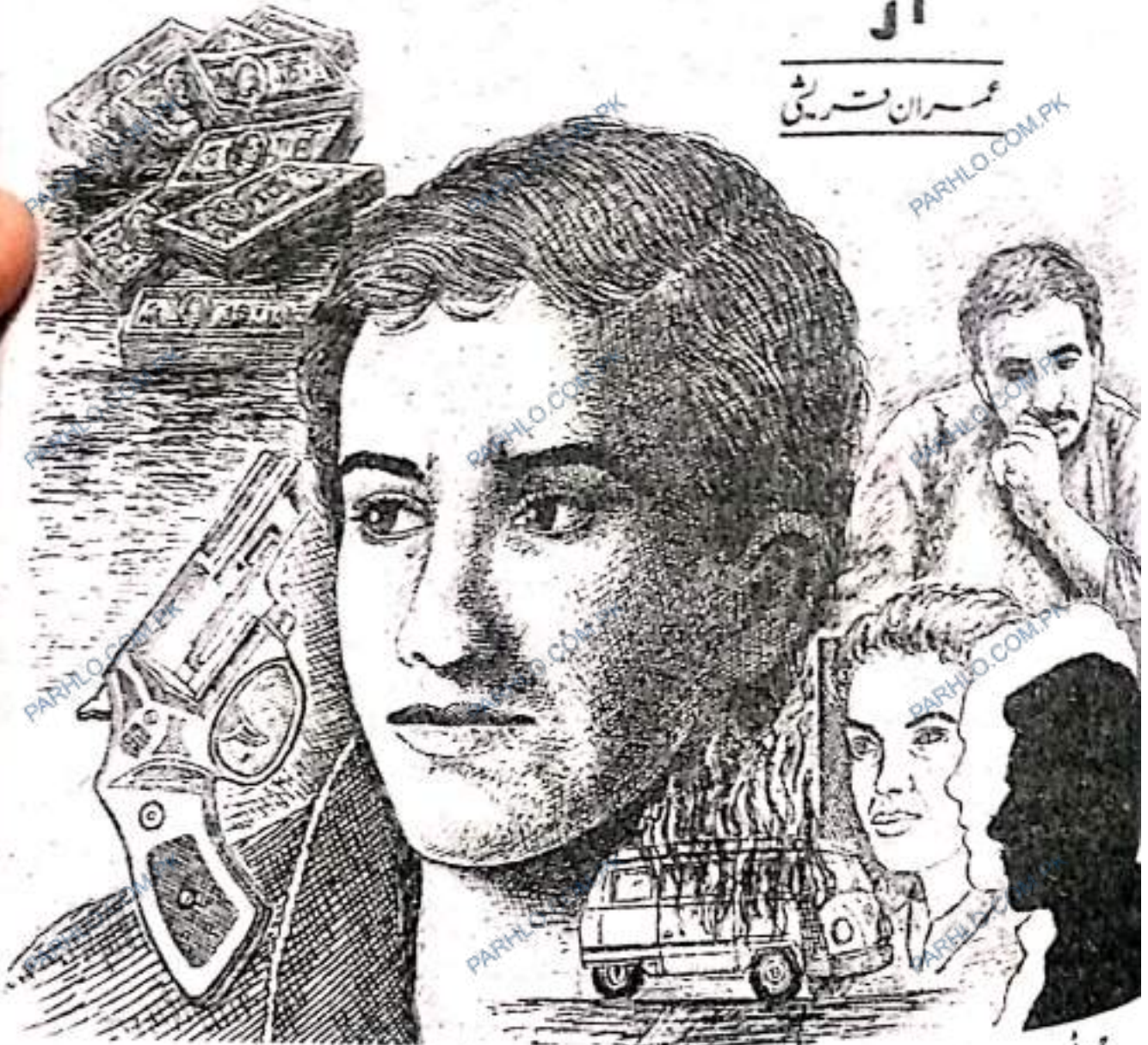
چھوٹی سی فیاٹ کار ساحلی ریسٹورنٹ کے قریب آ کر رکی اور پینتالیس سالہ ماریو ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر پینتیس سالہ بیٹھی ...تھا۔ اس نے کار سے نیچے اترنے کے بعد اپنی جیب کا ...لیا۔ اس کی جیب میں بچی کھچی رقم رات کے کھانے کے لیے ناکافی تھی اور اسے یقین تھا کہ ماریو ایک ڈالر بھی جیب سے نکالنے والا نہیں تھا۔ گاڑی سے باہر طوفانی ہواؤں کا راج تھا۔ ریڈیو پر بار بار موسلا دھار بارش کی پیش گوئی کی جا رہی تھی اس کے باوجود بھی ساحل سمندر پر سرپھرے اور بے فکرے نوجوانوں کی بہتات تھی۔ وہ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ

ڈال کر گھوم پھر رہے تھے۔

گاڑی سے باہر نکلتے ہی ساحلی ہواؤں نے ان دونوں کا حصار کرلیا اور ماریو کا ہیٹ اڑ کر دور جاگرا۔ بیغلی کا کوٹ بھی بدحواس ہو کر اڑنے والے کبوتر کی طرح پھڑپھڑایا لیکن اس نے توجہ دیے بغیر پھرتی کے ساتھ بھاگ کر ہیٹ کو دبوچ لیا اور فرماں بردار بچے کی طرح واپس لاکر ماریو کے ہاتھوں میں تھمادیا۔ اس نے ہیٹ کو سر پر خوب اچھی طرح جمایا پھر ریسٹورنٹ کا دروازہ کھول کر ہال کمرے میں آگیا۔ بیغلی اس کے پیچھے تھا۔ اندر داخل ہونے کے فوراً بعد ماحول پر یکلخت سکوت طاری ہوگیا جیسے بٹن گھما کر شور مچاتے ہوئے ریڈیو کی آواز کو یکدم بند کردیا گیا ہو۔ دونوں نے ایک خالی میز کا انتخاب کیا اور بیٹھنے کے بعد ویٹر کا انتظار کرنے لگے۔ ان دونوں کے دماغوں میں ایک چھوٹے بینک میں ڈکیتی کا منصوبہ پنپ رہا تھا۔ ساحلی ریسٹورنٹ میں آنے کا مقصد اس منصوبے پر غور وفکر کرنا تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد بیغلی نے ایک دفعہ پھر جیب میں سے پرس باہر نکالا اور تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دونوں ہڈسن ٹاؤن کے نیشنل بینک میں سیکیورٹی گارڈ تھے۔ چھٹی والے دن رات کا کھانا کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں آتے تھے اور اپنی جیب کے مطابق خرچ کرنے کے بعد رات گئے ٹاؤن کی طرف جاتے تھے۔ یہ مہینے کی آخری تاریخ تھی اس لیے بیغلی کی جیب میں رقم کم تھی اور ماریو اس بات پر بضد تھا کہ اگر رات کے کھانے کا بل بیغلی ادا کرے گا تب وہ اسے اپنے منصوبے میں شامل کرے گا بصورت دیگر وہ اپنے آپ کو منصوبے سے علیحدہ سمجھے۔

کاؤنٹر کے پیچھے سے ویٹر نکل کر ان دونوں کی طرف آگیا۔ ماریو نے اسے گوشت کے فرائڈ تکے اور سرخ شراب لانے کے لیے کہا۔ بیغلی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اس کی جیب اس آرڈر کی متحمل نہیں تھی۔ اب لے دے کر اس کے پاس یہی چارہ کار باقی بچا تھا کہ وہ ریسٹورنٹ کے مالک کی منت... کرکے اسے ادھار کے لیے راضی کرتا۔ ریسٹورنٹ میں آتے جاتے ہوئے اس سے سلام دعا ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مان جائے گا۔ ماریو نے جیب میں سے سستے برانڈ کا سگریٹ نکالا اور لائٹر سے جلانے کے بعد طویل کش لیتے ہوئے بولا۔

"تو تمہاری جیب میں بل ادا کرنے کے لیے رقم موجود نہیں۔ ہر مہینے کے آخر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم [illegible]

پڑے تو تم اس کا سامنا کیسے کرو گے؟ تمہاری اسی مفلسی کی وجہ سے کوئی بھی لڑکی تمہیں منہ نہیں لگاتی۔ [illegible] میرا بھی ہے تو کیوں نا اچھی سی منصوبہ بندی کرکے اتنی رقم حاصل کی جائے جس سے ڈھنگ کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن ہوسکے۔"

بیغلی طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ "یہ دوسری دفعہ ہورہا ہے کہ میری محبوبہ میری مفلسی کو دیکھ کر مجھے چھوڑ کر جارہی ہے۔ بینک کی تنخواہ اتنی محدود ہے کہ اپنے خرچے پورے نہیں ہوتے، محبوبہ کے کیسے برداشت کروں۔ مجھے اپنی آئندہ زندگی کے لیے حتمی اقدام کی اشد ضرورت ہے۔"

"تو پھر منصوبہ بندی کرلیتے ہیں۔" ماریو دھواں باہر اگلتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں نوعمری میں قتل کرچکا ہوں۔"

اس انکشاف پر بیغلی کے چہرے پر خفیف حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے۔ شدید اس لیے نہیں کیونکہ وہ خود بھی قتل کی سزا بھگت کر آیا تھا۔ اگر اس کی سزا میں تخفیف نہ کی جاتی تو شاید وہ اب بھی جیل میں ہی ہوتا۔ اسے ماریو کی آواز سنائی دی۔

"میرا باپ دوسری شادی کررہا تھا۔ میری عمر ان دنوں بہ مشکل پندرہ سال کی تھی۔ میں نے چاقو کے ایک ہی وار سے اس کا خاتمہ کردیا۔" اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ ویٹر آرڈر لے آیا۔ یہ ساحلی ریسٹورنٹ کی خاصیت تھی۔ آرڈر کی تکمیل یکدم کی جاتی تھی۔ ویٹر نے گوشت کے تکے اور شراب کی بوتل کو میز پر رکھا اور خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

ماریو نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھایا۔ بوتل کا ڈھکنا کھولنے کے بعد دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور اپنے گلاس میں سے چسکی بھرتے ہوئے بولا۔

"تنہا تو میں نے ویسے بھی رہنا تھا تو پھر دل کی بھڑاس نکال کر تنہائی کا مقابلہ کیوں نہ کرتا۔ میری ماں میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد فوت ہوگئی تھی۔ مجھے میری خالہ نے پالا۔ جب میں پندرہ سال کا ہوا تب خالہ بھی فوت ہوگئی۔ میرا باپ مجھے یتیم خانے بھجوانا چاہتا تھا تاکہ دوسری شادی کرکے گلچھرے اڑا سکے۔ میں نے چاقو کو اس کے سینے میں اتار دیا۔ اس کی موت موقع پر ہی واقع ہوگئی اور مجھے قتل کے الزام میں جیل بھجوادیا گیا۔ جرم کا [illegible] آڑ کا استعمال کرنا ہوگا۔ [illegible] بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے [illegible]

معلوم ہوا ہے کہ تمہارا واسطہ بھی پولیس سے پڑ چکا ہے۔ مجھے اس کے متعلق بتاؤ۔"

"پولیس اور میرا چولی دامن کا ساتھ ہے۔" بیغلی مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہاری طرح میں نے بھی نوجوانی میں قتل کیا ہے۔ تاہم اپنے باپ کا نہیں...... بلکہ محبوبہ کا......

"مجھے چھوڑ کر کالج کے پرنسپل کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ صاحب حیثیت تھا، گاڑیوں میں گھومتا پھرتا تھا اور مجھے روزانہ بسوں میں ذلیل وخوار ہوکر کالج آنا جانا پڑتا تھا۔ کالج کے پرنسپل کا بیٹا لنگڑا تھا۔ اس کی ٹانگ مارنے میں ٹوٹ گئی تھی۔ میں اس سے ہر لحاظ سے بہتر تھا سوائے اس کے کہ میرے پاس دولت کی کمی تھی۔ اس کی پاداش میں مجھے میری محبوبہ سے دستبردار ہونا پڑا جو کہ میرے لیے ناممکن تھا اور میری محبوبہ سے غلطی ہوئی کہ اس نے مجھے اپنی شادی کی اطلاع دینے کے لیے جس اسٹیشن کا انتخاب کیا وہاں مسافروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کی دوسری بدنصیبی یہ تھی کہ جب اس نے مجھے اپنی بے وفائی سے آگاہ کیا تب تیز رفتار ٹرین چھوٹے سے اسٹیشن کا رخ کررہی تھی۔ میں نے طیش میں آکر پوری طاقت کے ساتھ اسے دھکا دیا۔ وہ پٹڑیوں کے درمیان میں جاگری اور ٹرین نے اس کا قیمہ بنا کر رکھ دیا۔" بیغلی کے چہرے کے تاثرات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اسے دوبارہ قتل کرنے کے دوران وہ اپنے احساسات کے مجروح ہونے کی تلافی کررہا تھا۔

ریسٹورنٹ سے باہر بادل زور سے گرجا اور شیشے کی دیوار میں سے چمک عبور کرکے اندر آئی۔ ماریو نے گوشت کا قتلہ چھری اور کانٹے کے ساتھ کاٹ کر منہ میں رکھا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ لوگ آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ بعض طبعی موت مرتے ہیں اور بعض حادثے کا شکار ہوجاتے ہیں لیکن قتل ہونے والے یہ افراد قاتل کی زندگی پر اثر انداز ہوجاتے ہیں۔ میں نے اور تم نے قتل کرنے کی سزا بھگتی لیکن آج بھی ان شہروں کی طرف جانے سے کتراتے ہیں جہاں ہمیں جاننے والے افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لیے ہم نے ہڈسن ٹاؤن کا انتخاب کیا جہاں ہمیں بینک میں سیکیورٹی گارڈ کی نوکری بھی مل گئی۔"

"بینک میں رقم بہت زیادہ ہے۔ اگر ہمیں مل جائے تو [illegible] شراب [illegible]

انڈیلا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ کوئی اتنی آسان بات نہیں۔" ماریو گوشت کے ٹکڑے کو چباتے ہوئے بولا۔ "ہرچند کہ بینک کی سیکیورٹی ناقص ہے اور رقم بھی دوسرے بینکوں کی نسبت کم ہے تاہم میری معلومات کے مطابق چند دنوں میں دس لاکھ ڈالرز کی رقم بینک میں منتقل ہونے والی ہے۔ ہم اگر سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کریں تو یہ ناممکن نہیں کہ ہم رقم حاصل کرلیں۔"

بیغلی نے گوشت کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ماتھے پر لگے ہوئے کلنک کے ٹیکے کی بدولت پولیس کو ہم تک پہنچنے میں چنداں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بینک کے اسٹاف میں ہم واحد کام کرنے والے ہیں جن کا تعلق جیل سے ہے۔"

ریسٹورنٹ سے باہر گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش کا آغاز ہوگیا۔ ماریو نے اپنی پلیٹ میں مزید گوشت کے ٹکڑے ڈالے اور ان میں سے ایک کو منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں، ہم ڈکیتی کے لیے ایک آڑ کا استعمال کریں گے۔ تم نے بھی کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھا ہے۔ ان کٹھ پتلیوں کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے یا پھر اسٹیج ڈراموں میں کام کرنے والے فنکاروں کی طرح جن کے کردار و اداکاری کا تخلیق کرتا ہے۔ ہم بھی آڑ پیدا کرنے کے لیے ایک ڈراما تخلیق کریں گے۔ تم مجھے یہ بتاؤ، بینک میں منیجر کے علاوہ ورکرز کی تعداد کتنی ہے؟"

"صرف تین۔" بیغلی شراب کا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ "کیشئیر رچرڈ، کلرک بوبی اور اکاؤنٹنٹ ایلی۔ ان تینوں کے علاوہ سیکیورٹی پر ہم دونوں مامور ہیں۔"

"تو پھر یہ سمجھو کہ واردات یہ تینوں کریں گے۔" ماریو گوشت چباتے ہوئے بولا۔ "اور فرنشنگ بینک کا منیجر اپنے بیان میں پولیس کو بتائے گا کہ رچرڈ، بوبی اور ایلی نے رقم چرانے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی اور فرنشنگ کی حاضر دماغی کی وجہ سے بینک کی گاڑی کھائی کے اندر جاگری جس کی بدولت نہ صرف ان تینوں کی موت واقع ہوئی بلکہ رقم بھی جل کر راکھ ہوگئی۔"

"لیکن بینک کا منیجر فرنشنگ بھلا یہ بیان کیوں دینے لگا؟" بیغلی نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔ "کیا ان تینوں نے رقم چرانے کی ناکام کوشش کی اور وہ تینوں رقم کے ساتھ فرار کیوں ہونے لگے۔"

ماریو مسکراتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اب [illegible]

ابھی جاسوسی رقم بینک میں جمع ہوتی ہے۔ ہم رقم کو چھپا لیں گے اور جلنے سمیت گاڑی کو پہاڑ سے نیچے دھکیل دیں گے۔ اگر تین آدمیوں کی موت سے ہماری زندگیاں سنور سکتی ہیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" جیکی نے شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "اگر رقم برباد ہوگئی تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"پہلے میری پوری بات تو سن لو پھر تنقید کرنا۔" ماریو نے منہ بناتے ہوئے کہا پھر ادھ جلے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ وہاں ایک بار پھر زور سے گرج ہوئی، کمرے کا ماحول وقتی طور پر روشن ہوا پھر دوبارہ اندھیرا سا ہوگیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ماریو ہمکلام ہوا۔

"گاڑی کو نیچے دھکیلنے سے قبل ہم کاغذوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس گاڑی میں منتقل کردیں گے۔ پہاڑی سے نیچے گرنے کے بعد اس میں آگ لگ جائے گی اور سب کچھ جل کر بھسم ہوجائے گا۔ تم جان سکتے ہو کہ یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ فرینکلن ڈکیتی کو ناکام بنانے کے لیے انتہائی اقدام کے طور پر انہیں پہاڑی سے نیچے دھکیلے گا، بعد میں وہ وہی بیان قلمبند کروائے گا جو ہم اس کے دماغ میں ڈالیں گے۔"

جیکی کے چہرے پر حیرت بھرے تاثرات پیدا ہوئے لیکن اس کے کچھ کہنے سے قبل ماریو بولا۔

"پہلے فرینکلن کا بیان غور سے سن لو۔ وہ تفتیشی آفیسر کو بتائے گا کہ رقم چرانے کی منصوبہ بندی رچرڈ، ایلی اور بوبی نے کی۔ وہ تینوں اسے یرغمال بنا کر قصبے سے باہر لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گاڑی کے اسٹیئرنگ کو گھما کر گہری کھائی کی طرف موڑ دیا۔ یاد رہے کہ ڈرائیونگ سیٹ فرینکلن کے پاس ہوگی جبکہ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر ریوالور تھامے براجمان ہوں گے۔ ان تینوں کے ریوالوروں کا رخ فرینکلن کی طرف ہوگا۔ تفتیشی آفیسر کو بیان کے دوران فرینکلن مزید بتائے گا کہ گاڑی کھائی میں گرنے سے قبل اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگادی اس لیے اس کی جان بچ گئی لیکن تینوں ڈکیت وہیں جل کر ہلاک ہوگئے۔ ان کے ساتھ بینک سے چرائی ہوئی رقم بھی بھسم ہوگئی۔ تفتیشی آفیسر اس ڈکیتی کو ان تینوں کے کھاتے میں ڈال کر فائل بند کردے گا اور حالات موافق ہونے کے بعد ہم رقم کے ہمراہ نیویارک چلے جائیں گے۔"

"تمہارا منصوبہ [illegible]" [illegible] شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "مثلاً اگر گاڑی کو آگ نہ لگی تو وہ تینوں ہلاک ہونے سے بچ بھی سکتے ہیں یا پھر فرینکلن کی تقلید کرتے ہوئے ان تینوں میں سے کسی نے گاڑی سے باہر چھلانگ لگادی تب بینک منیجر کا بیان فضول ہوگا۔"

ماریو نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "گاڑی کو کھائی سے نیچے دھکیلنے سے قبل ہم پچھلے دروازے لاک کردیں گے اور بالفرض اگر گاڑی میں آگ نہ بھی لگی تب ہم خود نیچے جا کر لگا دیں گے۔ تفتیش کو آگے بڑھنے میں مدد دینے والے نشانات کو ختم کرنے میں یہ آگ معاون ثابت ہوگی۔"

جیکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب منیجر بیان قلمبند کروانے کے لیے آمادہ ہوگا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو وہ بہت سخت گیر طبیعت کا مالک ہے۔ اگر اس نے انکار کردیا تب کیا ہوگا؟"

"یہ سوال نہایت اہم ہے۔ ہماری ڈکیتی کے اس منصوبے میں جس شخص کے بیان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، وہ بینک کا منیجر فرینکلن ہے۔ اس کے بیان کے بعد پولیس کی توجہ ہم دونوں سے ہٹ کر بینک کے تینوں ورکرز پر مرکوز ہوجائے گی۔ تم خود سوچ سکتے ہو اگر منیجر بیان دینے سے انکاری ہوجائے تو ہم دونوں کو بھی تفتیش میں شامل کرنے کے بعد معلومات کا آغاز کردیا جائے گا اور انہیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی کہ ہم دونوں نہ صرف قاتل ہیں بلکہ عمر قید کاٹنے کے بعد اس بینک میں ملازمت کررہے ہیں اور یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ تین کے بجائے پانچ افراد ڈکیتی میں ملوث کرلیے جائیں۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ جیکی نے شراب کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھمادیا اور وہ گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"اب میں تمہیں ایک تیسرے اور اہم شخص کے متعلق بتاتا ہوں۔ اس کا نام ٹرائے ایڈ ہے تاہم ہم اسے ٹرائے کے نام سے مخاطب کریں گے۔ یہ ہڈسن ٹاؤن میں رہائش پذیر ایک انتہائی درجے کا شرابی ہے لیکن اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ دماغ پر قابو پالینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل نفسیات کے پروفیسر کی نوکری سے ریٹائرمنٹ لے چکا ہے اور اپنا سب کچھ شراب نوشی کی نذر کرنے کے بعد ان دنوں پائی پائی کا محتاج ہے۔ اسے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے اس سے بات کرلی ہے۔ وہ ایک لاکھ ڈالرز [illegible] تفتیشی آفیسر کو [illegible] حسب منشا بیان دے کر ہم دونوں کی [illegible] کرادیں گے۔"

جیکی نے پوچھا۔ "لیکن اگر عین وقت پر ٹرائے کام کرنے سے مکر گیا تب سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" ماریو بولا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ شراب پینے کا عادی ہے اور مفلسی کا یہ عالم ہے کہ ایک وقت کی روٹی اسے نصیب نہیں ہوتی۔ ایک لاکھ ڈالرز کے لیے تو وہ اپنی ماں کو بھی بیچنے کے لیے آمادہ ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم احتیاط کے دامن کو تھامتے ہوئے اسے رقم کام مکمل ہونے کے بعد ادا کریں گے۔ کل میں تمہیں ٹرائے سے ملواؤں گا۔ تم اسے اچھی طرح جانچ پرکھ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا انتخاب غلط نہیں ہوگا۔"

ویٹر بل لے کر میز کی طرف آیا۔ ریسٹورنٹ سے باہر کہیں قریب ہی بجلی گری۔ ایسی ہی کچھ بجلی بل دیکھنے کے بعد جیکی کے دماغ پر بھی گری۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں جیب میں سے پرس باہر نکالا۔ ماریو اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"آج کے کھانے کا بل میں دوں گا۔ اگر اگلے ہفتے نوبت آئی تو تم حساب چکتا کردینا۔" جیکی نے اطمینان کا سانس لیا اور دونوں بل ادا کرنے کے بعد گاڑی کی طرف آگئے۔

☆☆☆

ٹرائے ایڈ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر تھی لیکن بالوں کی وجہ سے ستر کا دکھائی دیتا تھا۔ اپنی آنکھوں پر عینک لگا رکھتا تھا۔ قد غیر معمولی طور پر لمبا اور کاٹھی مضبوط تھی تاہم اس کے باوجود بھی انتہائی درجے کا سست اور کاہل انسان تھا۔ لڑکپن میں کھینچ تان کر گزارہ کررہا تھا۔ جوانی میں جو کچھ کمایا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد شراب نوشی کی نذر کرچکا تھا۔ لے دے کر ولسن روڈ پر دو کمروں پر مشتمل فلیٹ بچا رہ گیا تھا۔ اگر اسے فٹ پاتھ پر مناسب جگہ مل جاتی تو فلیٹ فروخت کر کے وہاں منتقل ہوچکا ہوتا۔

جب ماریو اور جیکی نے فلیٹ میں قدم رکھا تو اس ملاقات کے لیے ٹرائے نے دل پر جبر کر کے اس دن شراب سے پرہیز کیا اس لیے کچھ بہتر حالت میں تھا۔ مختلف [illegible] صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹرائے مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تم دونوں کی خاطر مدارات [illegible] شراب کے لیے رقم بہت کم بچی ہے۔ میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے۔"

"ہم یہاں کھانے پینے کی نیت سے نہیں آئے۔" ماریو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج کی میٹنگ کی وجہ ہے، اگلے ہفتے کی رات ہم بینک میں ڈکیتی کریں گے۔ تم سے گفت و شنید کا مقصد یہ ہے کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔ اگلے ہفتے کی شام شراب نوشی سے پرہیز کرنا۔ تھوڑی سی غلطی بھی سارا کام بگاڑ سکتی ہے۔"

"میری شراب نوشی سے تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔ مجھے خود پر اعتبار ہے۔ میں زیادہ نہیں پیتا ہوں گا۔ چند ماہ قبل میری گاڑی چلانے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور مجھے بہت سے ڈالرز پر خرچ کرنا پڑا۔ یہ خرچہ شراب کے کوٹے پر بھی اثر انداز ہوا جس کی وجہ سے ہفتے کے آخر میں میرے پاس رقم ختم ہوگئی۔ مجبوراً مجھے غیر قانونی ہتھکنڈوں کا استعمال کرنا پڑا۔ تم دونوں یقین کرو، میں نے شراب کے ڈیلر کو ہپناٹائز کرکے بوتلوں کا پورا کریٹ ہتھیالیا۔" ٹرائے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

ماریو اور جیکی اچھل پڑے۔ ٹرائے ان کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اگر بات پولیس تک پہنچ جاتی تو مجھے سزا بھی ہوسکتی تھی اس لیے میں نے دوبارہ اس حرکت کا ارتکاب نہیں کیا۔"

"شراب ڈیلر کو معلوم نہیں ہوا کہ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟" ماریو نے پوچھا۔ "دکان سے شراب کی بوتلوں کا پورا کریٹ گم ہوجانا کوئی عام بات نہیں۔ اسے دوسرے دن معلوم ہوگیا ہوگا۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے تاہم وہ یہ معلوم نہ کرسکا کہ چوری کیسے ہوئی۔ یہ شعور اور لاشعور کا کھیل ہے۔ معمول بننے سے شعور کام آتا ہے اور معمول بننے کے بعد لاشعور حرکت میں آجاتا ہے تاہم وقتی طور پر عامل کا حکم ماننے کے بعد لاشعور واپس سوجاتا ہے لیکن اسے بیدار کرنے کے لیے عامل کی انگلی کی چٹکی کافی ہوتی ہے۔"

"ہمارے منصوبے میں فرینکلن کے بیان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ وہ معاملے کو بگاڑ بھی سکتا ہے اور بگڑا کام سنوار بھی سکتا ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق معمول وقتی طور پر حکم ماننے کے بعد سوجائے گا اور شعور جاگنے کے بعد کام شروع کردے گا۔ ایسی صورت میں وہ اپنے بیان سے منحرف بھی ہوسکتا ہے [illegible]"

"نہیں [illegible] وہ بیان سے نہیں مکرے گا۔" [illegible]

نے بتایا۔ اس کے لاشعور میں یہ بات محفوظ ہو کر رہ جائے گی کہ ڈکیتی کی جن افراد نے منصوبہ بندی کی، ان کے نام بالترتیب رچرڈ، بوبی اور ولی ہیں۔ تم اس بات سے بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔ ماریو نے مجھے ان ناموں سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ آج بھی یہ نام میرے شعور اور لاشعور دونوں میں محفوظ ہیں۔ میں شراب نوشی کے دوران بھی انہیں بھلا نہیں سکتا۔"

"تمہارے کام میں اہمیت آنکھوں کی ہے۔ تم ان کے ذریعے معمول کے دماغ تک رسائی حاصل کرتے ہو اور یقیناً اس وقت معمول کو تمہارے سامنے ہونا چاہیے۔ ہفتے کی شام معمول بننے والے فرینکلن کو یہاں فلیٹ پر لانا ہوگا۔ ہمیں تفصیل سے آگاہ کرو۔ اس دوران تم کہاں ہو گے؟" ماریو نے پوچھا۔

"میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نے شراب ڈیلر کو کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر معمول بنایا تھا حالانکہ میں نے اس کے لاشعور میں کوئی احکامات منتقل نہیں کیے تھے۔ صرف اپنے ارادے کا اظہار کیا تھا لیکن اگر میں کرنا چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مثلاً میں اسے حکم دیتا کہ وہ روزانہ ایک [illegible] شراب کی بوتلوں کا میرے فلیٹ پر بھجوا دیا کرے تو وہ [illegible] کرتا لیکن اس صورت میں شعور اور لاشعور میں [illegible] شعور تفتیش کا آغاز کر دیتا اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم بینک منیجر کو میرے فلیٹ پر لاؤ یا پھر مجھے اس کے پاس بینک میں لے چلو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اسے آنکھوں کے ذریعے بے حس کر دوں گا اور احکامات لاشعور میں محفوظ کرنے کے بعد اسے بیان دینے کے لیے آمادہ کر دوں گا اور میرے سامنے سے ہٹنے کے بعد اس کا شعور روزمرہ کے معمولات کے مطابق کام کرے گا لیکن تفتیشی آفیسر کو بیان دینے کے دوران شعور سو جائے گا اور لاشعور جاگنے کے بعد وہی بیان دے گا جس کے متعلق میں اسے حکم دوں گا۔"

"منیجر کو معمول بنانے کے لیے تمہیں اس کی قوتِ مدافعت کو ختم کرنے کے لیے انجکشن کا سہارا لینا ہوگا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ اگر معمول کی قوتِ مدافعت زیادہ ہو تو وہ عامل پر حاوی بھی ہو سکتا ہے۔" ہیگلی نے پوچھا۔

"مجھے اپنی قوتِ ارادی پر اعتبار ہے۔" [illegible] بولا۔ "شراب نوشی نے اسے کسی حد تک متاثر کیا ہے لیکن اب بھی آنکھوں کے ذریعے کسی بھی انسان کو بہ خوبی تسخیر کر سکتا ہوں اور [illegible] کے لیے [illegible] انجکشن [illegible]

ضرورت نہیں۔" اس نے یکلخت آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کو اتار دیا۔

خدا کی پناہ..... ماریو اور ہیگلی کو یوں محسوس ہوا جیسے ان دونوں نے لاعلمی کے دوران دھوپ کی جانب دیکھ لیا ہو۔ ان کی آنکھیں وقتی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے جھٹکے کے ساتھ ان کو بند کر لیا۔ کچھ دیر بعد جب کھولا تو ٹرائے عینک لگا چکا تھا۔ انہیں اس کی آواز سنائی دی۔

"میں نے ان پر بہت محنت کی ہے اس لیے اب مجھے قوتِ مدافعت کو ختم کرنے کے لیے کسی انجکشن کی ضرورت نہیں۔ میں بہ آسانی کسی کے بھی شعور پر قابو پا سکتا ہوں۔"

"مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو پھر بینک سے اکیلے رقم کیوں نہیں چرا لیتے؟ ہمارے شعور تمہاری آنکھوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" ہیگلی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں......" ٹرائے نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے شعور پر حاوی ہونے کے لیے معمول کے لاعلم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم دونوں چونکہ میری طاقت سے واقف ہو اس لیے تم پر حاوی ہونا میرے لیے ممکن نہیں اور اس صورت میں مجھے واقعی تم دونوں کی قوتِ مدافعت ختم کرنے کے لیے انجکشن لگانے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اس کے علاوہ میں عمر کے اس حصے میں قدم رکھ چکا ہوں جہاں خواہشات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مجھے شراب کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے جیسے ایک ہیروئنچی کے سامنے تم دنیا جہان کی دولت رکھ دو تو وہ اس میں سے صرف اتنی رقم کا انتخاب کرے گا جتنی رقم سے اس کا نشہ بہ آسانی پورا ہو جائے۔ ایک لاکھ ڈالرز میرے نشے کے لیے کافی ہیں۔"

ہیگلی نے تحسین نگاہوں سے ماریو کی طرف دیکھا اور وہ بولا۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کی شام کو فرینکلن کو یہاں لے آؤں گا۔ ایک اچھے اور تگڑے اکاؤنٹ کو حاصل کرنے کی خاطر وہ کہیں بھی جانے کے لیے آمادہ ہو سکتا ہے اور وہ اکاؤنٹ ہولڈر ٹرائے ایڈ ہوگا۔ اس ملاقات کے دوران ٹرائے اس کو ہپناٹائز کرے گا اور یہ عمل ہم دونوں کے سامنے کیا جائے گا۔ بعد ازاں بیان ریکارڈ ہونے کے فوراً بعد ہم فرینکلن کو رقم کی ادائیگی کر دیں گے۔" اس بار ہیگلی اور ٹرائے خاموش رہے اس لیے مزید چند پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد میٹنگ کو برخاست کر دیا گیا۔

☆☆☆

[illegible] ماریو نے فرینکلن [illegible]

کے کرنے کا رخ کیا۔ اس کی عمر پچاس برس سے پچپن کے درمیان تھی اور وہ سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ قلموں کی سفیدی اور آنکھوں پر لگی نفیس شیشوں والی عینک اسے باوقار دکھانے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس کی عینک کو دیکھ کر ماریو تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ شیشہ ہپناٹائز کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔ ٹرائے کی آنکھوں کی طاقت عینک کی وجہ سے اس کی آنکھوں تک محدود رہتی تھی اس لیے فرینکلن کی عینک اسے معمول بننے سے بھی روک سکتی تھی لیکن اس وقت ان باتوں کو سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس پر بعد میں بھی غور کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تو اسے اس بات پر قائل کرنا مقصود تھا کہ وہ ہفتے کی رات کو ٹرائے سے ملنے کے لیے اس کے فلیٹ پر چلا جائے۔ ہر چند کہ تعطیل والے دن کام کرنا فرینکلن کی عادت میں شامل ہوتا تھا تاہم کسی کے فلیٹ پر جا کر اسے بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے قائل کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔ اگر وہ انکار کر دیتا تو ٹرائے اس پر ہپناٹائز کرنے کے لیے بینک میں بھی آ سکتا تھا۔

ماریو قریبی کرسی پر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ بینک بند ہونے کے بعد تم عموماً گالف کھیلنے کے لیے گراؤنڈ جاتے ہو اور ہفتے کی تمام شام تمہارے لیے ٹورنامنٹ کی وجہ سے بہت اہم ہوتی ہے لیکن جہاں کام کی بات ہو، وہاں کھیل کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔"

فرینکلن کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص معمولی گارڈ تھا اور اسے محنت کر کے اپنے عہدے سے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں بینک کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا اور وہ اسے [illegible] پر گھر روانہ ہونے پر [illegible] اس لیے تلخ لہجے میں بولا۔ "اپنی نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھو اور مدعے کے متعلق بات کرو، میرے پاس وقت کم ہے۔"

"میں بتا رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ دور ولسن روڈ پر [illegible] ریٹائرڈ پروفیسر رہائش پذیر ہے۔ وہ اپنی جمع پونجی [illegible] کرنے کے لیے بینک میں اکاؤنٹ کھولنا چاہتا ہے اور [illegible] کے لیے تم سے بات چیت کرنے کا متمنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے کل صبح بینک میں بلا لو۔ میں بات [illegible]" فرینکلن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"[illegible] وہ یہاں نہیں آ سکتا۔" ماریو نے بتایا۔ "اس [illegible]

پچاس ہزار ڈالرز بینک میں جمع کروانا چاہتا ہے۔"

"مجھے اس کی مجبوریوں کے متعلق بتاؤ لیکن مختصر الفاظ میں۔ میں گالف کے گراؤنڈ میں کسی کو وقت دے چکا ہوں، وہ وہاں میرا انتظار کر رہا ہے۔" فرینکلن نے بیزاری لہجے میں پوچھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ماریو بولا۔ "وہ دل کا مریض ہے۔ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے سے منع کر رکھا ہے۔ اگر اس کی طبیعت ناساز نہ ہوتی تو وہ بینک میں رقم بھی جمع نہ کرواتا۔ اسے بینک کی سیکیورٹی پر اعتبار نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زیادہ تر ڈکیتیوں میں بینک کا عملہ ملوث ہوتا ہے۔ تاہم بیمار ہونے کے بعد اب وہ مجبوراً اپنی رقم کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کروانا چاہتا ہے۔ میں نے اسے تمہارے متعلق بتایا تو وہ ہفتے کی شام کو ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔"

"ہفتے کو ٹورنامنٹ کے بعد میرے پاس بہ مشکل تمام کھانے کا وقت ہی بچتا ہے اور میں کھانے کو کام پر ترجیح دیتا ہوں۔" فرینکلن نے انکار میں سر ہلایا۔

"تم کھانا ٹرائے کے فلیٹ پر بھی کھا سکتے ہو۔ وہ کافی فراخ دل اور مہمان نواز انسان ہے۔ طعام بھی ہو جائے گا اور بینک کے متعلق اس کی بدگمانی بھی دور ہو جائے گی۔"

فرینکلن سوچ میں پڑ گیا۔ پچاس ہزار ڈالرز ابھی خاصی بڑی رقم تھی۔ اگر بینک میں منتقل ہو جاتی تو اچھا خاصا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اسے اپنی ترقی کے لیے ان دنوں ایک تگڑے اکاؤنٹ کی اشد ضرورت تھی۔ رات کے کھانے کی تجویز تھی۔ وہ کچھ تاخیر سے بھی تناول کر لیتا تو مضائقہ نہیں تھا اس لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ملاقات کے لیے تیار ہوں لیکن یہ ملاقات مختصر ہوگی اور میں بات چیت کرنے کے فوراً بعد گھر چلا جاؤں گا۔"

ماریو نے اسے یقین دلایا کہ ٹرائے کا اکاؤنٹ اس کے اور بینک کے حق میں مفید ثابت ہوگا اور وہ کوشش کرے گا کہ فرینکلن کا وقت ضائع نہ ہو۔ اس طرح یہ ملاقات بہ احسن و خوبی اپنے اختتام کو پہنچی۔

کچھ دیر بعد فرینکلن اور بینک کا عملہ عمارت سے رخصت ہو گیا تب ماریو نے ہیگلی کو ساتھ لیا اور درمیانی کمرے کی طرف آ گیا۔ یہاں کیشیئر، کلرک اور اکاؤنٹنٹ کے کاؤنٹر بالترتیب بنے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں جانب بینک کا پچھلا دروازہ تھا۔ یہاں بیک یارڈ میں بینک کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے بولا۔

[illegible]

قل ہے۔ دھماکے سے پھٹنے کے بعد کچھ باقی نہیں بچے گا۔"

"ہفتہ وار تعطیل کی وجہ سے بینک بند ہوگا۔ انہیں یہاں وہ کیسے لائیں گے؟" بیٹلی نے پوچھا۔

"فون کر کے۔" ماریو بولا۔ "بینک کا عملہ اتوار کے علاوہ تعطیل کو کسی بھی وقت منسوخ کر سکتا ہے۔ اگر انہیں رقم بینک میں منتقل ہونے کی امید ہو تو عملے کو کام کے لیے بلالینا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کیشیئر رچرڈ کے پاس والٹ روم کی دوسری چابی موجود ہے۔ ہم رقم کو بینک میں منتقل کریں گے اور کاغذوں سے بھرے ہوئے بیگ کے ہمراہ رچرڈ، بوبی اور ایلی کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے کار میں منتقل کر کے ہڈسن ٹاؤن کے پہاڑ پر لے جا کر ان تینوں سمیت گاڑی کو نیچے دھکیل دیں گے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس ڈکیتی میں ہم دونوں ملوث ہو سکتے ہیں۔ فرینکلن معمول بنتے کے بعد پولیس کو بیان دے گا کہ رچرڈ، بوبی اور ایلی نے گن پوائنٹ پر رقم ہتھیانے کے بعد بینک کی گاڑی میں منتقل کی اور اسے گاڑی میں بٹھا کر پہاڑوں کی طرف لے آئے لیکن فرینکلن نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گاڑی کا اسٹیئرنگ کھائی کی طرف موڑ دیا اور خود دروازہ کھولنے کے بعد گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ اسے چند خراشیں آئیں لیکن بینک کا عملہ رقم کے ساتھ جل کر ہلاک ہو گیا۔"

"پولیس ہم سے پوچھ گچھ کرے گی کہ ڈکیتی کے دوران ہم کہاں تھے؟ ہم انہیں کیا جواب دے کر مطمئن کریں گے؟" بیٹلی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"انہیں مطمئن کرنے کے لیے فرینکلن کا بیان ہی کافی ہوگا۔ رچرڈ، بوبی اور ایلی نے گن پوائنٹ پر جو بھی کیا، وہ بینک کے اندر جانے کے بعد کیا جبکہ ہم بینک کے باہر نگرانی کرتے رہے اس لیے ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہماری حیثیت تو اس بات کی بھی مجاز نہیں کہ ان سے یہ پوچھ سکتے کہ چھٹی ہونے کے باوجود بھی وہ بینک میں کیا کرنے آئے تھے اور اندر جانے کے بعد جو بھی ہوا، ہماری لاعلمی میں ہوا۔ انہوں نے کیسے والٹ روم کو کھولا اور کیسے رقم کو گاڑی کے اندر منتقل کیا پھر بیگ کو گاڑی میں ڈال کر کیسے پہاڑوں کی طرف گئے؟ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔"

"لیکن اس تمام کے دھرے میں ایک قباحت ہے۔" بیٹلی بولا۔ "رچرڈ کے پاس والٹ روم کی چابی موجود ہے۔ وہ فرینکلن کو اغوا کیے بغیر بھی والٹ روم کو کھول کر رقم کے ساتھ فرار ہو سکتا ہے پھر اسے اس تمام دردسری کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ نکتہ میرے دماغ میں بھی موجود ہے اس لیے میں نے فرینکلن کے بیان میں تبدیلی کر دی ہے جس کے مطابق والٹ روم کی چابی صرف فرینکلن کے پاس تھی۔ اصولاً بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔" بیٹلی نے اس دفعہ کوئی سوال نہیں پوچھا اور ماریو طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں ہم تمام نکتوں پر نظرثانی کر چکے ہیں۔ تم گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں کے لاک خراب کر دو۔ کوشش یہ کرنا، وہ دروازے باہر سے کھل جائیں لیکن اندر سے انہیں کھولنا ممکن نہ ہو سکے۔" بیٹلی نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کے دروازوں میں ردوبدل کرنے لگا۔

☆☆☆

ہفتے کی دوپہر ماریو نے رچرڈ، بوبی اور ایلی کو فون کیا کہ ہیڈ کوارٹر سے خطیر رقم ایک دن کے لیے بینک بھجوائی جارہی ہے اس لیے ان سب کی چھٹی کو وقتی طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ وہ فوراً بینک آجائیں تاکہ وصولی کے بعد رقم کو والٹ روم میں منتقل کیا جا سکے۔ تینوں تلملا کر رہ گئے تھے مگر بولنے کو کچھ نہیں اور پانچ بجے بینک آگئے۔ ان کے چہروں پر جھنجلاہٹ کے تاثرات تھے۔ ہال کمرے میں داخل ہونے کے بعد رچرڈ جھنجھلائے لہجے میں بولا۔

"میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ساحلی ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے جانے والا تھا۔ میں نے جب اسے چھٹی منسوخ ہو جانے کے متعلق بتایا تو وہ بہت برہم ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہانہ بنا رہا ہوں اور درحقیقت میری جیب میں رقم نہیں ہے۔"

بوبی بولا۔ "میں نے ہفتہ وار خریداری کے لیے قریبی شاپنگ سینٹر جانا تھا۔ مجبوراً ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب شاید اگلے ہفتے تک مجھے ہمسایوں سے مانگ کر گزارہ کرنا ہوگا۔"

"تم دونوں کی بہ نسبت میں گھر میں بور ہو رہا تھا۔" ایلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "کام کے دوران میں خوش رہتا ہوں اور مجھے بوریت محسوس نہیں ہوتی۔" اس نے ماریو کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ "لیکن فرینکلن کہاں ہے.... اسے یہاں موجود ہونا چاہیے تھا؟"

ماریو اور بیٹلی قریب کھڑے ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ماریو بولا۔ "وہ اپنے فلیٹ سے روانہ ہو چکا ہے۔ جلد یہاں پہنچ جائے گا۔"

"اور رقم کہاں ہے؟" رچرڈ نے پوچھا۔ "کیا بینک پہنچ گئی ہے یا پھر آنے کی امید ہے؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتے۔" ماریو نے جواب دیا۔ "ہیڈ کوارٹر سے فون آیا تھا۔ شاید رات تک آجائے گی۔ انہوں نے حتمی طور پر کچھ نہیں بتایا۔" وہ تینوں خاموش ہو گئے۔

بینک کے بیک یارڈ میں گاڑی تیار کھڑی تھی۔ صرف رقم کے بجائے ان تینوں کو اس میں منتقل کرنا تھا۔ گزشتہ روز ماریو قریبی مارکیٹ سے سیاہ رنگ کے دو بیگ خرید لایا تھا۔ کاغذ کی گڈیاں بنانے میں اچھا خاصا وقت لگا۔ اب کاغذوں سے بھرا بیگ گاڑی کی پچھلی سیٹ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ بیٹلی نے کن انکھیوں سے ماریو کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے جیب میں سے سروس ریوالور باہر نکالا اور درشت لہجے میں تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں وقت بہت ضائع ہو گیا۔ اب کام کی بات ہو جائے۔ فرینکلن کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ تم تینوں کی چھٹی منسوخ کر دی گئی ہے۔ وہ تو گالف کھیلنے کے لیے گراؤنڈ کی جانب گیا ہوا ہے۔ ہم دونوں کو والٹ روم کی چابی درکار تھی اس لیے ہم نے فون کر کے تمہیں یہاں بلایا۔"

"کیا تم دونوں بینک میں ڈکیتی کے متعلق تو نہیں سوچ رہے ہو؟" بوبی پریشان لہجے میں بولا۔ "تو پھر مجھے اور ایلی کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ والٹ روم کی چابی رچرڈ کے پاس ہے۔ تم اس سے حاصل کر سکتے ہو۔"

رچرڈ نے فوراً جیب سے چابی نکال کر ماریو کے ہاتھ پر رکھی اور ہراساں لہجے میں بولا۔ "میں چند ڈالرز کے بدلے اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ والٹ روم میں رکھی ہوئی رقم بیمہ شدہ ہے۔ بینک کو نقصان نہیں ہوگا۔ تم رقم لے اڑو۔"

"اگر تم تینوں نے یوں ہی تعاون کیا تو ہم وعدہ کرتے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہاں قریب رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جاؤ اور خبردار! کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" بیٹلی مسکراتے ہوئے بولا۔

تینوں خاموشی کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیٹلی نے ماریو کے ہاتھ سے چابی لی اور والٹ روم کی طرف چلا گیا۔ والٹ روم کو کھولتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اندر رقم اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے بیگ میں منتقل کرنے کے دوران اسے یوں لگا جیسے ایک مزید بیگ منگوانا پڑے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی اور تمام رقم تنگ تان کر بیگ میں آگئی۔ اس تمام عمل [illegible]

جبکہ اس کے ہاتھوں کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے والٹ روم کے ہینڈل کو بھی اچھی طرح صاف کر دیا۔ ہال کمرے میں ماریو تینوں پر پستول تانے خاموش کھڑا تھا۔ بیٹلی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔ بینک کا عملہ بھیگی بلی کی طرح ڈرپوک ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے بھی چیخنے کی کوشش نہیں کی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد ماریو نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سر کی جنبش میں بتایا۔

"رقم توقع سے زیادہ ہے۔ اندازاً چند لاکھ ڈالرز تو ضرور ہوگی۔"

"چند لاکھ نہیں۔ اٹھارہ لاکھ۔" رچرڈ درمیان میں بولا۔ "چند دن پہلے ہی ایک پیٹرول پمپ فروخت ہوا تھا اور فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو بینک میں منتقل کر دیا گیا۔ تم دونوں خوش نصیب ہو جو تمہارے ہاتھ اتنی بڑی رقم کے مالک بن گئے ہو۔ اگر کچھ صبر کر لیتے تو ایک اور پیٹرول پمپ کی خرید و فروخت کی بات بھی جاری ہے۔ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی ہمارے بینک میں جمع ہونے کی توقع ہے۔"

رقم کے متعلق سن کر ماریو کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور کانپ کر رہ گیا۔ فرانسس کو ایک لاکھ ڈالرز دینے کے بعد بھی اس کے حصے میں ساڑھے آٹھ لاکھ ڈالرز آنے والے تھے۔ وہ اس رقم سے اپنا پیٹرول پمپ خرید سکتا تھا لیکن اتنی جلدی وہ منظر عام پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے چند سال احتیاط سے کام لینا تھا۔ بیٹلی نے بیگ کو بغل میں دبایا اور ماریو نے تینوں کو بیک یارڈ میں کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ وہ تینوں ان کے آگے چلتے ہوئے بیک یارڈ میں آگئے۔ ماریو نے انہیں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیٹلی نے گیٹ کھول دیا۔ ہفتہ وار تعطیل کی وجہ سے سڑک سنسان پڑی تھی اس لیے ٹریفک بھی کم تھا۔ گاڑی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی بیٹلی نے گیٹ کو بند کیا اور ماریو کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اپنے ریوالور کا رخ ان تینوں کی طرف کر دیا۔ وہ پتھر کے بت بنے خاموش بیٹھے تھے۔ گاڑی اندرونی علاقے سے نکلنے کے بعد مین سڑک پر آگئی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد رچرڈ بولا۔ "تمہیں [illegible]

سے یہاں تمہیں سب جانتے ہیں۔ اگر کسی راہ گیر نے تم دونوں کو دیکھ لیا تو ہمیں کو بتا سکتا ہے۔"

"ہم اس کے متعلق تم سے بہتر جانتے ہیں۔" ماریو گاڑی کی رفتار کو مزید بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔"

بیٹی نے رقم والے بیگ کو اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ تب بھی وہ مطمئن نہیں تھا اور کچھ دیر بعد اسے دیکھ لیتا تھا۔ ان دونوں نے بینک کے دن کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ عام دنوں میں گاڑیوں کا رش سڑکوں پر زیادہ ہوتا تھا۔ ہفتے کی شام کو صرف وہی افراد باہر نکلتے تھے جنہوں نے خریداری کرنا ہوتی تھی۔

گاڑی شہر سے باہر آ گئی۔ ایلی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ "تم کیا کرنے والے ہو؟ تم تمہیں مل گئی ہے اب ہم تمہارے لیے بے کار ہیں تو ہمیں جانے دو۔"

"ایسے کیسے جانے دیں۔" ماریو مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم ہمارے لیے آزاد ہو۔ دوسرے معنوں میں یرغمال بھی کہہ سکتے ہو۔ اگر ہمیں کسی نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم تینوں کے وجود ایک ڈھال کی طرح ہمیں اپنے پیچھے چھپا لیں گے۔ تاہم تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے بعد ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔" اس نے گاڑی پہاڑ کے اوپر جانے والے راستے پر موڑ دی۔

پیچھے بیٹھے ہوئے تینوں افراد کے چہروں پر تشویش کے تاثرات پیدا ہوئے۔ یہ راستہ پہاڑ کی چوٹی پر جا کر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ وہاں کوئی ایسا محفوظ مقام نہیں تھا جہاں وہ رقم کے ساتھ چھپ سکتے لیکن اس بار انہوں نے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ گاڑی میں گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔

چوٹی پر پہنچنے کے بعد ماریو نے گاڑی کو ایک ایسے مقام پر روک دیا جہاں سڑک ختم ہو رہی تھی اور نیچے گہری کھائی دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں سے اگر ایکسلریٹر دبا دیا جاتا تو گاڑی قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے چلی جاتی۔ ماریو نے بیٹی کو اشارہ کیا۔ وہ رقم والے بیگ کو لے کر نیچے اتر گیا۔ رچرڈ، ایلی اور بوبی کے چہروں پر تذبذب کے تاثرات پیدا ہوئے۔ انہیں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بیٹی کے نیچے اترتے ہی ماریو نے ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی آگے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے آپ کو پتھروں پر گرا دیا۔ اسے اپنے پیچھے رچرڈ، ایلی اور بوبی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں پھر یکدم خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ پتھروں پر کاندھے کے بل گرا۔ اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا اور وہ لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ بیٹی قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب آ گیا اور پرتشویش لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ میں مدد کروں؟" ماریو کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کر کھائی کی طرف آ گیا۔ اسی اثنا میں زوردار دھماکا ہوا۔ شعلے کافی اوپر تک آئے۔ ماریو نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ گاڑی میں آگ لگ گئی تھی اور کالا دھواں تیزی کے ساتھ اردگرد پھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں پھرتی کے ساتھ کھائی میں اترنے لگے۔ وہاں کوئی معقول راستہ نہیں تھا۔ اونچے نیچے پتھر اور جھاڑیاں تھیں جن کو پھلانگنا آسان نہیں تھا۔ انہیں نیچے اترنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس وقت تک گاڑی اچھی طرح جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اس علاقے میں مستقل آبادی نہیں تھی۔ دور دور تک خشک پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ رچرڈ، بوبی اور ایلی کی لاشیں گاڑی کے اندر بند تھیں اور کاغذوں سے بھرا ہوا بیگ بھی جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے تنقیدی نگاہوں سے گاڑی کا جائزہ لیا پھر متبادل راستے کا انتخاب کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ کچھ دور آگے جانے پر انہیں بس مل گئی اور وہ طویل سفر طے کرنے کے بعد قصبے میں پہنچ گئے۔

جہاں بس نے انہیں اتارا، وہاں سے ولسن روڈ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل چلتے ہوئے ٹرائے کے فلیٹ کی طرف آ گئے۔ دروازے پر سالخوردہ تالا لگا ہوا تھا۔ یہ ناممکن بات تھی۔ آدم بیزار پروفیسر فلیٹ سے باہر جا ہی نہیں سکتا تھا تاہم یہ ہو سکتا تھا کہ اس کی شراب کا کوٹا ختم ہو گیا ہو اور وہ قریبی شراب ڈیلر کے پاس شراب لینے گیا ہو لیکن ماریو نے فلیٹ سے رخصت ہوتے ہوئے کچن میں جھانک کر دیکھا تھا۔ وہاں بوتلوں کا پورا کریٹ رکھا ہوا تھا۔ بات کچھ اور ہی تھی۔ اس نے ساتھ والے فلیٹ پر دستک دی۔ ایک پچیس سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور تیکھی نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

ماریو نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کے ساتھ والے فلیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ ہمیں اس کے رہائشی سے کچھ معلومات درکار ہیں۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں گیا ہے؟"

"کچھ دیر پہلے وہ شراب نوشی کی وجہ سے سیڑھیوں سے نیچے جا گرا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی۔ فلیٹ کے رہائشی اسے قریبی اسپتال لے گئے ہیں۔" لڑکی نے افسوس بھرے لہجے میں بتایا۔

ماریو نے پریشان نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ بیٹی بھی کچھ کم پریشان نہیں تھا۔ ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ فرینکلن آٹھ بجے رات کا کھانا کھاتا تھا۔ ان دونوں کے پاس صرف آدھے گھنٹے کا وقت باقی تھا تاہم دیر سویر کی صورت میں طعام کو نو بجے تک ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ جو بھی تھا انہیں آج رات فرینکلن کو معمول بتانے کے بعد بیان کے لیے تیار کرنا تھا اس لیے عجلت کے عالم میں لڑکی سے اسپتال کا ایڈریس معلوم کرنے کے بعد عمارت سے باہر آ گئے۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے انہوں نے بس میں جانے کے بجائے ٹیکسی کا انتخاب کیا۔ اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جلد وہاں پہنچ گئے۔ اس اثنا میں ٹرائے کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وارڈ بوائے نے ان دونوں کو اندر جانے سے روک دیا۔ ڈاکٹر کا کمرا قریب تھا۔ وہ ان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ بینک میں تھا اور وہ اکثر و بیشتر فرینکلن سے ملاقات کے لیے بینک میں آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ جان پہچان ان دونوں کے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ ملاقات کے لیے ڈاکٹر کے کمرے میں آ گئے۔ اس نے تیکھی نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

ماریو نے ٹرائے کے متعلق دریافت کیا تو ڈاکٹر نے بتایا۔ "اس کی حالت اب قدرے بہتر ہے لیکن دماغ پر لگنے والی چوٹ کی بدولت آنکھوں کی بینائی چلی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ واپس آ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے۔ اس کے متعلق فی الوقت حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔" ماریو اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ بیٹی بھی قریب ہی کھڑا تھا۔ ان کے تمام منصوبے پر پانی پھر گیا تھا۔ تقریباً جب پولیس بینک کا رخ کرتی تو تمام عملے کے متعلق جانچ پڑتال کے بعد ان دونوں کی حیثیت ابھر کر سامنے آ جاتی اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ دونوں جیل سے رہا ہونے والے مجرم ہیں جو قتل کی سزا بھگت کر کچھ عرصہ قبل رہا ہوئے تھے۔ اس کے بعد معاملے کو کھل کر سامنے آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ تاہم اب بھی وہ فرار ہو کر پولیس کی پہنچ سے دور جا سکتے تھے۔ رقم ان کے پاس محفوظ تھی۔ [illegible] کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر ان سے ٹرائے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ دروازے کے بالکل سامنے پولیس انسپکٹر کھڑا تھا جس کے ساتھ بینک کا منیجر فرینکلن بھی تھا۔ فوراً ہی بیشتر ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور رقم کا بیگ بیٹی سے لے کر فرینکلن کو دے دیا گیا۔ ان دونوں کے کچھ پوچھنے سے پہلے فرینکلن نے طنزیہ لہجے میں بتایا۔

"چند دنوں سے ایک پیٹرول پمپ کی خرید و فروخت کی بات چیت چل رہی تھی۔ کل رات کو بات چیت فائنل ہو گئی اور پیٹرول پمپ کے مالک نے کچھ دیر قبل مجھے فون کر کے اپنی رقم بینک میں منتقل کرنے کے متعلق بتایا۔ میں نے رچرڈ کو فون کیا۔ وہ فلیٹ میں نہیں تھا اس لیے میں بینک چلا گیا اور مجھے ڈکیتی کے متعلق فی الوقت معلوم ہو گیا۔"

ماریو کو یاد آیا کہ رچرڈ نے کچھ دیر پہلے ہی اسے بتایا تھا کہ ایک اور پیٹرول پمپ کے فروخت ہونے کی بات چیت چل رہی تھی اور عنقریب اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی بینک میں منتقل کیے جانے کی توقع تھی۔ اسے فرینکلن کی آواز سنائی دی۔

"میں نے جب بینک میں قدم رکھا تو والٹ روم کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور تم دونوں غائب تھے۔ میں نے پولیس کو فون کیا تب مجھے ولسن روڈ پر رہنے والے پروفیسر سے ملاقات کے متعلق یاد آیا۔ میں نے انسپکٹر کو اس کے متعلق بتا دیا اور ہم ولسن روڈ والے فلیٹ کی طرف آ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ حادثے کی وجہ سے پروفیسر کو اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ یہاں ہماری ملاقات تم دونوں سے ہو جائے گی۔ ہم تو پروفیسر کی خیریت معلوم کرنے کی نیت سے یہاں آئے تھے۔ غیر متوقع طور پر تم سے ملاقات ہو گئی۔"

ماریو اور بیٹی نے بے چارگی کے عالم میں سر جھکا لیا۔ اب وہ تین افراد کے قاتل بن چکے تھے اور یہ سوچ بعید از قیاس نہیں تھی کہ اس بار ان دونوں کو گیس چیمبر کی سزا سنا دی جاتی۔ انسپکٹر نے انہیں گاڑی کی طرف چلنے کے لیے کہا اور وہ بوجھل قدموں کے ساتھ باہر کی طرف چل دیے۔

XXX

دھوپ میں بارش

ناہید سلطان اختر

دھوپ اور بارش کا کھیل ہو یا قسمت کی چال... بات برابر... کیونکہ کچھ خبر نہیں کب موسم کے تیور بدل جائیں اور برستی برکھا میں دل کے سارے داغ دھل جائیں... وہ جو قدم قدم پر زخم کھا رہی تھی اور پل پل بدلتے حالات سے خوفزدہ تھی... ایک روز گرجتے بادلوں کے بیچ برستی رحمت نے کچھ اس طرح اس کے سارے آنسو بھی اپنے دامن میں چھپالیے کہ تمام دکھوں کا مداوا ہو گیا... بے شک گزرا ہوا کوئی بھی لمحہ لوٹ کر نہیں آتا مگر... موسم پلٹ کر ضرور آتے ہیں اور امید کی کونپل مردہ دلوں کو پھر سے زندگی کی نوید دیتی ہے... جیسے اس کی زندگی کی تیز دھوپ میں اچانک خوشیوں کی برسات ہوئی اور اس کے بکھرے خوابوں کو جیسے تعبیر مل گئی...

ٹوٹے دلوں اور بجھے چراغوں کو پھر سے روشن کرنے والی حسینہ کے عزائم اور حوصلوں کی مثال

رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے وہ ابھی پڑھ رہا تھا، اس نے پھر وہی سوال کیا۔ "اب بتاؤ کس کس سے دوستی رہی ہے تمہاری؟"

"کسی سے۔"

گزشتہ شب تو اس نے پوچھا تھا کسی سے دوستی رہی ہے تمہاری اور آج وہ پوچھ رہا تھا کس کس سے دوستی رہی ہے تمہاری؟ کیا سمجھ رہا تھا وہ اسے... فلرٹ!

"کسی سے بھی نہیں۔" وہ اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"زیادہ تڑپنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کا بازو دبوچ کر بولا۔ اس کے ہاتھ کی سختی نے عارفہ کو سسکاری بھرنے پر مجبور کر دیا۔

"سیدھی طرح نہیں بتاؤ گی تو مجھے اگلوانا آتا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

"کیا بتاؤں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اپنے یاروں کے نام۔"

اسے شدت سے تذلیل محسوس ہوئی۔

"کوئی نہیں تھا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"کوئی تو ہوگا یار؟" اس نے پچکارا۔

"کوئی نہیں۔"

"کیسے یقین کروں کہ تم جیسی خوبصورت بلا کا کوئی چاہنے والا نہ ہوگا۔ آج کل تو معمولی شکل وصورت والیاں بھی ایک بغل میں، ایک جیب میں ڈالے پھرتی ہیں۔ شادی شدہ مردوں سے دوستی گانٹھ کر پیسے اور تحفے اینٹھتی ہیں۔ یونیورسٹی فیلوز اور کولیگز کے ساتھ گھومتی پھرتی اور مجھ سے اڑاتی ہیں۔ کیسے مان لوں کہ تمہاری کسی سے دوستی نہ رہی ہو۔"

وہ دانت کچکچا رہا تھا اور عارفہ کا اپنے جبڑوں پر دباؤ بڑھتا گیا۔

"چپ کیوں ہو... بتاؤ۔"

اس کی چپ نہ ٹوٹی۔

"بتاتی ہو یا..." اس نے نہایت بے رحمی سے عارفہ کی کلائی دبوچ لی۔

"آہ!" عارفہ نے سسکی بھری۔

"بولو۔" وہ غرایا۔

"کیا بولوں؟" عارفہ کو خود اپنی آواز بہت دور سے آتی لگی۔

"ایکس وائی زیڈ... کوئی تو ہوگا؟"

"میں... میں قسم کھا کر کہتی ہوں، کوئی نہیں تھا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"بکواس مت کرو... مجھے تمہاری قسموں پر اعتبار...

نہ میں تمہارے ان آنسوؤں سے پگھلوں گا۔" اس نے اپنی انگشت شہادت اس کی ایک آنکھ کے کاسے میں گڑھوتے ہوئے کہا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا گئی۔ وہ اسے گھورتا ہوا۔

"تمہیں بتانا ہوگا... بولنا ہوگا۔" وہ غرایا۔

وہ رونے لگی۔

اس نے اس کے بال پوری قوت سے اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔

"اوہ... اف!"

"ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں... سمجھیں۔"

"مجھے واپس بھیج دیں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

"کہاں؟ کہاں بھیج دیں... یاروں کے ساتھ رات رات بھر فون پر لگے رہنے کو؟" اس نے نہایت حقارت سے اسے دیکھا۔

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"سوچ لو۔"

"کیا؟"

"جھوٹ بولنے کا انجام... ٹکڑے ٹکڑے کر کے فارغ کروں گا اور ساری دنیا کے سامنے تمہیں ننگا کروں گا۔ بتاؤں گا سب کو کہ تم تو شادی سے پہلے ہی خراب تھیں۔"

"نہیں... پلیز... !" وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

وہ ہنسا۔ "آرہی ہو نا لائن پر... کس سے فون پہ چکر؟"

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ کیسی شادی تھی جو اسے خوشی کے بجائے آزار پہنچا رہی تھی اور کیسا شوہر ہے جو اس کے پندار کو خاک آلودہ کر دینے کے درپے تھا۔ وہ تو بڑی صاف ستھری سی لڑکی تھی۔ اپنے والدین کی آخری اولاد ہونے کی وجہ سے اسے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں کی طرف سے اتنی توجہ اتنی محبت ملی تھی کہ اسے ادھر ادھر دیکھنے اور بھٹکنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی تھی۔ توجہ اور محبت کی تلاش میں بھٹکتا وہ ہے جسے محرومی رہی ہو۔ اپنی ماں کی وہ جان تھی۔ میری گڑیا کہا کرتی تھیں وہ اسے۔ رات وہ امی کے پاس سوتی تھی، ان کے سینے سے لگ کر۔ اسے بھلا رات کو کسی کے ساتھ فون پر لگے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی طرح اسے اپنے فون پر بھی پاس ورڈ لگانے کی ضرورت نہ ہی تھی۔ ہمیشہ کھلا رہتا، دعوت عام رہتی۔ گھر والوں میں سے جس کے فون کا بیلنس ختم ہو جاتا، اس کا فون استعمال کرتا...

کسی نے بھی اسے پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ خاندان میں، خاندان سے باہر اور یونیورسٹی میں بھی کئی تھے جنہوں نے اسے چاہت کی نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے پلو میں امی کی یہ نصیحت بندھی رہی تھی کہ لڑکی کو صبر سے اس آدمی کا انتظار کرنا چاہیے جس کے ساتھ اللہ نے روز اول اس کا نصیب باندھ دیا ہوتا ہے۔ اسی میں اس کی اپنی عزت ہوتی ہے اور اس کے گھر والوں کی بھی... مگر اس کے صبر اور انتظار کا انجام کس قدر روح فرسا تھا۔

یہ آزمائش تھی یا کچھ اور؟

☆☆☆

اگلے روز وہ میکے گئی تو امی نے اس کی اور عمیم کی خوب بلائیں لیں۔ سات عدد سرخ مرچیں اور تھوڑا سا نمک مٹھی میں دبا کر دونوں کی نظر اتاری۔ بھائی، بہنوں اور بھابیوں نے ان دونوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ عمیم تمام وقت انسان بنا بیٹھا رہا۔ سب سے اس طرح بات چیت کی کہ وہ اس کے گرویدہ ہو گئے۔

"اچھا لڑکا ہے گڑیا! اس کی قدر کرنا۔" امی نے آہستہ سے اس سے کہا۔

کتنا اچھا تھا، وہی جانتی تھی۔

"بااخلاق ہے عارفہ! ایک دو دن میں ہی ہم لوگوں سے ایسے گھل مل گیا ہے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔" بڑی آپا بولیں۔

وہ انہیں کیسے بتاتی کہ ایک دو دن میں اس نے اس کی کتنی تذلیل کر دی تھی۔ دیوار سے لگا دیا تھا اسے۔

کینیڈا والے بھائی محسن نے اسے عارفہ کے ساتھ کینیڈا آنے کی یوں دعوت دی جیسے کراچی سے لاہور آنے کو کہہ رہے ہوں۔

"آپ کو نیاگرا فال دکھائیں گے۔" محسن بھائی بولے۔

"سنا ہے وزیٹرز ویزا بھی مشکل سے ملتا ہے؟" عمیم نے کہا۔

"جب اللہ چاہے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" بھائی نے حوصلہ بڑھایا۔

"ان شاء اللہ کوشش کریں گے۔"

"دونوں کی ویزا پروسیسنگ فیس، ٹکٹس اور باقی سب کچھ میرے ذمے۔" محسن بھائی نے اپنا ہاتھ عارفہ کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "عمیم! یہ ہماری سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن ہے۔ میں تو اسے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں اور اس کی...

عارفہ کا جی بھر آیا۔ محسن بھائی کو کیا معلوم کہ جس شخص کو وہ اتنی تکریم دے رہے تھے، اس نے محض دو دن میں اس سے کتنی بدسلوکی کی تھی۔ اس کے پندار کو مٹی میں رول دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دن اور اذیت ناک تھے۔ لوگوں کے سامنے وہ انسان بنا رہتا مگر صرف اس کی موجودگی میں وہ اسے چبھتی ہوئی شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایسے ایسے سوالات کرتا کہ وہ تلملا کر رہ جاتی۔

کہاں کہاں گھومتی پھرتی رہی ہو اپنے یاروں کے ساتھ؟

کیا کیا تحفے ملتے تھے، تمہیں اپنے چاہنے والوں کی طرف سے؟

موبائل بیلنس تو مفت لوڈ ہو جاتا ہوگا؟

رات کو کتنے بجے تک باتیں ہوتی تھیں؟

تمہارے گھر والوں کو تو پتا ہوگا سب؟

کینیڈا گئی تھیں، وہاں بھی کسی سے دعا سلام ضرور رہی ہوگی۔

تمہارے بھائی نے تمہارے لیے کینیڈا ہی میں کوئی رشتہ کیوں نہیں دیکھا؟

یونیورسٹی میں تو ضرور دوستیاں رہی ہوں گی۔

جا کر پوچھوں کسی دن تمہاری یونیورسٹی میں کہ عارفہ مشتاق نام کی ایک اسٹوڈنٹ گزری ہے۔ اس کا کس کس سے سین رہا؟

وہ سانس روکے، دانت بھینچے اس کی خرافات سنے جاتی۔

پھر ایک روز وہ اپنے ہاتھ میں ایک بلیڈ لیے اس کے نزدیک آ بیٹھا اور بلیڈ کی تیز دھار نرمی سے اوپر اس کے بازو پہ مس کرتے ہوئے بولا۔ "میں تھوڑا سا کاٹوں گا، تکلیف ہو تو بس نام بتاتی جانا۔"

اس نے سہم کر اپنا بازو پرے ہٹانا چاہا۔ وہ حیوانیت سے ہنس دیا۔ "بس ڈر گئیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں... جب تک تم ایک ایک نام نہیں اگل دو گی، میں کٹ لگاتا جاؤں گا۔"

"پلیز!" وہ رونے لگی۔

"شاباش بتاؤ، کتنے تھے تمہارے چاہنے والے؟"

اس نے ایک ہاتھ میں پکڑے بلیڈ کو اس کے بازو سے مس کیے رکھا اور دوسرے سے اس کا بازو اتنی قوت سے دبوچا کہ وہ سسک اٹھی۔

وہ ہنسا۔ "اب بھی نہیں بتاؤ گی۔"

"خدا کی قسم! میرا کسی سے بھی دوستی نہیں رہی۔" وہ...

"جھوٹ۔" وہ پھنکارا۔ "تم سمجھتی ہو میں تمہاری جھوٹی قسم کا اعتبار کروں گا یا تمہارے آنسوؤں سے ڈر جاؤں گا۔ یہ لو پیسا چکا۔"

وہ تکلیف سے بلبلائی۔

"بس یہ تو کچھ بھی نہیں ...... میں پیچھے پیچھے پر گٹ لگا دوں گا۔"

"میرے اللہ!"

"گلچھرے اڑاتے ہوئے اللہ یاد نہیں آتا تھا۔ رنگین شیشوں والی گاڑیوں میں جاتی ہوگی ...... ہوٹلنگ بھی ہوتی ہوگی ...... سمندر کی سیر بھی کرتی ہوگی؟"

"نہیں، اللہ کی قسم ایسا کچھ نہیں ہوا بھی۔"

"کیسے مان لوں۔ دس بارہ کے نام تو میں تمہیں گنوا دوں جو میرے ساتھ گھومتی پھرتی رہی ہیں۔ تم نے کسی کو اور تمہیں کسی نے کیسے بخشا ہوگا؟"

"میں ایسی نہیں تھی۔"

"ہونہہ!" اس نے گردن کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے عارفہ کو حقارت سے دیکھا۔ "اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے تم جیسیوں کے پاس یہی جملہ ہوتا ہے۔ لو ایک اور گت لگا رہا ہوں۔"

وہ پھر تڑپ گئی۔

"فی الحال اتنی کافی ہیں۔ باتھ روم میں ڈیٹول کی شیشی رکھی ہے۔" وہ بولا۔

عارفہ نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

یہ کیسی شادی تھی۔

شادی تھی یا ڈراؤنا خواب!

اس شادی سے تو وہ کنواری ہی بھلی تھی۔ یہ عذاب تو نہ تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کی زندگی میں آنے والا یہ مرد شکی تھا، جنونی تھا یا نفسیاتی۔

بات زبانی کلامی حد تک رہتی تو شاید وہ کچھ عرصہ سہہ جاتی مگر جسمانی تشدد ناقابل برداشت تھا۔ اس نے گھر والوں کو بتا دیا۔ سب دم بخود رہ گئے۔ امی تو کلیجا پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ بہنیں حیران، بھائی پریشان، بھاوجیں ہراساں۔ ایسا کہاں سنا کہ مرد اپنی نو بیاہتا بیوی کو محض لایعنی شک کی بنیاد پر بلیڈ سے چرکے لگائے۔ سب کا متفقہ فیصلہ ٹھہرا کہ عارفہ کو اس شکی اور بے رحم شخص کے گھر واپس نہ بھیجا جائے۔ ایسا بے رحم انسان تو اسے تشدد کر کے جان سے بھی مار سکتا تھا۔ قصہ گھر سے نکلا، کوٹھوں چڑھا اور اپنے پرایوں سب میں پھیل گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

"ارے کچھ تو ہوگا جو چار دن میں دلہا نے دلہن کے ساتھ ایسا کیا۔"

"عارفہ کے کرتوت چھپا رہے ہیں گھر والے۔ اس کے شوہر کو بلاوجہ تو شک نہیں ہوا ہوگا۔ کچھ نہ کچھ دیکھا سنا ہوگا [illegible]۔"

"کچھ اور ہی کہانی ہے بھئی۔"

☆☆☆

عارفہ کو گھر بٹھا لیے جانے پر پہلے تو سسرال والے ہراساں ہوئے۔ نعیم کے گھر والوں کو اس کی خباثتوں کا بخوبی علم تھا۔ بلا کا آوارہ گرد تھا۔ آئے دن نت نئی لڑکیاں پھانستا اور انہیں بے آبرو کر دینے کی حد تک لے جاتا۔ وہ لڑکیاں تو مختلف اوقات میں اس کے گھر بھی آ پہنچی تھیں، اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر اس نے ان سے شادی نہ کی تو وہ تھانہ کچہری جائیں گی مگر عادی مجرم ان کی دھمکی کو خاطر میں نہ لایا۔ لڑکیاں بے چاری چپ ہو کر بیٹھ گئیں۔ خاندان میں شاید ہی کوئی لڑکی ہو جس پر اس نے ڈورے ڈالنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ایک دو پر وہ ہاتھ بھی صاف کر گیا مگر باقیوں نے جو اس کے ہتھکنڈوں سے آگاہ تھیں، اسے خوب سنائیں۔ ماں، بہنیں بلکہ چھوٹے بھائی بھی اس کی حرکتوں سے نالاں رہا کرتے تھے مگر گھر کی عزت بچانے کو اکثر اس کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کرتے۔ ماں کہا کرتی تھی۔ "مجھے بیٹیوں کو نہ نمٹانا ہوتا تو کب کی نعیم کی شادی کر چکی ہوتی۔"

ماں اکثر بیٹیوں سے کہتی۔ "کالے سر والی آ کر خود ہی سنبھال لیتی ہے شوہر کو، چاہے وہ کیسا ہی بدقماش ہو۔"

خاندان میں کوئی نعیم کو اپنی بیٹی دینے کو تیار نہ ہوا تو خاندان سے باہر تلاش شروع ہوئی۔ عارفہ کی ایک محلہ دار بڑی آپا کا نعیم کی ایک بہن سے ملنا جلنا تھا۔ انہوں نے نعیم کی بہن سے عارفہ کا ذکر کیا۔ قسمت کی بات، رشتہ ہو گیا۔ عارفہ کا بڑا بھائی نیک فطرت شخص تھا۔ ساری دنیا کو اپنے ہی جیسا سمجھتا۔ عارفہ کی امی نے کہا بھی لڑکے کے بارے میں تھوڑی چھان بین کر لو مگر بھائی نے کہا۔ "امی! بیٹی کو اللہ پر توکل کر کے دینا چاہیے۔ لوگ شریف لگتے ہیں۔ بسم اللہ کرو۔" اس کی توکل علی اللہ والی بات میں تو کوئی کلام نہ تھا مگر وہ اس بات سے آگاہ نہ تھا کہ رشتے ناتے کرتے ہوئے لوگ اکثر ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں۔ پھر لوگوں میں بیٹی کا مقسوم باندھتے ہوئے بال کی کھال بے شک نہ نکالی جائے مگر ضروری پوچھ گچھ اور چھان بین لازمی کی جائے۔ پہلے اطمینان کر لینا [illegible]

بہتر ہے۔ یہ جو بیٹیوں والے بے چاری بیٹی کو بوجھ سمجھتے ہوئے رشتہ آتے ہی آنکھ بند کر کے ہاں کر دینے کا شعار رکھتے ہیں، بیٹی کے ساتھ تو زیادتی کرتے ہی ہیں، خود بھی گرفتار بلا ہو جاتے ہیں جیسے عارفہ کے ساتھ اس کے گھر والے ہو گئے تھے۔ عارفہ چار دن کی بیاہی کسی بیوہ کی طرح اجاڑ سوگوار ہو گئی۔

عارفہ کے سسرال واپس نہ جانے پر ہلچل اس کے سسرال میں بھی مچی۔ نعیم اور اس کی ماں بہنوں نے اپنی عزت بچانے کو وہی اوچھا ہتھکنڈا آزمایا جو گھٹیا، بدقماش، بدکردار اور شادی کے قابل نہ ہونے والے مرد اور ان کے گھر والے مظلوم لڑکی کے کردار پر انگلی اٹھا کر آزماتے ہیں۔ نعیم اور اس کی ماں بہنوں نے سارے میں یہ مشہور کر دیا کہ عارفہ کا کسی اور کے ساتھ چکر تھا۔ اس نے گھر والوں کی زبردستی پر شادی تو کر لی مگر نعیم کے ساتھ بسنے سے انکار کر دیا۔ جھوٹ اور غلط بیانیوں کے وہ پلندے تھے کہ خدا کی پناہ! غلط بیانیوں کی یہ داستانیں عارفہ کے میکے تک بھی پہنچیں۔ اس کی امی نے کہا۔ "سچ کہا ہے، اوپر والا جانتا ہے۔ وہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرے گا۔"

اپنی بربادی کا عارفہ کو جو دکھ تھا، سو تھا۔ اس کی امی تو بچھونے سے لگ گئیں۔ لاڈوں پلی چہیتی بیٹی کا یہ نصیب ہوگا، انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کتنی چاہت اور ارمانوں سے اس کی شادی کی تھی۔ بھائیوں نے بہن کو شان سے وداع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ کینیڈا والا بھائی جو عارفہ کو بیٹی کی طرح عزیز رکھتا تھا، اس نے شادی میں پانی کی طرح پیسا بہایا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ کی تو گھڑی باندھی تھی نعیم کے ہاتھ پر۔ مصالحت کا سوال ہی نہ تھا۔ عارفہ کی طرف سے خلع کا مطالبہ کر دیا گیا۔ نعیم نے کہا خلع کے لیے عدالتوں کے چکر لگانے کا تو شوق سے لگاؤ۔ میں تو طلاق کا داغ لگاؤں گا مگر اس شرط پر کہ مہر کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ گھر والوں کو کسی بھی طرح عارفہ کی جان اس شخص سے چھڑانی تھی۔ مہر سے دستبرداری کی شرط پوری کر کے طلاق لے لی گئی۔ نعیم کا کردار اور کھل گیا۔ جو شخص مظلوم عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کرے، وہ اللہ کے نزدیک بھی معتوب، بندوں کی نظروں میں بھی ذلیل ...... بہرحال عارفہ کی خلاصی ہوئی۔

عارفہ کی ماں نے بیٹی کی بربادی کا دکھ دل سے یوں لگایا کہ اس حادثے کے بعد زیادہ دن نہ جی سکیں۔ چاہنے والی ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا عارفہ کے لیے اپنی بربادی [illegible]

مستقل ڈیرا ڈال دیا۔ زندگی اسے بے معنی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسی زندگی کیا جینا بھلا جو جیتے جاگتے انسان کو روبوٹ بنا دے۔ امنگوں بھرے دل کو یاسیت کے بلیک ہول میں دھکیل دے۔ عارفہ کو یوں لگتا جیسے اس کا وجود محض ایک مشین ہو جو دوسروں کے تحت بے جان مشینوں کی طرح ایک مقام پر پڑی رہنے کے بجائے بس ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کر جانے پر قادر تھی۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے وہ ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ اس کی بڑی بڑی دلکش آنکھوں میں ہمہ وقت یاسیت ہوتی۔ اس نے بات چیت کرنا بہت کم کر دیا تھا۔ ضرورت کے تحت ہی بولتی ورنہ چپ رہتی۔ اس نے لوگوں کے سامنے آنا جانا کم کر دیا تھا۔ گھر میں کوئی رشتے دار، کوئی مہمان آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ سامنے نہ جائے۔ لوگوں کی نگاہوں میں دوڑتی تجسس خیز کیفیت سے اسے خوف ہونے لگی تھی۔ ہر شخص جیسے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ خود کتنی مظلوم، کتنی خطاکار تھی۔ صد شکر کہ بھائی اور بھابی دونوں اچھے تھے ورنہ شاید وہ ان سے بھی چھپتی پھرتی۔ وہ تو اب اپنی سہیلیوں سے میل جول میں بھی احتیاط برتنے لگی تھی۔ بس ایک لڑکی تھی جس سے وہ اپنا دکھ کسی حد تک شیئر کر لیتی تھی۔

[illegible] اور وہ کالج کے زمانے سے دوست تھیں۔ دونوں نے ایک ہی کالج سے آئی سی ایس کرنے کے بعد ایک ہی یونیورسٹی سے بیچلرز سائنس میں ڈگری لی تھی۔ عارفہ تو ایم ایس بھی کرنا چاہتی تھی مگر امی کو اس کے ہاتھ پیلے کر دینے کی جلدی تھی۔ لڑکی ایک اسکول میں کیمسٹری ٹیچر کی ملازمت کر رہی تھی اور اپنی ملازمت سے خوش تھی۔ شادی کی نہ اسے جلدی تھی نہ اس کے گھر والوں کو۔ لڑکی کی والدہ تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ خاتون تھیں۔ ان کا کہنا تھا جلدی کے چکر میں غلط آدمی سے شادی کرنے کے بجائے دیر سے ہی کسی صحیح آدمی سے شادی کی جائے اور جب سے انہوں نے اپنی بیٹی کی دوست عارفہ کی شادی کا انجام سنا تھا، تب سے تو وہ اپنی اس رائے پر زیادہ مستحکم ہو گئی تھیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد عارفہ کے کینیڈا میں مقیم بھائی محسن نے اس کی کینیڈا امیگریشن کا پروسس شروع کروا دیا تھا۔ اس میں کتنا وقت لگتا تھا، یقین سے کچھ نہ کہا جا سکتا تھا تاہم عارفہ کی عمر، تعلیم اور کینیڈا میں اس کے بھائی کی موجودگی امیگریشن کے لیے مددگار چانسز تھے۔ پاکستان میں بڑے بھائی اور بہنوں نے عارفہ کو ہر طرح کی سپورٹ فراہم کر رکھی تھی۔ بھائی، بہنیں تو یہ چاہتے تھے کہ [illegible]

ہے۔ وہ کہتا ہے، ہمارے ہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں میں اکثر بے گناہ افراد تشدد کی وجہ سے اعتراف جرم کر کے اپنی جان خلاصی کرتے ہیں۔"

"میڈم! کتنے بھائی ہیں آپ کے؟"

"صرف ایک ...... مگر ہم سات بہنوں کی قوت۔"

"بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں بھائی اپنی بہنوں کے لیے۔ مجھے بھی میرے بھائیوں نے سپورٹ دی۔ چھوٹے بھائی نے تو مجھے اپنے پاس کینیڈا بلانے کے لیے میری امیگریشن کا معاملہ پروسس میں ڈال رکھا ہے۔"

"اچھا، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"میرا دل تو نہیں چاہتا اپنا وطن چھوڑ کر جانے کو۔"

"شاید کسی کا بھی نہ چاہتا ہو مگر مجبوریاں ہوتی ہیں، ترجیحات ہوتی ہیں جو ہمیں اپنی زمین اور راہوں سے دور کھینچ لے جاتی ہیں۔ کبھی کبھی آدمی اپنا دکھ درد بھلانے کے لیے بھی دوری اختیار کرتا ہے۔ آئی وش یو آل دی بیسٹ!"

"تھینک یو میڈم!"

وقفہ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔

"اب جاؤں میڈم؟"

"ہاں چلی جاؤ کیونکہ بریک بھی ختم ہوتی ہے اور تمہاری آنکھیں بھی اب روئی روئی نہیں لگتیں۔"

عارفہ کے لبوں پر مختصر سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے یہاں آنے سے پہلے سنا تھا کہ آپ بہت اچھی ہیں۔"

"ہر سنی سنائی بات قابل اعتبار نہیں ہوتی۔"

عارفہ اب کھل کر مسکرائی۔

"نہیں میڈم! بعض باتیں اعتبار سے بھی زیادہ اعتبار کے قابل ہوتی ہیں۔"

"اوہ!" مسز فیاض نے اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔ "گویا گہری باتیں بھی کر لیتی ہو۔"

"نہیں میڈم! بس دل کی بات کر لیتی ہوں۔" اس نے انکساری سے کہا۔

"دل کی بات کا اچھا ہونا دل کی اچھائی کو ظاہر کرتا ہے۔"

"آپ کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے میڈم!"

"مان لیا۔" مسز فیاض مسکرائیں۔

"میرے لیے دعا کیجیے گا۔"

"آج سے ڈھیروں۔"

"شکریہ۔"

عارفہ کا چھوٹا بھائی اسے کینیڈا بلانے کی کوشش کر رہا تھا اور پاکستان میں اس کے دوسرے بہن بھائی دوبارہ اس کی شادی کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ بہنیں اپنے ملنے جلنے والوں سے کہتیں، بھائی فطری جھجک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے حلقۂ احباب میں بہن کی دوبارہ خانہ آبادی کے لیے اپنی تشویش اور خواہش کا اظہار کرتا۔ عارفہ کی دوست ازکی جو کالج کے زمانے سے اس سے بہت اچھی طرح واقف تھی، اپنے بھائی سے اس کی شادی کرانے میں دلچسپی رکھتی تھی مگر اولاً وہ عمر میں عارفہ سے چھوٹا تھا اور دوم اس کا کوئی مستقل اور معقول روزگار نہ تھا۔ ازکی نے عارفہ سے بات کی تو اس نے اپنے گھر والوں تک بات پہنچنے سے قبل خود ہی ازکی سے کہا۔ "نہیں ازکی! تمہارا بھائی عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا ہے۔"

"مگر وہ اصل میں ہے تو نہیں۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے مگر...... اس کا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ میں ڈیوورسی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں فرق نہیں پڑتا۔ میرے گھر والے بھی راضی ہیں۔"

"مگر مجھے پڑتا ہے فرق۔"

"تم اگر اس لیے انکار کر رہی ہو کہ اس کی فی الحال کوئی معقول جاب نہیں تو......"

"نہیں، نہیں۔" عارفہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ بات نہیں۔"

"تو پھر؟"

"میں جانتی ہوں ازکی! تم مجھ سے اپنی دوستی کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھانا چاہتی ہو۔ میرے دل میں تمہاری قدر دوستی کی حدوں سے آگے نکل گئی ہے مگر یہ ممکن نہیں۔ دوستی کی خاطر میں اتنی بڑی قربانی نہیں لے سکتی تم سے۔"

"عارفہ! میں اور میرے گھر والے تمہیں ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔ تم سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم دونوں نے کالج اور یونیورسٹی میں کئی سال اکٹھے گزارے ہیں۔ تمہاری ہمراز ہوں میں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کتنے مضبوط کردار کی لڑکی ہو۔ تم پر شک کرنا یا کوئی تہمت لگانا اس شخص کے اپنے کردار کی کمزوری تھی جس نے تم جیسی اچھی لڑکی کو کھو دیا۔ میری امی، ابو، بہنیں، میں خود اور میرا بھائی بھی تم سے رشتہ جوڑنے میں خوش ہیں۔"

"جزاک اللہ!"

"تم [illegible] گھر والوں [illegible] کر دو بات؟"

"نہیں، نہیں۔" عارفہ گھبرا کر بولی۔ "پلیز ایسا مت کرنا۔ میری دعا ہے کہ تمہارے بھائی کو کوئی بہت اچھی لڑکی ملے۔"

"ہمارا اول تو تم پر ہے عارفہ!"

"میں ساری زندگی تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی شکر گزار رہوں گی کہ جب ایک ظالم شخص نے مجھ پر زندگی کا گھیرا تنگ کر دیا تھا تب تم نے مجھے یہ احساس دیا کہ میں کال کوٹھری میں نہیں ہوں۔"

"اتنی اچھی باتیں کرتی ہو تم۔ وہ شخص بدقسمت تھا جس نے تم جیسی خوبصورت، نیک فطرت، سلیقہ مند، نفاست پسند اور ادبی ذوق رکھنے والی لڑکی کی قدر نہیں کی۔"

"بدقسمت وہ نہیں تھا ازکی ...... میں تھی۔"

"میری بات مان لو تاکہ وہ اور اس کے گھر والے تمہاری قدر جان جائیں۔"

"وہ کیا جانیں گے۔"

"پلیز عارفہ!" ازکی اس کی منت سماجت پر اتر آئی۔

"مجھے مجبور مت کرو۔ شاید تم نے میری جان مانگی ہوتی تو میں دینے میں تردد نہ کرتی مگر...... یہ ممکن نہیں ہے۔"

"مان لو...... سوچ لو...... ہم انکار کر سکتے ہیں پر امی کہتی ہیں گھر میں اچھی لڑکی آ جائے گی تو ہمارا گھر جنت کا ٹکڑا بن جائے گا۔"

"جس گھر میں اتنے اچھے، اتنے اعلیٰ ظرف لوگ رہتے ہیں، وہ تو ویسے بھی جنت کا ٹکڑا ہی ہوگا۔"

"مان جاؤ نا۔"

"آج ...... آج کے بعد ...... اور کبھی بھی ...... نہیں۔"

ازکی مایوس دکھائی دینے لگی۔

"بہرحال ......!" عارفہ نے ازکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔"

"بہت بے وفا ہو۔" ازکی نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"اور برا کہو۔"

ازکی فرط جذبات سے اس سے لپٹ گئی۔

بعد میں ازکی نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ "عارفہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اپنے سسرال والوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ اسے اب بھی کم عمر، پڑھا لکھا اور کنوارا رشتہ مل سکتا ہے فوراً ہاں کر دیتی۔"

"بیٹا! اتنے سال سے ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ اچھی لڑکی تھی جسے ان بدبختوں نے بلاوجہ بدنام کیا۔" ازکی کی والدہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"صرف بدنام ہی نہیں امی ...... اس کے شوہر نے اس پر بے رحمانہ تشدد بھی کیا۔ نفسیاتی تھا کمبخت۔"

"اللہ پوچھے گا اس سے۔"

"وہ تو دوسری شادی کر کے بیٹھ گیا۔"

"ہوتی کوئی عارفہ کی طرح کی تو وہ بے چاری بھی سر پکڑ کر روتی اور ہوتی اور طرح کی تو دیکھنا کیسا ناچ نچاتی اسے۔"

☆☆☆

صبح سویرے حسب معمول گھر سے اسکول جانے کے لیے عارفہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ عقب سے آنے والی دھیمی سی مردانہ آواز نے اسے ایک لمحے کو اپنی جگہ رک لینے پر مجبور کر دیا۔

"سنیے!" اس نے فقط ایک ہی لفظ سنا تھا۔

"میں ...... آپ سے ...... کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ ٹھٹک گئی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک نوجوان پینٹ شرٹ میں ملبوس پیچھے کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟" عارفہ نے اسے غصے سے گھورا۔ گلی ابھی سنسان تھی۔

"میرا نام ...... شہریار ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"آپ سے بات کرنا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ ابھی چیخوں گی تو آس پاس کے گھروں سے لوگ نکل آئیں گے تمہاری مرمت کرنے کے لیے۔"

"محلے کے لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ دو گلیاں چھوڑ کر رہتا ہوں اور محلے میں اچھی ریپوٹیشن ہے میری۔"

"دفع ہو جاؤ تم اور تمہاری ریپوٹیشن۔"

"اتنا غصہ کیوں کر رہی ہیں؟"

"تم جیسے لفنگوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

"یہ تو پھر اچھی بات ہے۔" وہ بولا۔

"چلاؤں ...... بلاؤں کسی کو؟"

"آپ کی مرضی ہے۔" اس نے شانے اچکائے۔ "شوق پورا کرنا چاہتی ہیں تو کر لیجیے۔ میرے لفنگے پن کی آزمائش بھی ہو جائے گی آپ کو۔ الحمدللہ محلے کے لوگ جانتے ہیں مجھے۔ آپ شاید نہیں جانتیں۔"

"مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔" وہ آگے جانے کو مڑی اور تیز رفتاری سے قدم آگے بڑھا گئی۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔" وہ بھی اس کے [illegible]

پیچھے آتے ہوئے بولا۔
''ایڈیٹ!'' عارفہ نے زور سے کہا۔
''آئی ڈونٹ مائنڈ۔''
وہ پھر ٹھٹک گئی۔ اسٹاپ اب قریب ہی تھا۔
''کیسے انسان ہو تم صبح صبح میرے پیچھے کیوں لگ رہے ہو؟'' وہ اسے غصے سے دیکھتے ہوئے غرائی۔
''کیونکہ دوپہر کو جب آپ واپس لوٹتی ہوں گی، میں اپنی جاب پر ہوتا ہوں۔ معمولی جاب ہے گھر کیا کروں، امی پر گزارہ کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اچھی ہیں، صبح گئیں، دوپہر کو گھر واپس آگئیں۔ مجھے تو دس بارہ گھنٹے کی نوکری کرنا پڑتی ہے۔''
''تب یہ حال ہے۔''
''شکر ہے، ہم بس دو بھائی ہیں اور امی۔ عزت سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ کسی سے مانگنا نہیں پڑتا۔''
''تم مجھے اپنی سوانح عمری کیوں سنا رہے ہو؟''
''آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں، غصہ چھوڑیں، مجھے لفنگا کیٹگری سے نکالیں تو بتاؤں۔''
اس نے غصے سے اپنا ایک پاؤں زمین پر مارا، گردن پھیری اور دوبارہ تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ مطلوبہ بس آرہی تھی۔ وہ تیزی سے لپکی اور اسٹاپ پر بس کے پہنچتے ہی زنانہ حصے میں سوار ہوگئی۔ دزدیدہ نظروں سے باہر دیکھا تو وہ کچھ فاصلے پر کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ بس مسافروں کو اتار چڑھا کر دوبارہ چل دی۔ اس کا ذہن جھنجھنا رہا تھا۔ کون تھا بھلا وہ؟ پہلے تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اسے اور وہ کہہ رہا تھا وہ گلیاں چھوڑ کر رہتا ہے، سارا محلہ جانتا ہے اسے...... لفنگا...... لاحول ولا قوۃ......! عارفہ کو کسی اجنبی کا اپنے پیچھے لگنا اور راستے میں اس سے بات کرنا اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔ محلے میں یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ وہ شادی کے بعد فقط چند دن ہی سسرال میں بس سکی تھی اور یہی نہیں، اس کی سابقہ سسرال کے چند رشتے دار اس محلے میں بھی تو رہتے تھے۔ ان تک اس کے کسی اور میں انوالو ہونے کی خبر ضرور پہنچی ہوگی اور یہاں تو ایک زبان سے نکلی بات کوٹھوں چڑھتی ہے۔ محلے میں نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس تک پہنچی ہوئی ہوگی اس کی جھوٹی بدنامی کی خبر...... ہوسکتا ہے اس نے بھی سنی ہو اور اسے ایسی ویسی سمجھ کر ہی اس کے پیچھے آگیا ہو ورنہ اس سے قبل ایسا کب ہوا تھا بھلا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہو اور اس [illegible] اس نے احساس [illegible]

کا دل سارا دن بھاری رہا۔ کیسے بدفطرت تھے ممیم اور اس کے گھر والے۔ اگر ممیم اس درجہ شکی یا نفسیاتی مریض تھا تو اس کے گھر والوں کو تو معلوم ہوگا۔ کیوں چھوڑا انہوں نے ایک اچھی بھلی لڑکی کا مقدر اور اگر چھوڑ ہی دیا تھا تو ایک معصوم اور بے قصور لڑکی کو یوں بدنام تو نہ کرتے۔ وہ جتنا سوچتی گئی، اتنا ہی اس کا دل بھاری ہوتا چلا گیا۔ کتنی آسانی سے تہمت لگا دیتے ہیں لوگ دوسروں کی بہنوں، بیٹیوں پر۔ یہ نہیں سوچتے کہ اوروں کی بہنوں، بیٹیوں کی جگہ پر خود ان کی اپنی بہنیں، بیٹیاں بہتان طرازی کی زد میں ہوں تو!

☆☆☆

اگلے دن جب عارفہ اسکول جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوئی تو وہ پھر اس کے پیچھے آگیا۔
''مس! میری ایک ریکویسٹ سن لیں۔''
''بکواس مت کرو۔'' عارفہ نے گردن موڑتے ہوئے اسے جتا کر دیکھا۔ ''مجھے کسی کو پکارنے کی ضرورت بھی نہیں۔ خود ہی اتنے جوتے لگاؤں گی تمہیں کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔''
''بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ میرے ہوش واقعی ٹھکانے نہیں ہیں۔ بائی دی وے، آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرے ہوش ٹھکانے آنے کی ضرورت ہے؟''
''کیو......'' عارفہ نے دانت بھینچتے ہوئے اس پر آنکھیں نکالیں۔
''کیجیے، کیجیے جو مرضی میں آئے کیجیے، میں مائنڈ نہیں کروں گا۔''
''مائنڈ وہ کرتا ہے جس کے پاس مائنڈ ہوتا ہے۔''
''اچھی بات کی ہے آپ نے۔''
''شور مچا کر اتنا ذلیل کروں گی تمہیں کہ...... تم جو کہتے ہو محلے میں تمہاری بہت عزت ہے، کسی کو منہ دکھانے کے نہ رہو گے۔''
''اچھا چھوڑیے...... آپ زیادہ غصہ نہ ہوں اور میں بھی مذاق ختم کرتا ہوں۔'' اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ''میں اپنی والدہ کو آپ کے گھر بھیج رہا ہوں...... آپ کا رشتہ مانگنے کے لیے۔''
عارفہ کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ قسمت نے یہ دن بھی دکھانا تھا کہ راہ چلتے اس کا رشتہ مانگنے کی بات کرنے لگے تھے۔
''تم ہوش میں تو ہو؟''
''جی میں ہوش میں ہوں مس!''
[illegible]

پھوٹی تھی۔
''میں نے جو بھی سمجھا ہے، ٹھیک سمجھا ہے۔''
''دفع ہو جاؤ۔''
''اوہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے عارفہ کو عجیب کن نظروں سے دیکھا۔ ''میں دفع ہونے کے لیے آپ کے پیچھے نہیں آیا ہوں۔ ممیم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ شادی سے پہلے اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کی۔ اس کے گھر والوں کو بھی اس کے کچھنوں کا علم تھا پھر بھی آپ جیسے شریف لوگوں کو پھنسا کر اس سے آپ کی قسمت پھوڑ دی۔ اچھا ہوا کہ آپ نے جلدی اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔''
''تمہیں مجھ سے ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟'' عارفہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''کیونکہ میں ممیم کو جانتا ہوں۔''
''مت لو اس کا نام بار بار میرے سامنے۔''
''سوری!''
''مجھے اس سے نفرت ہے اور اس سے واقفیت رکھنے والے ہر شخص سے۔'' عارفہ نے تلخی سے کہا۔
''بالکل ہونی چاہیے اس سے آپ کو نفرت لیکن دیکھیے کسی برے شخص سے واقفیت رکھنے والے سے بھی نفرت کرنا بڑی سمجھ سے بالا ہے۔ دنیا میں بہت سے اچھے لوگ بہت سے برے لوگوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب کب ہے کہ برے آدمی کو برا سمجھنے کے ساتھ اس سے واقفیت رکھنے والے کو بھی برا سمجھا جائے؟''
''میں بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ جاؤ اپنا راستہ ناپو ورنہ گلی میں اپنے گھر سے کسی مرد کو ساتھ لاؤں گی تمہاری طبیعت ٹھکانے لگانے کے لیے۔''
''قصور آپ کا نہیں، آپ کو پیش آنے والے حالات کا ہے۔ ایک برے آدمی کا چہرہ دیکھنے کے بعد آپ کو ہر چہرہ مسخ دکھائی دینے لگا ہے۔ یقین کریں میں برا آدمی نہیں ہوں۔ بائی دی وے کل چھٹی ہے۔ میرا کچھ پروگرام ہے۔''
عارفہ نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنے راستے پر چل دی۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا۔

☆☆☆

اگلے دن ہفتہ واری تعطیل تھی۔ بھابی نے عارفہ سے کہا۔ ''شام کو مہمان آرہے ہیں۔ تم اپنے کپڑے استری کرکے رکھ لو۔ لائٹ کا کچھ بھروسا نہیں، کب چلی جائے۔''
عارفہ سمجھ گئی کہ شام کو کس قسم کے مہمان آرہے تھے۔
[illegible]

دیکھنا گوارا نہ کیا، کوئی بھائی بہنوں کے دل کو نہ لگا۔
دن چڑھے عارفہ کی بڑی بہن بھی آگئیں۔ بھابی ایسے موقع پر اپنی دوسراہٹ کے لیے اپنی دو بڑی نندوں میں سے کسی نہ کسی کو بلا لیا کرتی تھیں۔ نہ گھر والوں میں سے کسی نے اسے آنے والے مہمانوں کے سیاق و سباق سے آگاہ کیا نہ اس نے پوچھنا مناسب سمجھا۔
شام کو جب مہمان آئے تو وہ یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئی کہ ایک معمر عورت کے ہمراہ آنے والا نوجوان وہی تھا جو گزشتہ دو ایام اس کے پیچھے لگ رہا تھا۔
اس کی ظاہری شخصیت میں تو کوئی کلام نہ تھا۔ بلند قامت، مناسب جسامت، خوش لباس اور چہرے پر شرافت... مگر یہ اوصاف تو ممیم میں بھی تھے۔ اس کے ہمراہ آنے والی معمر خاتون اس کی ماں تھی۔ مزاجاً تیز لگتی تھی۔ گفت و شنید ہوئی تو معلوم ہوا عارفہ سے رشتہ کرنے میں اس کی ماں سے زیادہ خود اس کا دخل تھا۔
''دو ہی بیٹے ہیں میرے۔ یہ بڑا ہے۔ اس نے بی کام کیا ہے۔ ایک بڑے اسٹور میں ملازمت کرتا ہے۔ تنخواہ تو اتنی زیادہ نہیں مگر اسٹور سے رعایتی قیمت پر گھر کا سودا سلف مل جاتا ہے۔ چھوٹا بیٹا ابھی یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے۔ گھر ہمارا اپنا ہے، عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔ میں اس کی شادی اپنے خاندان میں ہی کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے ضد لگائی ہے کہ مجھے اسی گھر سے رشتہ لے کر دو۔''
''آپ لوگوں کو یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ ایسی آخر کیا بات ہے جو خاتون کے بیٹے نے اسی گھر میں رشتہ کرنے کی ضد پکڑی ہے۔'' مہمانوں کے جانے کے بعد عارفہ نے بہن اور بھابی سے کہا۔
''اللہ نے ڈالی ہوگی اس کے دل میں۔'' عارفہ کی بہن آپا نصیرہ بولیں۔
''اللہ نے بھی کسی سبب سے ڈالی ہوگی دل میں۔''
''اچھا خیر، مناسب لوگ ہیں۔ لڑکا دیکھنے میں بھی اچھا ہے۔ پڑھا لکھا ہے، اچھی نوکری بھی مل جائے گی۔ رزق اور پیسا عورت کے نصیب کا ہوتا ہے۔''
''نصیب تو خراب ہے آپا!'' عارفہ نے دل گرفتگی سے کہا۔
''نصیب بدلتے دیر نہیں لگتی ہے۔ لڑکی خالی گھر جاتی ہے اور اس کے نصیب سے گھر بھر جاتا ہے۔''
''سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکا کنوارا ہے۔ کوئی دم [illegible]

ہوتا تو پہلی بیوی و بچوں کا علم ہوتا۔'' بھابی بولیں۔
''ہاں بھئی، ان حالات میں کنوارا رشتہ ملنا تو ناممکن بات
ہے۔'' آپا نے تائید کی۔
''پھر سہرے سے لڑکا شریف بھی لگتا ہے۔'' بھابی
نے مزید کہا۔
عارفہ کا جی چاہا، بھابی کو گزشتہ دو مہینوں کی داستان
سنائے مگر مصلحتاً چپ رہی۔
بھائی نے بھی پسندیدگی اور حمایت ظاہر کر دی بلکہ
اسے آمادہ کرنے کے لیے سمجھانے بجھانے کا فریضہ بھی اتنی
دلسوزی سے ادا کیا کہ اس کا جی بھر آیا۔
گویا اسے بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔
وہ اپنی والدہ کے ساتھ گھر آنے کے بعد دوبارہ اس
کے پیچھے نہیں آیا کہ وہ اسے ناز کر خود سے برگشتہ کر سکتی۔
اسے اپنے انکار پر ڈٹے رہنے کی جا نہ رہی۔

☆☆☆

شہریار سے اس کا عقد ثانی ہو گیا۔
وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ خدشات اور وسوسے اسے
ستا رہے تھے۔ پہلی بار کی تلخی ہی نہ گئی تھی ..... اس بار نہ
جانے کیا ہو۔
''تمہیں پتا ہے میں نے تم سے شادی کیوں کی
ہے؟'' پہلی رات شہریار نے اس سے کہا۔
عارفہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے
اس نے سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
شہریار نے اس کا حنائی بیل بوٹوں سے مزین ہاتھ
اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ لے لیا اور اسے گہری نگاہوں
سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری سرخروئی کے لیے۔''
چند ثانیے خاموشی رہی پھر اس نے کہا۔ ''سمجھ رہی ہو
نا میری بات؟''
عارفہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔
''اس الو کے پٹھے نے تم پر زندگی کا دروازہ بند
کر دینے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سارے دروازے،
ساری کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ کسی کی پروا کرنے کی
ضرورت نہیں ..... کسی سے مت ڈرو ..... مجھ سے بھی نہیں۔
مجھے اگر کوئی یہ کہے گا کہ مجھ سے شادی کرنے سے پہلے تم
فلاں فلاں کے ساتھ تعلق میں رہی ہو ..... آئی ڈیم کیئر .....
پھر بھلا تمہیں پروا کرنے یا ڈرنے کی کیا ضرورت؟ جو
[illegible]
ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں۔ میں کوئی امیر آدمی نہیں

ہوں مگر کوشش کروں گا کہ تمہاری ضروریات پوری کر سکوں
اور تمہیں خوش رکھ سکوں ..... ہاں، میری والدہ کی طرف سے
تمہیں تھوڑی پرابلم ہو سکتی ہے۔ وہ تم سے میری شادی کے
حق میں نہیں تھیں۔ بڑی مشکل سے منایا ہے میں نے
انہیں۔ ہو سکتا ہے شروع میں تمہیں ٹف ٹائم دیں۔ تمہیں
ایڈجسٹمنٹ میں پرابلم ہو مگر میری خاطر نظرانداز کر دینا۔''
عارفہ حیران تھی کہ یہ دوسرا تجربہ پہلی بار سے کتنا
مختلف تھا۔ نہ لہجے میں اکھڑ پن، نہ شک کی کوئی پرچھائیں،
نہ بے اعتمادی کی جھلک، نہ اسے زمین سے لگا دینے کی
کوشش ..... بلکہ اس بار تو اس کی زندگی میں آنے والا مرد
اپنے نرم لہجے میں اسے زمین سے اٹھانے اور اس کا کھویا ہوا
اعتماد بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دوسرا مرد پہلے سے
کتنا مختلف تھا۔
وہی نہیں، اس کے گھر والے بھی ایک نئے شخص سے
اسے جسم و جاں کے رشتے میں باندھ دینے کے بعد بھی اس
تشویش میں تھے کہ خدا جانے اس بار کیا ہو۔ اگلے دن وہ گھر
گئی تو ہر آنکھ میں سوال تھا۔ لب بے صدا تھے مگر وہ بے صدا
لبوں کی صدا سن سکتی تھی۔ بالآخر بڑی آپا تشویش بھرے لہجے
میں سوال کر ہی بیٹھیں۔ ''اب کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''
''نہیں آپا!''
''سچ کہتی ہو؟''
''میں نے پہلے بھی جھوٹ نہیں بولا تھا آپا!''
''خدا نہ کرے کہ اب کوئی مسئلہ ہو۔'' آپا نے اسے
ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔
محلے والیاں جوق در جوق ٹوہ لینے چلی آئیں اور اسے
عجوبے کی طرح دیکھتی رہیں۔ بھائی نے اسے ایسی دلسوز
نگاہوں سے دیکھا کہ اس کا جی چاہا کہ ان کے سینے سے جا لگے
اور کہے۔ ''میں ٹھیک ہوں بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔''
دوپہر کو شہریار اسے واپس لے جانے کے لیے آیا تو
اس کی خاطر خواہ پذیرائی کرتے ہوئے بھی عارفہ کے گھر
والوں کی نگاہوں میں شک و شبہ ڈولتا ہی رہا۔ روبوٹس کی
طرح اس کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔
شام کو ولیمے کی تقریب میں شہریار اپنے رشتے
داروں، دوستوں اور ان کی بیویوں سے اسے بے حد گرمجوشی
سے متعارف کراتا رہا۔ ''یہ میری بڑی خالہ ہیں ..... یہ چھوٹی
خالہ اور میرے فیورٹ خالو ..... یہ بھائی جان ہیں میرے
[illegible] بچپن کا دوست
اور یہ اس کی مسز [illegible]

ان کا اور میرا رزق ایک ہی جگہ بندھا ہے بی اماں۔ ویسے یہ
دبئی جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ یہ میرا یار نام ہی کا نہیں
طبیعت کا بھی شریف ہے ..... اور وہ جو سفید بالوں والی
خاتون اسٹیج کی طرف آ رہی ہیں، ہماری اماں ہیں۔ میں ذرا
ان کو سہارا دے دوں .....'' وہ اسٹیج سے اتر کر تائی اماں کی
طرف لپکا۔
عارفہ کو لگ ہی نہ رہا تھا کہ یہ اس کی دوسری شادی
تھی۔ تقریب میں شامل لوگوں کی نگاہوں میں اور چہروں پر
ملے جلے تاثرات تھے۔ تعجب، رشک، تحقیر، تضحیک، طنز اور
بے توقیری! عارفہ دزدیدہ نظروں سے تاثرات تاڑتی رہی۔
اسٹیج کے نزدیک ایک میز کے گرد پڑی کرسیوں پر بیٹھی کئی
ستوری خواتین کو اس نے کہتے سنا۔ ''بہن! آج کل کی
تماشا ہے۔ شریف اور عزت دار لڑکیوں کو بر نہیں ملتے اور
چالو چھوکریاں ایک کو چھوڑ کر پھر کنوارا لڑکا پھنسا لیتی ہیں۔''
''دلہا کی ماں کی تو ذرا مرضی نہ تھی۔ کنواریوں کی کمی
ہے جو غیر شادی شدہ بیٹے کی شادی طلاق یافتہ سے کر دی .....
مگر بات وہی کہ جب لڑکا ہی راضی ہو تو کیا کرے گا قاضی۔''
''لڑکی نہیں، بھتنی کہو۔ سنا ہے پہلی شادی اسی لیے ختم
ہوئی کہ شوہر کو شادی سے پہلے اس کے چکروں کا علم تھا۔''
''اب بے چاری بیوہ ماں کے بیٹے کو پھانس کر بیٹھ
گئی ..... ہائے! کیسے کیسے ارمان ہوں گے شہریار کی ماں کو
اس کی شادی کے لیے۔ اس کمبخت نے بے چاری کے
سارے ارمان خاک میں ملا دیے۔ ارے پہلی شادی سے
پہلے بھی شہریار سے چکر رہا ہو گا اس کا۔''
''اپنے پرایوں سے منہ چھپاتی پھر رہی ہیں بے
چاری آنٹی!''
''بیٹے اور بہو کے ساتھ تصویر کھنچوانے کو بھی نہیں
آئیں نا ابھی تک؟''
''کس دل سے کھنچوائیں بے چاری۔''
''اور اس عورت کو دیکھو، کس ٹھاٹھ سے دلہن بنی اسٹیج
پر بیٹھی ہے۔''
عارفہ اسٹیج پر بیٹھی تھی مگر اس کے کان مسلسل آس پاس
ہی لگے تھے۔
رات کو گھر واپسی کے بعد جب وہ دونوں اپنے
کمرے میں آ گئے تو اس نے شہریار سے آہستہ سے کہا۔
''ایک بات پوچھوں؟''
''ایک نہیں سو۔''
''جب آپ کی امی مجھ سے آپ کی شادی کرنے پر

راضی نہیں تھیں تو آپ ان کی مرضی کے خلاف کیوں گئے؟''
''تم سے کس نے کہا کہ امی راضی نہیں تھیں؟''
''کسی نے بھی کہا ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا
بات تو سچی ہے نا۔''
''ہاں تھی۔'' وہ اس کے شانوں پر اپنا بازو دراز
کرتے ہوئے بولا۔
''تو پھر کیوں کی مجھ سے شادی؟''
''بتا دوں؟'' اس نے کہا۔
''میں جاننا چاہوں گی۔''
وہ چپ رہا۔
''مجھ پر رحم کھا کر؟'' عارفہ کے لہجے میں دل آزردگی تھی۔
''نہیں۔'' اس نے بلا توقف کہا۔
''تو پھر؟''
وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے بالوں میں لگی
افشاں اپنی انگشت شہادت کی انگلی پر لیتے ہوئے بولا۔ ''خدا
نے مرد کو عورت کا نگہبان قرار دیا ہے ..... نگہبان کا کام ہے کہ
جو چیز اس کی نگرانی میں دی گئی ہے، اس کا خیال رکھے۔
اگر نگہبانی میں دی جانے والی شے کوئی بشر ہے تو اس کی خطا
سے درگزر کرنے کا حوصلہ اور اصلاح کی کوشش کرے۔ مرد
کو فراخ دل اور اعلیٰ ظرف ہونا چاہیے۔''
''میری کوئی خطا نہیں تھی۔ آپ جیسی مرضی آئے، قسم
لے لیں مجھ سے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''میں آگے دیکھنے والا آدمی ہوں۔ پیچھے پلٹ کر
دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے۔''
''مجھ پر شک ہے آپ کو؟''
''چیزیں میلی اسے نظر آتی ہیں جس کی اپنی آنکھ میلی
ہوتی ہے۔ دیکھو آج کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی بھی
اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرے گا۔''
وہ چپ رہی۔
''ٹھیک ہے نا۔''
''جی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔
''جی کا مطلب؟''
''جیسے آپ چاہتے ہیں۔''
''میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو۔ لوگ کیا کہتے
ہیں، کیا نہیں کہتے، برداشت کرو۔ ہماری زندگی ہے، ہم جو جی
چاہے فیصلہ کریں، جس طرح چاہیں جئیں۔ دنیا کو اس سے
مطلب نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں دنیا کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔
[illegible]

مل جائے تا کہ میں شام کو کوئی دوسری جاب بھی کر سکوں۔"
"کیوں؟ دوسری جاب کیوں؟"
"کیونکہ بیوی والا ہو گیا ہوں، ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"کوئی دوسری جاب واب نہیں۔ میری جاب بھی تو ہے، گزارہ ہو جائے گا۔" عارفہ نے کہا۔
"تمہاری مرضی ہے جاب کرو یا نہ کرو۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں لیکن میں بیوی کی کمائی پر نظر رکھنے والا مرد نہیں ہوں۔"
"گھر میں تو آپ کو شام سے پہلے گھر میں دیکھنا چاہوں گی۔ میری امی جب تک زندہ رہیں، بھائی سے ان کی ایک ہی فرمائش ہوتی تھی کہ شام سے پہلے گھر آ جانا۔"
شہریار اسے الفت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے وقت کا مقبول نغمہ دھیمے سروں میں گنگنانے لگا۔

شام سے پہلے آنا
دھوپ ساری ڈھل رہی ہو
پھول سارے کھل گئے ہوں
موسم سارے لے آنا

"ارے واہ! آپ تو بہت اچھا گا لیتے ہیں۔" عارفہ چہک کر بولی۔
"گا لیتا نہیں ہوں، اکثر گاتا ہوں۔"
"زبردست، بہت اچھے۔"
"آداب، آداب! تم نے تعریف کر دی، سمجھو سرٹیفکیٹ مل گیا مجھے۔" وہ مسکرایا۔
"واقعی بہت سریلے ہیں آپ۔"
"یار! ایک بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" شہریار منہ لٹکا کر بولا۔
"وہ کیا؟" عارفہ نے اسے تشویش سے دیکھا۔
"ہماری شادی کو آج دوسرا ہی دن ہے......"
"ہاں تو؟"
شہریار کی آنکھوں میں شرارت ناچی۔ "تو یہ......" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ "کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"
عارفہ کا سر جھکتا ہی چلا گیا...... نیاز مندی سے...... تشکر سے...... رب لاشریک نے اس کی کلفت کو مسرت میں بدل دیا تھا۔

☆☆☆

عارفہ اپنے گھر میں خوش تھی [illegible] اس کے لیے ہر اعتبار سے ایک اچھا شوہر ثابت ہو رہا تھا۔ اس سے محبت اور احترام سے پیش آتا۔ اس کی مادی اور جذباتی ضرورتوں کا خیال رکھتا۔ اسے گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے جاتا۔ اس کی کمائی پر نظر رکھنا تو کجا، کبھی یہ بھی نہ پوچھتا کہ اس کی تنخواہ کتنی ہے۔ اس کی سابقہ زندگی کے بارے میں حسب وعدہ کبھی کوئی بات نہ کرتا۔ شہریار کے رویے کا تقاضا تھا کہ وہ بھی ایک اچھی شریک زندگی ثابت ہونے کی کوشش کرتی، سو وہ کر رہی تھی۔ مختصر عرصے میں ہی شہریار اس کے لیے مرکز حیات بن گیا تھا۔ وہ اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ ہر معاملے میں شہریار کی خوشی کو عزیز رکھتی۔ گھریلو اخراجات میں برابر سے اس کا ہاتھ بٹاتی۔ تیرے میرے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔
شہریار کے گھر میں اب چار نفوس تھے۔ شہریار، عارفہ، شہریار کی والدہ اور چھوٹا بھائی شہزاد۔ شادی کے بعد شہریار نے اپنی والدہ کے بارے میں عارفہ کو پہلی رات ہی باخبر کر دیا تھا کہ ان کا رویہ اس کے لیے مسئلہ بن سکتا تھا سو وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔ بات بات پر ان کا یہ جتانا کہ شہریار کو ابھی سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی، اسے آزار پہنچاتا مگر وہ کچھ کہنے سننے سے گریز کرتی۔ ایک خاموشی سو بلائیں ٹالتی ہے کے مصداق شہریار کی والدہ اس کی طرف سے کوئی حتمی ردعمل نہ ہونے پر خود ہی بول بال کر چپ ہو جاتیں۔ شہزاد بھی اپنی والدہ کا ہمنوا تھا۔ بہانے بہانے عارفہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا کہ اس کے بھائی نے ایک طلاق یافتہ لڑکی سے جو بدنام بھی تھی، شادی کر کے اس کی سات نسلوں پر احسان کیا تھا۔ گھر میں بس ایک شہریار ہی تھا جو اس سے ہمیشہ محبت سے بات کرتا، عزت سے پیش آتا۔ نہ کبھی اس کے ماضی کے بارے میں بات کرتا، نہ اس سے شادی کرنے پر احسان دھرتا بلکہ اکثر کہتا۔ "میں خوش قسمت تھا جو مجھے تم جیسی لائف پارٹنر مل گئی۔"
عارفہ کہتی۔ "خوش قسمت میں ہوں۔" کبھی بھولے سے بھی وہ شہریار سے اس کی والدہ اور بھائی کی نازیبا باتوں کا گلہ نہ کرتی۔
عارفہ کے گھر والے اب بھی اسے تشویش سے دیکھتے۔ اس کے بارے میں فکرمند رہتے اور بہانے بہانے کھوجنے کی کوشش کرتے۔
"تم خوش تو ہو عارفہ؟" بہنیں پوچھتیں۔
وہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتی مگر ان کی [illegible]
"کوئی زیادتی تو نہیں کرتا شہریار تمہارے ساتھ......"

"نہیں نہیں...... وہ تو بہت اچھے ہیں۔"
"تمہاری کلائی پر نشان کیسا ہے؟"
"تیل کا خالی ڈبا ادھوری ہی رکھا کر اس میں دال وغیرہ ڈالوں گی۔ اپنے کنارے سے کلائی پر کٹ لگ گیا۔"
"سچ کہہ رہی ہو؟" اسے شک سے دیکھا جاتا۔
"ہاں، ہاں...... جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"
وہ جب میکے جاتی، بھائی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھتے۔ "ٹھیک تو ہو بیٹا؟"
"جی بھائی!"
"کوئی مسئلہ تو نہیں؟"
"نہیں بھائی!"
"دیکھو، کوئی بات ہو تو چھپانا مت۔"
"آپ فکرمند نہ ہوں بھائی! سب ٹھیک ہے۔"
"خدا ٹھیک ہی رکھے۔"
چلتے سے بھائی زبردستی اس کی مٹھی میں ہزار دو ہزار دبا دیتے۔
"ضرورت نہیں ہے بھائی۔" وہ منع کرتی۔
"میں کب کہہ رہا ہوں کہ ضرورت ہے۔ بھائی کے گھر سے بہن کو خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔"
"شکریہ بھائی!"
وہ دل ہی دل میں بھائی کی سلامتی کی دعا کرتی۔
بھائی کی ایما پر بھابی ہمیشہ اسے اور اس کے سسرال والوں کو بہانے بہانے کچھ نہ کچھ دیتی رہتیں۔ کبھی اس کے لیے قیمتی تیار سلا جوڑا، کبھی شہریار کے لیے سوٹ کا کپڑا، کبھی اس کی ساس کے لیے گرم چادر، کبھی شہزاد کے لیے سوئٹر۔ اس کے جہیز کی مسہری کے لیے چادر اور تکیہ غلافوں کا سیٹ، کبھی گھریلو استعمال کی کوئی چیز تو اکثر گاؤں سے آئی سوغاتوں میں اس کا حصہ۔ بھائی، بھابی یا بھتیجیں سسرال میں اس کی خیر خبر لینے آتے تو کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ کبھی شہد کی بوتل، کبھی تازہ پھل۔ سرد موسم میں خشک میوہ جات تو کبھی بلاسبب ہی مٹھائی کا ڈبا۔ آپا عموماً فروزن فوڈز لاتیں۔ "فریج میں کوفتے، کباب اور سموسے رکھے ہوں تو آسانی رہتی ہے۔" وہ بڑے پیار سے کہتیں۔ کینیڈا سے بھی تحائف بھی پیسے آتے رہتے۔ عارفہ رب کی شکر گزار ہوتی کہ اس کے اتنے چاہنے والے رشتے موجود ہیں۔
شہریار دبی زبان سے کہتا۔ "یار! اپنے گھر والوں سے کہو [illegible] سسرال والوں سے وہ ماری کا خراج [illegible] ہیں۔ اپنے مرحوم و مغفور والد کی طرح غیور اور اپنی عزت نفس کا پاس رکھنے والا شخص تھا۔ عارفہ اس کی فطرت و عادات سے خوب واقف ہو چکی تھی۔
"میں منع نہیں کر سکتی شہریار!" وہ کہتی۔
"کیوں منع نہیں کر سکتیں؟"
"ان کا دل ٹوٹے گا۔"
"یار! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہماری ساری ضرورتیں تو اللہ میاں عزت سے پوری کر رہے ہیں۔"
"الحمدللہ، شکر ہے رب کا...... گھر میں بھائی، بھابی، آپا کسی کو بھی منع نہیں کر سکتی۔ ان کا دل بھی تو رکھنا ضروری ہے نا شہریار...... ورنہ سوچیں گے یہ شادی کے بعد تیز اور مغرور ہو گئی ہے۔ شادی سے پہلے تو میں خود فرمائشیں کر کر کے منگا کرتی تھی ان سے چیزیں۔"
"تب کی بات اور تھی، اب تم میری ذمے داری، میری عزت ہو۔ تنگی یا فراخی جیسے بھی ہو، مجھ ہی کو تمہارا خیال رکھنا چاہیے۔"
"آئی لو یو شہریار!" وہ اسے محبت سے دیکھتی۔
"لو یو ٹو۔" وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیتا۔
عارفہ کو اس کی بانہوں کے حصار میں ان کہا تحفظ محسوس ہوتا۔ وہ بھول جاتی کہ بھائی بہنوں کی محبت کے باوجود زندگی میں پہلے کی سی فراغت نہ رہی تھی۔ انتہائی کفایت شعاری کے باوجود مہینے کے آخری دنوں میں قدرے تنگی ہو جاتی تھی۔ شہریار شادی کے بعد بے اوقات کار والی سابقہ ملازمت ترک کر کے اب کم اوقات کار والی ملازمت کر رہا تھا۔ تنخواہ زیادہ نہ تھی مگر عارفہ گھریلو اخراجات میں اس کا پورا پورا ہاتھ بٹاتی۔ اسکول کی ملازمت کے علاوہ اس نے گھر میں بچوں کو ٹیوشن بھی دینا شروع کر دی تھی جس سے اضافی آمدنی ہو جاتی۔ ملازمت اور گھریلو ذمے داریاں اسے تھکا دیتیں مگر وہ شہریار سے کبھی نہ اپنی تکان کا ذکر کرتی، نہ کوئی گلہ کرتی۔ والدہ اور شہزاد کی ذمے داری بھی شہریار پر تھی۔ شہزاد یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور خاصا نخریلا اور خرچیلا تھا۔ روزانہ بھائی سے پیسے مانگنے کھڑا ہو جاتا۔ شہریار کبھی کبھی زچ بھی ہو جاتا۔ "آخر کب تک میں اسے موٹر سائیکل میں پیٹرول ڈلوانے اور یونیورسٹی میں چائے پانی کے لیے پیسے دیتا رہوں گا۔ اسے خود بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا۔" وہ اکثر بڑبڑاتا۔
"فکر نہ کریں شہریار...... تعلیم ختم ہو گی تو اسے خود ہی [illegible] آپ پریشان نہ ہوں۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تمہارے پیسے بھی سارے کے سارے گھر ہی میں خرچ ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں تو کیا ہوا۔ میں اپنے گھر کے لیے ہی تو کماتی ہوں۔ آپ ٹینس نہ ہوا کریں۔"

"میرا بس چلے تو تمہیں نوکری ہی نہ کرنے دوں۔ سخت برے لگتے ہیں مجھے وہ مرد جو بیویوں کی کمائی پر چلتے ہیں۔ مگر میں بھی انہی میں شامل ہو گیا ہوں۔" آخری فقرہ وہ کچھ شرمندگی اور ملال سے ادا کرتا۔

"شہریار، پلیز! ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ مجھے کوفت ہوتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لائف پارٹنرز ہوتے ہیں۔ جب شریکِ زندگی بن گئے تو ہر معاملے میں کھلے دل سے شراکت ہونی چاہیے۔ میں جاب کروں اور اپنی تنخواہ بند رکھ کر سارا بوجھ آپ پر ڈال دوں تو یہ تو شراکت نہ ہوئی۔ آپ جس قسم کے مردوں کی بات کر رہے ہیں، میں جانتی ہوں آپ اس طرح کے مرد نہیں ہیں۔ یہ ہم دونوں کا گھر ہے۔ آپ کی امی اور بھائی سے میرا بھی رشتہ ہے۔ خدا جانتا ہے، مجھے اپنے گھر کے لیے کچھ کر کے خوشی اور سکون ملتا ہے۔"

شہریار اسے تحسین و محبت کی نظروں سے دیکھنے لگتا۔

"سدا یہ دن نہیں رہیں گے۔ میرے امیگریشن پروسس میں اب آپ کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔ امیگریشن ہو جاتی ہے تو ہم کینیڈا جا کر امی اور شہزاد کو بھی وہیں بلانے کی کوشش کریں گے۔"

شہریار اسے دیکھنے لگتا۔

"ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟"

"بہت بدقسمت تھا وہ شخص۔" شہریار نے ایسے ہی موقع پر ایک روز کہا۔

"کون؟" عارفہ نے جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کی۔

"جس کا نام بھی میں اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ جس نے تم جیسی لڑکی کی قدر نہیں کی۔۔۔۔ ایڈیٹ۔۔۔۔ باسٹ۔۔۔۔" اس نے دوسری گالی ادھوری چھوڑ دی۔

"بری بات۔ اچھے بچے زبان گندی نہیں کرتے۔"

"میں اکثر شرمندگی محسوس کرتا ہوں تم سے۔"

"لو۔۔۔ تو بہ تو بہ کیوں۔۔ گنہگار کرتے ہیں مجھے۔"

"میری ماں تم سے رنج دے کر بات نہیں کرتیں۔ گھر کا سارا کام تمہیں اکیلے ہی کرنا پڑتا ہے۔ صبح کو اسکول جاتی ہو تو سب کو ناشتا دے کر اور امی کے لیے دوپہر کا کھانا بنا [illegible]

کی صفائی، میلے برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی، بچوں کو ٹیوشن پڑھانا، شام کی چائے، رات کے کھانے کی تیاری، اگلے دن کے لیے کپڑوں پر استری، کبھی اسکول انسپکشن کے لیے چارٹس بنانا تو کبھی مہمانوں کی خاطر مدارات۔۔۔۔ اور کبھی خاندان والوں کی غمی خوشی میں جانا۔ اتنے کام، اتنی بھاگ دوڑ اور تم ہو کہ تھکن کا اظہار بھی نہیں کرتیں، نہ کبھی امی کی بے رخی اور شہزاد کی بدتمیزیوں کا گلہ کرتی ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ شہزاد کے انسلٹنگ رویے کی خبر نہیں ہے کیا۔"

"بس یا کچھ اور؟" وہ مسکرا کے بولی۔

"نہیں۔۔۔۔ ہے تو اور بھی بہت کچھ مگر فی الحال تمہاری سمع خراشی کے لیے اتنا ہی بس۔"

"او کے۔۔۔۔ میں صرف اتنا کہوں گی کہ جو میں کرتی ہوں، کسی پر کوئی احسان نہیں۔ اس گھر کو مکان بننے سے بچانا اور گھر بنائے رکھنا میرا فرض ہے۔ مجھے آپ کی امی کی بے رخی کا بھی کوئی گلہ نہیں۔ ماؤں کے اپنے بیٹوں کے لیے کچھ ارمان، کچھ خواب ہوتے ہیں۔ یہ ان کا احسان ہے کہ انہوں نے اپنے خوابوں کی قربانی دے کر مجھے اس گھر میں قبول کیا۔"

"یار! کمال کی پازیٹو سوچ ہے تمہاری۔"

"جیتے رہیے۔۔۔۔ خوش رہیے۔"

"خوش تو میں بہت ہوں۔ تم جیسی بیوی تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔"

"جزاک اللہ!"

وقت کے ساتھ اس کے بارے میں میکے والوں کا فکر اور خدشات کم سے کم ہوتے گئے پھر بھی بھائی کبھی کبھی پوچھ لیتے۔ "بیٹا تم خوش تو ہو؟"

"جی بھائی!"

"کوئی مسئلہ؟"

"کوئی مسئلہ نہیں بھائی۔۔۔۔ شہریار بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ بہت اچھے ہیں۔"

"خدا ہمیشہ اچھا ہی رکھے۔"

بڑے بھائی ہمیشہ اس پر باپ کی سی شفقت رکھتے تھے تو چھوٹا کینیڈا مقیم بھائی اس کا دوست اور ہمراز تھا۔ جو بات وہ کسی اور سے ذکر نہ کر پاتی، اس سے کہہ دیتی۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اس کا فون آ جاتا۔ حال احوال، امیگریشن کی صورت حال، سب پر تفصیلی گفتگو ہوتی۔ وہ ایک ایک بات اس سے ایسے شیئر کرتی جیسے قریبی دوست سے کی جاتی ہے۔ [illegible]

خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

"اسپیکر آن کرنا یار!" محسن شہریار سے کہتا۔

"کر دیا محسن بھائی!"

"عارفہ تمہیں تنگ تو نہیں کرتی شہریار؟" محسن مذاقاً کہتا۔

"نہیں محسن بھائی! عارفہ نے تو مجھے بالکل ریلیکس کر دیا ہے۔"

"مذاق مت کرو یار!"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا!" محسن اپنے لہجے سے حیرت کا اظہار کرتا۔ "میری یہ چھوٹی، پاگل، دیوانی سی بہن ایسی کب سے ہو گئی؟"

"جب سے اس کی مجھ سے شادی ہوئی ہے۔"

"لگتی ہے یار کہ تم سے شادی کر کے سنبھل گئی ہے۔"

"چھوٹے بھائی۔۔۔۔!" دونوں کی باتیں سنتی عارفہ شاکی لہجے میں قدرے بلند آہنگی سے کہتی۔ "مت انڈر ریٹ کریں مجھے، میرے میاں کے سامنے۔"

"نہیں! میں انڈر ریٹ کروں گا تجھے۔۔۔۔؟ اور وہ بھی تیرے میاں کے سامنے۔۔۔۔ جو تجھے تیری اور ہماری توقع سے زیادہ اوور ریٹ رکھتا ہے۔" محسن کہتا۔

"بھائی! شہریار بہت اچھے ہیں۔"

"آئی نو۔۔۔۔ آئی نو۔۔۔۔ میری بہن کو اللہ نے اس کے صبر کا بہترین اجر دیا ہے۔ ہم سب شہریار کی بہت قدر، بہت عزت کرتے ہیں۔"

عارفہ جہان بھر کی الفت اپنی نظروں میں سمو کر شہریار کو دیکھتی۔ بھول جاتی کہ سسرال کے ڈھائی مرلہ مکان میں اسے اپنے میکے کی آسانیاں اور فراغت نہ رہی تھی۔ چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا جس کی بالائی منزل پر تعمیر ادھوری تھی۔ نہ دیواروں پر پلاستر ہوا تھا، نہ فرش پر موزائیک یا ٹائلز لگے تھے۔ رنگ و روغن کا تو سوال ہی نہ تھا۔ پانی نیچے سے بھر کر لانا پڑتا۔ بجلی کی فراہمی بھی عارضی طور پر نیچے ہی سے تھی۔ شادی کے بعد شہریار کی والدہ نے ہفتہ عشرہ تو بہو بیٹے کو نیچے ہی رکھا پھر اوپر شفٹ کر دیا تھا۔ شہریار اس سے معذرت خواہ اور شرمندہ ہوا تھا۔ "گھر چھوٹا ہے عارفہ! امی بے چاری بوڑھی ہیں۔ بار بار اوپر نیچے نہیں جا آ سکتیں اس لیے انہوں نے ہمیں اوپر شفٹ کر دیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا تھا۔

[illegible] دھونے کے لیے نیچے سے پانی بھر کر لانا پڑتا۔ گو یہ کام زیادہ تر شہریار ہی کرتا لیکن اس کی عدم موجودگی میں اسے بھی کرنا پڑ جاتا تھا۔ زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی تو وہ پانی سے بھری بالٹی اوپر لاتے لاتے ہانپ جاتی تھی۔ بجلی کا بل کم رکھنے کی خاطر شہریار کی والدہ بجلی فراہمی کا مین سوئچ زیادہ تر آف ہی رکھتیں۔ کھانا پکانے اور دوسری بہت سی ضروریات کے لیے عارفہ کو دن میں کئی مرتبہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آنا جانا پڑتا۔ اچھی خاصی پریڈ ہو جاتی۔ رات بے رات کسی وقت چولہا جلانے کی ضرورت ہوتی تو نیچے ہی جانا پڑتا۔ چولہا جلتے ہی ساس کی آواز آتی۔ "تم لوگوں کو رات کو بھی چین نہیں۔"

"امی! شہریار کا گلا خراب ہو رہا ہے۔ غراروں کے لیے پانی گرم کرنے آئی ہوں۔" وہ عذر خواہانہ لہجے میں کہتی۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔۔ "شام کو شہریار نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ انہیں بھوک لگ گئی ہے۔ سالن گرم کر رہی ہوں۔" لہجہ عذر خواہی میں ڈوبا ہوتا۔

"تم لوگوں کا تو یہی ہے۔ آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔" بڑی بی غصیلی آواز میں کہتیں۔

وہ واپس اوپر جا کر شہریار سے کچھ کہنے سننے سے گریز کرتی مگر رات کے سناٹے میں ماں کی آواز پہلے ہی اوپر پہنچ چکی ہوتی۔

"امی غصہ ہو رہی تھیں نا؟" وہ آہستہ سے کہتا۔

"بے چاری دن بھر کی تھکی ہوتی ہیں۔"

حالانکہ وہ بے چاری دن بھر بیٹھنے، لیٹنے یا گھر آئی ہمسائیوں سے گپ شپ کے سوا اور کرتی ہی کیا تھیں۔

"اب کیسی ہی ضرورت ہو، کتنی ہی بھوک لگے رات کو تمہیں نیچے جانے کو نہیں کہوں گا۔"

"اوہو شہریار! کیوں سر پر سوار کر رہے ہیں اپنے۔"

"تمہیں میری وجہ سے امی کی سننا پڑی۔"

"گھر کے بڑے کہہ سن دیتے ہی ہیں شہریار!"

"اب نہیں بھیجوں گا تمہیں۔"

مگر پھر کوئی ضرورت مجبور کر دیتی۔ کبھی شہریار بھی اس کے ساتھ ہوتا۔

"شہری! تیری شادی کر کے تو میرا سکھ چین ہی جاتا رہا۔" شہریار کی والدہ باقاعدہ دہاڑتیں اور وہ دونوں چور سے بن جاتے۔

شہریار اکثر اس سے معذرت خواہ ہوتا۔ "یار! میں دیکھتا ہوں، امی کا رویہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے۔"

[illegible] سے حق ادا کر رہی ہوں۔" وہ شہریار کا دل رکھنے کو کہے [illegible]

دل کی کلفت دبا کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

"وہ تو تمہاری ہی تھیں نا۔"

"یہ بھی میری ہی ہی کی جگہ ہیں۔ لائف پارٹنرز ہونے کا مطلب تو یہی ہے نا کہ بیوی اور شوہر ہر سکھ دکھ، رشتہ، ہر دکھ شیئر کریں۔"

"تم بہت اچھی ہو عارفہ!"

"اپنے بارے میں جناب کا کیا خیال ہے؟"

"میں تو محدود وسائل والا آدمی ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔"

"اتنی محبت مجھے دے کر بھی کہتے ہیں۔ کچھ نہیں دے سکا۔"

"خالی خولی محبت سے کیا ہوتا ہے عارفہ؟"

"میرے لیے تو آپ کی محبت ہی سب کچھ ہے شہریار!"

"گلٹ فیل کرتا ہوں۔" شہریار اپنے موقف سے دستبردار نہ ہوتا۔

"اچھا تو پھر میرے پیچھے کیوں آئے تھے؟"

"کب؟"

"شادی سے پہلے۔"

"یار اس وقت تو میں جذباتی ہو گیا تھا۔ بس یہی لگن تھی میری کہ کسی طرح تم سے شادی کر لوں۔"

"اس لگن کو لگن ہی رہنے دیں۔ آپ کی وہ لگن میری زندگی کا سب سے اہم موڑ ہے۔"

"توبہ!"

"توبہ۔"

☆☆☆

وہ امید سے ہوئی تو کبھی اوپر، کبھی نیچے کی بھاگ دوڑ اسے زیادہ تھکانے لگی۔ اس حالت میں بھی پانی، کبھی ڈبے میں پانی بھر کر نیچے سے اوپر لے جانا اور بھی مشکل ہونے لگا۔ گو شہریار اس کی حالت کے پیش نظر پانی نیچے سے اوپر لانے کا کام خود ہی کرتا مگر پھر بھی اس کی عدم موجودگی میں پانی ختم ہو جانے کی صورت میں عارفہ کو خود ہی نیچے سے پانی بھر کر اوپر لانا پڑتا۔ نہ ساس کو اس پر ترس آتا، نہ شہزاد ہی ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ دونوں دیکھتے رہتے کہ اسے مشکل ہوتی تھی مگر نہ ساس، شہزاد سے پانی سے بھری بالٹی یا ڈبا اوپر پہنچا آنے کو کہتیں، نہ شہزاد کو خود ہی احساس ہوتا۔ ان کی بے حسی عارفہ کو خوا [illegible] تو شہریار سے وہ بھی گلہ نہ کرتی۔

مشکل کیسی ہی ہو، گزر ہی جاتی ہے۔ عارفہ کے مشکل [illegible]

ایک نئے رشتے کی خوشبو سے آشنا کیا۔ وہ اور شہریار دونوں بے حد خوش تھے کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام شایان رکھیں گے۔ بیٹی ہوئی تو عاصمہ —— شہریار کی والدہ نے اس موقع پر بھی تنگ دلی دکھائی۔ بچہ آپریشن سے ہوا تھا۔ بڑی بی جانتی تھیں کہ عارفہ کو گھر کی پہلی منزل پر ہی رکھا جا سکتا تھا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بھابی نے تو اسے کچھ عرصہ میکے میں رہنے کو کہا تھا مگر وہ جانتی تھی شہریار کو سسرال میں رہنا گوارا نہ ہوگا لہٰذا اس نے اسپتال سے چھٹی کے بعد اپنے ہی گھر جانے کو ترجیح دی تھی اور وہاں اسے زینہ چڑھنا مشکل ہوا مگر مجبوری تھی۔ ساس نے تنگنا دو چار دن تو نیچے سے کھانا بھجوایا پھر ہاتھ جھاڑ دیے۔ اس نے بھائی بہنوں کو نہ بتایا مگر وہ آنکھیں رکھتے تھے۔ بھائی نے ٹفن کیریئر میں کھانا بھجوانا شروع کر دیا۔ شہریار کو اچھا نہ لگا۔

"عارفہ! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اپنے گھر والوں کو منع کرو کہ تکلیف نہ کریں۔ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتیں، میں ہانڈی خود پکا لیا کروں گا اور نان تنور سے لے آیا کروں گا۔"

"شہریار! مجھے خود بھی اچھا نہیں لگتا۔ دو چار دن برداشت کریں پھر میں منع کر دوں گی۔"

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بہت طریقے سے بھائی اور بھابی کو کھانا بھجوانے سے منع کر دیا۔ "اسکول بھی تو جانا ہے مجھے۔ گھر کا کام شروع کروں گی تو اسٹیمنا بنے گا۔"

اسکول سرکاری تو تھا نہیں کہ اسے بچے کی ولادت سے ڈیڑھ ماہ قبل اور ولادت کے بعد ڈیڑھ ماہ کی چھٹی ملتی۔ پرائیویٹ اسکول تھا اور انتظامیہ کے اپنے قواعد و ضوابط تھے۔ چار ہفتوں کی رخصت ملی اور وہ بھی سیکشن ہیڈ مسز فیاض کی پرزور سفارش پر مع تنخواہ۔ وہ مسز فیاض کی بہت ممنون ہوئی۔

اسکول سے اس کی رخصت ختم ہونے سے قبل ہی شہریار کی والدہ نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر نہیں لیں گی۔ شہریار نے کہا۔ "نوکری چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑ دوں شہریار! ابھی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، نوکری چھوڑ دوں گی تو اور تنگی ہو جائے گی..... اور اب تو شایان کے خرچے بھی ہیں۔"

"پھر؟"

"آپا اور بھابی دونوں تیار ہیں اسے رکھنے کو مگر صبح کو اسے ان کے پاس چھوڑنا اور واپسی پر لینا بھی مسئلہ ہوگا۔"

[illegible]

لے لیا کرنا۔" شہریار نے تجویز دی۔

"آپ!" اس نے قدرے تعجب سے کہا۔ "اچھا بچے کو بھلا آپ بچے کو اس کے بے بی بیگ کے ساتھ لے کے بائیک پر سفر کر رہے ہیں۔"

"تم بھی تو وہ پہر کو اسے بے بی بیگ کے ساتھ ویگن میں سفر کر کے گھر واپس لایا کرو گی۔"

"یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوگی۔ بے شمار ملازمت پیشہ مائیں ایسا ہی کرتی ہیں۔"

"بچہ پالنا صرف ماں ہی کی ذمے داری ہے۔ باپ کو بھی ذمے داری اٹھانا چاہیے۔"

"میں اپنی سیکشن ہیڈ سے بات کروں گی۔ اگر انہوں نے اجازت دی تو میں [illegible] بچے ساتھ اسکول ہی لے جایا کروں گی۔ [illegible] واپسی پر اسے لینے جانے کے لیے لمبا چکر بھی بچ جائے گا۔ اسکول میں [illegible] ہے، اسے تھوڑے پیسے دے دیا کروں گی۔ وہ دیکھ لیا کرے گی اسے۔ فری پیریڈ میں، میں بھی دیکھ لیا کروں گی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ اجازت دے دیں گی؟"

"بات کر کے دیکھوں گی۔"

"شہریار! یہ تو معلوم ہو گا کہ گھر میں تمہاری ساس بھی ہیں۔"

"ہاں! یہ تو معلوم ہے انہیں۔"

"وہ یہ نہیں کہیں گی کہ تمہاری ساس نہیں رکھ سکتیں بچے کو؟"

"کہہ دوں گی، وہ ضعیف ہیں، انہیں مشکل ہوگی۔ ویسے وہ ایسی خاتون ہیں نہیں۔ کسی کی ذاتیات میں زیادہ نہیں گھستیں۔ یا تو وہ اجازت دے دیں گی یا نہیں دیں گی۔"

"تمہاری کولیگز کو بھی اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"دیکھتے ہیں شہریار کیا ہوتا ہے۔"

اگلے روز مسز فیاض [illegible] مسز فیاض ایک اصول پسند خاتون اور اچھی منتظم تھیں۔ عارفہ کو نے بچے کو اسکول لانے اور دن بھر وہیں رکھنے کی اجازت نہ دی کہ باقی ٹیچرز میں بہت سی چھوٹے بچوں کی مائیں تھیں، وہ بھی ایسی ہی کسی سہولت کا تقاضا کر سکتی تھیں۔ انصاف تو یہی تھا کہ سہولت ہو تو سب [illegible] ورنہ کسی کے لیے بھی نہیں۔ علاوہ بریں، وہ خود بھی ادارے کی ملازمہ اور قواعد و ضوابط کی پابند تھیں۔ انتظامیہ کے علم میں لائے بغیر کسی ملازمہ کو ایسی کوئی سہولت دینا جس سے ادارے کے انتظام و انصرام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا، انہیں انتظامیہ کے سامنے جواب دہ [illegible]

لانے کی اجازت تو نہ دی البتہ متبادل بندوبست کر دیا۔ اسکول کے نزدیک ان کی ایک دوست رہتی تھیں جن کی ایک ہی بیٹی تھی جسے انہوں نے اس کی کم عمری ہی میں اپنے بھانجے سے جو امریکا میں مقیم تھا، بیاہ دیا تھا۔ شوہر سرکاری افسر تھے۔ ایک ملازمہ صبح تا شام ان کے ہاں ہوتی۔ مسز فیاض نے عارفہ کے بچے کو ان کے پاس رکھنے کی سفارش کی تو انہوں نے تامل نہ کیا۔ بچے کی دیکھ بھال کے لیے عارفہ نے ان کی گھریلو ملازمہ کو ماہانہ کچھ پیسے دینے کا طے کر لیا۔ صبح کو اسکول آتے ہوئے عارفہ بچے کو ان کے ہاں چھوڑ دیتی، چھٹی کے بعد اسے لیتے ہوئے گھر چلی جاتی۔ وقفے میں اکثر وہ شایان کو دیکھنے چلی جاتی۔

ساتھ رہنے سے تو انسان بے زبان جانوروں سے بھی محبت کرنے لگتا ہے۔ مسز فیاض کی دوست شہلا معین کو شایان سے ایسا انس ہوا کہ جس دن چھٹی ہوتی، اس سے اگلے دن عارفہ بچے کو ان کے ہاں چھوڑنے جاتی تو وہ نہایت خلوص سے کہتیں۔ "مس عارفہ! ہم نے کل اپنے دوست کو بہت مس کیا۔"

"میں ساری زندگی آپ کی اور مسز فیاض کی شکرگزار رہوں گی۔" عارفہ تشکر سے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتی۔

"شکرگزاری کیسی؟ تمہارے بیٹے کی موجودگی سے تو میرے گھر میں رونق رہتی ہے۔"

"تھینک یو۔"

مسز فیاض کے توسط سے ملی اس سہولت پر جو بلاشبہ اللہ کی رحمت ہی سے اسے میسر ہوئی تھی، وہ اپنی آئندہ زندگی میں مسز فیاض اور ان کی دوست کی سدا ممنون رہی۔

☆☆☆

شایان ابھی چھوٹا ہی تھا کہ وہ دوبارہ امید سے ہو گئی۔ ساس نے تنک کر کہا۔ "ابھی ایک ہی نہیں پلا اور تم دوسرے کی تیاری کر بیٹھیں۔" اس کے جی میں تو آیا کہہ دے پہلے کی دیکھ بھال میں آپ نے میرا کون سا ساتھ دیا جو آپ دوسرے کی خبر سے پریشان ہو رہی ہیں —— مگر اس نے خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ امی کہا کرتی تھیں ایک خاموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

مسز فیاض کو علم ہوا تو وہ مشفقانہ لہجے میں بولیں۔ "بہت جلدی ہے مس عارفہ!"

"سوری میڈم!" اس نے یوں سر جھکایا جیسے اعتراف جرم کر رہی ہو۔

مسز فیاض مسکرا دیں اور [illegible]

ڈرتے ہوئے بولیں۔ ''شرمندہ ہونے کو تو نہیں کہا میں نے۔''
''میڈم! میں خود نہیں چاہتی تھی اتنی جلدی مگر۔۔۔''
اس نے کہا۔
''اللہ کی مرضی۔'' مسز فیاض نے گرہ لگائی۔
''یس میڈم!''
''میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ ابھی تو تم ایک بچی پال کر بڑا نہیں کرسکیں۔ صبح کو اسکول آتے ہوئے میں اکثر دیکھتی ہوں تمہیں کہ کندھے پر اپنا اور بے بی بیگ لٹکائے بچے کو گود میں اٹھائے تم کتنی بھاگ دوڑ میں اسکول آرہی ہوتی ہو۔ دو دو بچے کیسے سنبھالو گی؟''
''میڈم! آپا کہتی ہیں دوسرے کو وہ رکھ لیں گی اپنے پاس۔ چھٹی والے دن میں اسے گھر لے جایا کروں گی۔''
''کتنی مشکلات ہوتی ہیں ملازمت کرنے والی ماؤں کو۔'' مسز فیاض نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔
''جی میڈم! ہوتی تو ہیں۔ میرا دل تو ابھی سے اس خیال سے دکھتا ہے کہ کیسے چھوڑوں گی اسے آپا کے پاس۔''
مسز فیاض نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر دلاسا دینے کی کوشش کی اور بولیں۔ ''خوش قسمت ہو کہ تمہاری بہن تمہیں سپورٹ دینے کو موجود ہیں۔ مسز رحمان کی تین بچیاں ہیں۔ سب سے بڑی کو تو انہوں نے وقت سے پہلے ہی کنڈر گارٹن میں داخل کرا دیا تھا۔ دو چھوٹی بچیاں گھر میں ہوتی ہیں جن کی پیدائش میں بہت کم وقفہ رہا۔ ان میں سے ایک غالباً ڈھائی سال کی ہے اور چھوٹی چھ سات ماہ کی۔ چند دن پہلے مسز رحمان نے مجھے بتایا کہ چھوٹی بچی کو وہ دوسری بچی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آتی ہیں۔ دودھ کی بوتلیں وہ تیار کرکے رکھ آتی ہیں۔ بڑی والی بچی کو جو بے چاری خود بھی ڈھائی سال کی ہے، سمجھا دیا ہے کہ جب چھوٹی بہن روئے تو اسے دودھ کی بوتل منہ سے لگا دینا۔''
''مائی گاڈ!'' عارفہ نے اپنے دونوں ہاتھ دائیں بائیں رخساروں پر رکھتے ہوئے جھرجھری لی۔ ''بچی کو اچھو لگ جائے۔۔۔ ناک میں دودھ چلا جائے۔۔۔ الٹی ہوجائے۔۔۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے میڈم!''
''ہاں۔۔۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' مسز فیاض نے تائید کی۔ ''کوئی بھی ایمرجنسی!''
''مسز رحمان کو بچیوں کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے۔''
''کیا کریں بے چاری! ہسبینڈ، وائف دونوں جاب کرتے ہیں۔ گھر میں کوئی اور ہے نہیں بچیوں کی دیکھ بھال کرنے والا۔''
''کوئی میڈ رکھ لیں۔''
''میڈز کے نخرے کتنے ہوتے ہیں اور پھر مسز رحمان کی اپنی تنخواہ ہی کتنی ہے۔ جو کمائیں اس میں سے آٹھ دس ہزار میڈ کو دے دیں تو خود انہیں کیا بچے گا۔''
''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔''
''ملازمت پیشہ ماؤں کی بہت مشکلات ہیں۔ بالخصوص وہ جن کی نوکریاں کچھ زیادہ نہیں دیتیں، بس آنسو پونچھنے کا ذریعہ ہیں۔'' مسز فیاض نے توقف کیا پھر قدرے دل گرفتگی سے بولیں۔ ''رشتوں میں ایسی خود غرضی آگئی ہے کہ سگے خونی رشتے ایک دوسرے کے مسائل شیئر کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔''
''تھینکس گاڈ میڈم! میرے بہن بھائی تو بہت اچھے ہیں۔ بہت سپورٹ دیتے ہیں۔ مجھے تو شایان کے لیے بھائی اور دونوں بہنوں نے آفر دی تھی کہ وہ شایان کو لک آفٹر کرلیں گی مگر روزانہ چھوڑنے اور لینے کا مسئلہ تھا۔ بھائی نے تو یہ بھی کہا کہ شایان منڈے سے فرائیڈے تک ان کے پاس رہے، ویک اینڈ پر میں اپنے گھر لے جایا کروں مگر میرے ہسبینڈ راضی نہیں ہوئے۔''
''بہرحال، اب دوسرے بچے کے لیے تو تمہیں اپنے گھر والوں ہی سے مدد لینا ہوگی۔ میں شاید شہلا سے دوبارہ نہ کہہ سکوں گی۔''
''جی، جی میڈم۔۔۔ میں آپ کو کسی تکلیف میں نہیں ڈالوں گی۔''
''میرا خیال ہے تم میری مجبوری سمجھ رہی ہو۔''
''جی میڈم! بالکل سمجھ سکتی ہوں۔''
''ویسے میری عادت تو نہیں کسی کے ذاتی معاملات میں مداخل ہونے کی لیکن چونکہ تم مجھ سے شیئر کرتی ہو اس لیے مجھے۔۔۔ تمہاری مدر ان لاء کا رویہ یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ساس یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ وہ خود بھی کسی کی بہو، کسی کی بیٹی رہ چکی ہے۔''
''میڈم! میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ اپنے بیٹے کی دلہن کی آئیڈیل ساس بنوں گی۔''
مسز فیاض دھیرے سے مسکرا دیں۔ ''ساس بننے سے پہلے غالباً ہر بیٹے کی ماں یہی کہتی ہے۔''
''میری ساس کا معاملہ ذرا مختلف ہے میڈم!'' عارفہ کی آواز دھیمی اور لہجے میں قدرے دل شکستگی تھی۔
''کیا مطلب۔۔۔؟'' مسز فیاض نے اسے چونک کر دیکھا۔
''ان کا بیٹا کنوارا تھا اور میں طلاق یافتہ ماں۔۔۔

بیٹے کی شادی کے لیے کچھ خواب تو ہوتے ہیں نا میڈم!''
''بالکل ہوتے ہیں لیکن ہم انسانوں میں ایک دوسرے کا درد شیئر کرنے کی ریت ہونی چاہیے۔ جب آپ کسی دکھی کو دردمندی سے اپنے گلے لگاتے ہیں تو اللہ پاک بھی آپ کے لیے آسانیوں کے در کھولتے چلے جاتے ہیں۔''
عارفہ کا جی بھر آیا۔ اپنی پہلی شادی سے پہلے اس نے کب سوچا تھا کہ زندگی ایسی خاردار بھی ہوتی ہوگی۔ وہ تو اپنی ہی دنیا میں گم رہنے والی لڑکی ہوتی تھی جس کا اس وقت تک کا سب سے بھرپور عشق اس کی ماں تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ کہانیاں پڑھتی، کہانیاں لکھتی تھی۔ شوقیہ شاعری بھی ہوجاتی۔ کبھی بہن بھائیوں کے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی نظمیں، کبھی دوستوں کی فرمائش پر یونیورسٹی کے سبزہ زار پر موسم سرما کی چمکیلی دھوپ میں تک بندی اور کبھی کسی بڑے شاعر کی کوئی غزل دل کو لگ جاتی تو اسی بحر میں طبع آزمائی۔
زندگی بدل گئی تھی۔ نہ وہ فرصت رہی تھی، نہ وہ مشاغل۔ کولہو کے بیل کی طرح بس ایک ہی روٹین میں صبح سے شام تک گھومتے رہنا۔ گھرداری، نوکری، بچے کی دیکھ بھال، شوہر کی خوشنودی۔ زندگی جیسے ایک دائرے میں مقید ہوگئی تھی۔ وہ تو کرم تھا خدا کا کہ اس دائرے میں اسے ایک اچھے شوہر کا ساتھ نصیب تھا ورنہ مشکل ہوتی۔ وہ خدا کے اس کرم پر دن میں نہ جانے کتنی مرتبہ خدائے مہربان کا شکر ادا کرتی تھی۔ امی کہا کرتی تھیں۔۔۔ شوہر اچھا ہو تو عورت ہر مشکل جھیل جاتی ہے۔۔۔ سو وہ جھیل رہی تھی اور خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔

☆☆☆

عامرہ کی پیدائش نے اس کی مصروفیت میں مزید اضافہ کردیا۔ ماں ہونے کے ناتے بچی کو ہفتے میں پانچ دن کے لیے بھائی یا بہن کے گھر رکھ کر اپنی نظروں سے دور کرنا اسے گوارا ہوا نہ ہی شہریار آمادہ ہوا۔ ساس کا رویہ وہی تھا۔ اب بھی اسے آزار پہنچانے کو کوشاں تھیں۔ ''شہریار کے لیے تو بہتیرے رشتے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور مالدار گھر کی لڑکی۔ بس اس کی اپنی عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔''
''امی! میرے لیے تو بہت دیکھ بھال کر لانا۔ کوئی طلاق یافتہ یا خلع والی نہ ہو۔'' شہزاد اسے چڑانے کو کہتا۔
''بیٹا! تو وقت آنے دے۔ تیرے لیے تو میں صاف ستھری، ایک دم کنواری لاؤں گی۔''
عارفہ سمجھ جاتی کہ وہ بیگم اور اس کے گھر والوں کی اس کے بارے میں پھیلائی گئی نازیبا باتوں کا طعنہ دے رہی تھیں۔ وہ تلملا تو جاتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی۔ خدا سے لو لگاتی اور ناکردہ گناہوں کے طعن و تشنیع سے چھٹکارے کی دعا کرتی۔
عامرہ کو صبح بھائی کے ہاں چھوڑنے جاتی۔ شایان کو اپنے ساتھ لے جاتی، اسے شہلا تحسین کے پاس چھوڑنا ہوتا۔ اچھی خاتون تھیں۔ کبھی ناک بھوں نہ چڑھاتیں۔ عامرہ کے سلسلے میں اس نے ان سے کوئی بات نہ کی تھی پھر بھی ایک روز وہ خود ہی بولیں۔ ''مجھے تمہاری بچی کو بھی اپنے ہاں رکھنے میں کوئی اعتراض نہ تھا مگر میری میڈ کو گھر کے کام نہ کرنے کا بہانہ مل جاتا۔''
''کوئی بات نہیں شہلا آپا! شایان کے سلسلے میں آپ نے میری جو ہمدردی کی، میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔''
''نہیں، نہیں۔۔۔ احسان مندی کی کوئی بات نہیں۔ سچ بتاؤں تمہیں۔۔۔ جب تمہاری میڈم فیاض نے مجھ سے تمہاری پرابلم کا ذکر کیا اور میری مدد چاہی تو مجھے اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کا شوہر اور وہ خود دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ جب بچہ چھوٹا تھا تو اسے اس کی دیکھ بھال میں کافی پرابلم رہی۔ مجھے بلانے کی کوشش کرتی رہی مگر مجھے یہ زیب نہ لگا۔ بے بی کیئرز ہوتے ہیں مگر وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی ان کے پاس۔ آخرکار میرے داماد کے ایک کولیگ کی بیوی نے جو پاس ہی رہتی تھی، میرے نواسے کی دیکھ بھال میں ان کی مدد کی۔ تمہیں پرابلم میں دیکھ کر میں نے سوچا، آخر کسی نے پردیس میں میری بیٹی کی بھی تو مدد کی۔ مجھے بھی تمہاری مدد کرنا چاہیے۔''
''آپا! اب لوگ اگر اسی طرح سوچنے لگیں تو زندگی کتنی آسان ہوجائے۔'' عارفہ نے ممنونیت سے کہا۔
''بات یہ ہے بی بی کہ دوسرے کے درد کا احساس اسی کو ہوتا ہے جسے خود بھی ویسا ہی درد ہوا ہو۔''
''ٹھیک کہتی ہیں آپ۔'' اس کی آنکھوں کے گوشے اس خیال سے نم ہوگئے کہ شہریار کی والدہ کو اس کے درد کا احساس شاید اسی لیے نہیں کہ وہ بیٹی کی ماں نہیں تھیں۔ امی کتنا خیال رکھا کرتی تھیں بھابی کا۔ چھوٹی تو خیر تھی ہی کینیڈین نژاد۔ بھائی کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی ہوگئی۔ شادی کینیڈا میں ہی ہوئی۔ ویسے کے لیے دلہا، دلہن اور دلہن کے والدین اور بہن بھائی چند دن کے لیے پاکستان آئے تھے۔ بڑی بھابی

ہوں، وہاں کبھی زندگی کٹ ہی جاتی ہے۔ امی کو اب بھی یہ احساس ہوتا کہ ان سے بھائی کے حق میں کوئی زیادتی ہوگئی ہے۔ وہ معذرت کریں اور بہو کو گھر لے آئیں ورنہ کہیں ہیں اگلے جہاں کی بیٹی اور کہیں رہنا چاہتی۔ میری بیٹیاں بھی دوسرے گھروں میں ہیں۔ اگر میں بہو کا قرض اپنے سر رکھوں گی تو میری بیٹیوں کو قرض اتارنا پڑے گا۔

شہریار کی والدہ تو بہانے بہانے اسے پرکھ لگاتی تھیں۔ نہ کبھی معذرت کریں، نہ اس سے محبت کا برتاؤ کرتیں۔

☆☆☆

فریال کریم کی دوسری بیوی پہلے بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو لے کر اپنے میکے چلی گئی تھی اور اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ عارفہ نے تو اپنے اور کریم کے چند دن کے ساتھ میں اسے تنگ اور تند و تیز ہی پایا تھا مگر اس کی دوسری بیوی کے بقول وہ تنگی اور عورت کو مختلف طریقوں سے آزار پہنچانے کے ساتھ بلا کا دشنام طراز، شکی اور نشے باز بھی تھا۔ ایسی ایسی فحش گالیاں بکتا کہ سننے والے کی طبیعت مکدر ہو جاتی۔ نکھٹو ایسا کہ کئی کئی دن کام پر نہ جاتا۔ پکی ملازمت بھی محض فسانہ تھا۔ آئے دن نئی جگہ پر نوکری کرتا مگر اس کی آئے روز کی چھٹیوں سے تنگ آکر اسے ملازمت دینے والے اس کی چھٹی کر دیتے۔ چرس کا نشہ کرتا تھا۔ عارفہ کو اپنے گھر والوں کے ذریعے سننے میں آیا کہ کریم کی دوسری بیوی جو اسی محلے کی رہائشی تھی اور اتفاق سے شہریار کی والدہ کے جاننے والوں میں سے تھی، برملا کہتی تھی کہ کریم کی پہلی بیوی اچھی تھی جو چند دن اس کے ساتھ رہ کر اس سے چھٹکارا پا گئی تھی۔ وہ ایسا مرد تھا ہی نہیں جس کے ساتھ کوئی معقول عورت گزارہ کر سکے۔

عارفہ کو سرخروئی اس وقت ملی جب ایک روز شہریار سیدھا اوپر آکر اس کے پاس بیٹھا اور بولا۔ "آج آخری بار اس شخص کا نام لوں گا تمہارے سامنے ... کریم کی دوسری بیوی امی کی بہت اچھی ملنے والی کی بیٹی ہے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو کریم کی ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ آج تو امی بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ "خدا بچائے ایسے مردوں سے۔""

عارفہ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا ہوا؟" شہریار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" [illegible] کرنے لگی۔

"کچھ تو ہے۔"

"پتا نہیں، اب بھی میری بے گناہی ثابت ہو سکے گی کہ نہیں۔"

"بے گناہی!" وہ چونکا۔ "کیسی بے گناہی؟ [illegible]"

"اس نے اور اس کے گھر والوں نے تو میرے بارے میں یہی مشہور کیا تھا محلے میں کہ میں کسی اور میں انٹرسٹڈ تھی اس لیے اس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکی۔"

"ہاں تو ... انٹرسٹڈ تو تھیں تم۔" شہریار بولا۔

"کیا مطلب؟" اس نے بڑبڑا کر شہریار کو دیکھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"انٹرسٹڈ تو تھیں نا تم اس سے پیچھا چھڑانے اور کسی اچھے آدمی کا انتظار کرنے میں۔"

"جی نہیں۔" وہ اس کے جواب پر کچھ مطمئن ہو کر بولی۔ "الزام تراشی سے گریز فرمائیں۔ میں کسی کے انتظار وانتظار میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ اس بھیانک تجربے سے گزرنے کا خیال بھی نہیں لاؤں گی اپنے دل میں۔"

"اب کیا خیال ہے؟" شہریار نے اسے محبت سے دیکھا۔

عارفہ نے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا دیا۔

"بتاؤ۔" شہریار نے تقاضا کیا۔

"آئی لو یو شہریار ... آئی ریئلی لو یو۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"غریب آدمی ہوں ... تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکا۔" شہریار کے لہجے میں معذرت تھی۔

"آپ نے مجھے اپنایا ... اس وقت میرا ہاتھ تھاما جب میں دکھ اور مایوسی کے اندھیروں میں گھری ہوئی تھی۔ آپ نے مجھے عزت دی، محبت دی۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر امیر اور دولت مند آدمی اور کون ہو سکتا ہے شہریار!" وہ اس کے بازو پر دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولتی گئی۔

"آئی لو یو ... اینڈ آئی ریسپیکٹ یو۔" شہریار اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایک عورت اپنے مرد سے بس اتنا ہی چاہتی ہے شہریار!" عارفہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"یار! تمہارے آنسوؤں کو مجھے کسی پناہ میں بند [illegible]"

[illegible] کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر [illegible]

مسکراہٹ نے دھوپ میں بارش کا سماں پیدا کر دیا۔

"کیوں ملن نہیں؟"

"آپ نے سنا نہیں ... آنسو ہی تو ہم عورتوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتے ہیں۔"

وہ بے ساختہ ہنسا۔

"سچ کہتی ہو ... دکھی ہوتی ہو تو روتی ہو ... خوش ہوتی ہو تو روتی ہو ... اور تمہارے یہ آنسو ہم مردوں کے لیے کبھی پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں ... کبھی ہمارا دل پگھلا دیتے ہیں۔"

"لو یو شہریار!"

"لو یو ٹو میری جان!"

☆☆☆

عارفہ کی فیملی امیگریشن کا معاملہ خوشگوار انجام پر پہنچ ہوا۔ اس کے کینیڈا مقیم بھائی نے اس سلسلے میں دامے درمے سخنے اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ امیگریشن ہو جانے کے بعد انہی نے عارفہ، اس کے شوہر اور بچوں کے کینیڈا پہنچنے سے قبل ہی ان کے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست بھی کر دیا۔ عارفہ بے پناہ خوش تھی اور اس کے بڑے بہن بھائی بھی جنہوں نے مصیبت اور آزمائش کے دنوں میں اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ وہ ان سب کی بھی ممنون تھی جنہوں نے اس کے مشکل وقت میں کسی بھی طرح سے اس کا ساتھ دیا تھا۔ مسز فیاض جنہوں نے اسے اس وقت مورل سپورٹ دی تھی جب وہ نفسیاتی انتشار سے دوچار تھی۔ وہی تھیں جنہوں نے اسے لوگوں کی باتوں سے ڈر کر ایک خول میں سمٹ جانے کے بجائے نڈر ہو کر سامنا کرنا سکھایا۔ مسز فیاض سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر انہوں نے اس سے انسانیت کا رشتہ نبھایا تھا۔ شہلا مسکین سے تو اس کی دور دور تک آشنائی نہ تھی مگر انہوں نے شایان کی دیکھ بھال میں اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا جب صبح کو اسے اپنی بہن یا بھائی کے گھر چھوڑنے اور اسکول سے واپسی پر لینے کے لیے جانا اسے نہایت مشکل لگ رہا تھا۔ شہلا مسکین شایان کو اپنے ہاں رکھنے کی ہامی نہ بھرتیں تو اسے کتنی مشکل ہوتی۔ ان سب کی ممنون احسان تو وہ تھی ہی رب کریم کی شکرگزاری میں اس کی آنکھیں بار بار نم ہونے لگتی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے وہ دل ہی دل میں کہتی ... شکر ہے میرے رب، پروردگار! مجھ گناہ گار، خطاکار بندی پر آپ کی بے حساب عنایتوں کا بہت شکریہ ... مہربانی میرے اللہ ... وہ دل ہی دل میں [illegible]

[illegible] شوہر اور بچوں کے ساتھ عارفہ کے کینیڈا جانے کا دن

کیا ہوا شہریار کی والدہ اور بھائی کا رویہ یکسر بدل گیا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ وہ دونوں اس کی طرف دیکھنے تک کے روادار نہ تھے۔ اپنا اپنوں سے طعن و طنز کے تیر چلاتے تھے، اب یہ عالم کہ آگے پیچھے پھرتے۔

"بھائی انہیں بھی بلانا ہے آپ نے۔" شہزاد کہتا۔

"ہاں ہاں ... کیوں نہ بلانے کی بھابی تھے۔ ایک ہی تو دیور ہے تو اس کا۔" ساس کہتی۔

"بلاؤ گی نا بھابی؟" شہزاد خوشامد کرتا۔

"کیوں نہیں شہزاد! جیسے ہی موقع ملا ضرور کوشش کروں گی میں بھی اور تمہارے بھائی بھی ... کیوں شہریار؟" عارفہ کہتی۔

"ہاں۔" شہریار اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔

ایک روز تنہائی میں اس سے بولا۔ "یار تم بہت عجیب ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" عارفہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"امی اور شہزاد نے تمہارے ساتھ کیا کیا اور تم کیا کر رہی ہو۔"

"کیا کر رہی ہوں؟" وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"شہزاد جب خوشامد میں لگا ہوتا ہے تمہاری کہ بھابی مجھے بلا لیجیے گا تو تم کتنی آسانی سے اسے آسرا دے دیتی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو کہتی ... کس منہ سے کہتے ہو تم مجھ سے یہ بات ... کیوں بلاؤں گی میں تمہیں ... کیا اپنی زندگی عذاب کرنے کے لیے۔"

عارفہ دھیرے سے مسکرا دی۔ "جل ککڑی عورتوں کی سی بات کیوں کروں میں۔"

"کیونکہ اس نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا حالانکہ تم نے مجھ سے اپنی زبان سے کبھی شکایت نہیں کی مگر میری آنکھیں اندھی نہیں تھیں۔ میں دیکھتا تو تھا اور سنتا بھی تھا کہ امی اور شہزاد تمہارے ساتھ کتنی زیادتی کرتے ہیں۔ شایان کو جب وہ منہ ساتا تھا، تم [illegible] سردی [illegible] گرمی میں اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھیں۔ امی [illegible] اپنے پوتے پر ہی۔"

"میں بھی اگر آج وہی کروں [illegible] تو پھر مجھ میں اور ان میں کیا فرق رہ [illegible]" عارفہ بولی۔

"میں نے کہا نا عجیب عورت ہو۔"

"مجبوری ... اب تو آپ کو اسی عجیب عورت کے ساتھ گزارہ کرنا ہوگا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

[illegible]

وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ [illegible] لوگ کتنے موقع پرست ہوتے

تھیں۔ چڑھتے سورج کے پجاری اور ابن الوقت۔ سیانوں کی کہاوت کے بموجب — جہاں دیکھے توا پرات وہاں گزارے ساری رات — نہ جانے کیوں گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتے ہیں لوگ۔

شہریار کی والدہ ان دنوں بر آتے جاتے اور محلے والوں کو یہ خبر سناتی پھر رہی تھیں کہ ان کی بہو، بیٹا اور ان کے دونوں بچے کینیڈا جا رہے ہیں — چلو کینیڈا کو کینیڈا کہہ کر ہی سہی انہوں نے بیٹے کی بیوی کو بہو تو تسلیم کر لیا تھا۔

☆☆☆

کینیڈا روانگی سے قبل عارفہ، مسز فیاض اور شہلا معین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دونوں سے ملنے گئی۔

"میڈم! میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔ آپ نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ جب بھی میرے امیگریشن کیس کے سلسلے میں مجھے اپنے کنسلٹنٹ سے ملنے کے لیے جانے کی ضرورت ہوتی تھی، آپ مجھے ہمیشہ شارٹ لیو دے دیا کرتی تھیں اور شایان کے سلسلے میں آپ نے مجھے اپنی فرینڈ شہلا آپا کی طرف سے جو سہولت دلوائی، آپ کے اس احسان کا تو میں ساری زندگی بدلہ نہیں اتار سکتی۔" مسز فیاض کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز شدت جذبات سے مضطرب ہوئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بس یا کچھ اور؟" مسز فیاض نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"آئی ایم رئیلی گریٹ فل!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نو نیڈ ڈیئر۔" مسز فیاض نے اس کا شانہ تھپتھپایا پھر بولیں۔ "تم خود اتنی اچھی رہیں عارفہ کہ تمہارے ساتھ اچھا ہی کرنے کو جی چاہتا تھا۔"

"جزاک اللہ میڈم!"

"اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں عارفہ جب ہم کسی کے ساتھ کچھ اچھا کرتے ہیں تو اس میں ہمارا کوئی وصف نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت سے ایسا ہوتا ہے۔ اللہ پاک جب اپنے کسی بندے پر مہربانی فرماتا اور اسے آسانی عطا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس بندے کے لیے دوسرے بندوں کے دل میں محبت ڈال دیتے ہیں۔ یہی محبت اللہ کے دوسرے بندوں کو اس بندے کے ساتھ کچھ اچھا کرنے کی توفیق دیتی ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ اچھا کرنے میں اچھا کرنے والے کا کوئی کمال نہیں ہوتا، توفیق اللہ دیتا ہے۔"

"آپ کتنی اچھی ہیں میڈم!"

"کتنی؟" مسز فیاض مذاقاً بولیں۔

عارفہ جھینپ گئی۔ "بہت — میڈم!"

"آئی وش یو اینڈ یور فیملی آل دی بیسٹ ان لائف!"

"تھینک یو میڈم! کبھی کینیڈا آنے کا پروگرام بنائیے گا۔"

"ضرور ان شاء اللہ۔"

"مل جائے گا میڈم! آپ لوگوں کو آسانی دیتی ہیں تو اللہ پاک آپ کو آسانی کیوں نہ دیں گے۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گی۔ کینیڈا آنا ہو تو آپ میرے پاس ہی ٹھہریے گا۔"

"اوکے..... اوکے ڈیئر!"

"وعدہ؟"

"وعدہ!"

مسز فیاض نے اسے الوداعی تحفہ بھی دیا۔ شہلا معین کے ہاں وہ مسز فیاض کے ہمراہ ہی گئی۔

"عارفہ! ہم بہت خوش ہیں بیٹا کہ تم جہاں جا رہی ہو، وہاں تمہیں ویلکم کرنے کے لیے تمہارے بھائی پہلے سے موجود ہیں۔" شہلا معین نے کہا۔

"جی آپا! اسی لیے میں بہت مطمئن ہوں۔"

"بہت محنت کی ہے تم نے اپنی فیملی کے لیے..... ان شاء اللہ پھل پاؤ گی۔"

"شکریہ آپا! آپ نے مجھے شایان کے سلسلے میں جو سپورٹ دی، اس کا بہت شکریہ۔"

"انسان ہی انسان کی دوا ہے بیٹا! سچی بات یہ ہے کہ میں تو تمہیں جانتی تک نہ تھی۔ کسی انجان کے بچے کی ذمے داری لیتے آدمی گھبراتا ہے لیکن مسز فیاض نے تمہارا مجھ سے اس طرح ذکر کیا کہ میں تمہارے بیٹے کو اپنے پاس رکھنے کو آمادہ ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ شایان کو تم جتنا عرصہ میرے پاس چھوڑتی رہیں، الحمدللہ خیریت رہی۔"

"آپ نے اس کا خیال بھی تو بہت رکھا۔ میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔"

"ہم نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری بیٹی ملک سے باہر رہتی ہے اور ورکنگ وومن ہے۔ آخر اس کے بچے کا بھی تو کسی نے خیال رکھا ہی تھا۔ بات یہ ہے بیٹا کہ جب ہم دوسروں کے مسائل کو اپنے پیاروں کے مسائل کے آئینے میں دیکھنے لگتے ہیں تو ہمارے دل میں دوسروں کے لیے [illegible]

"مجھے آسانی دینے کا بہت شکریہ آپا!"

"جیتی رہو — خوش رہو۔"

"رابطے میں رہوں گی آپا!"

"ہمیں اچھا لگے گا۔"

☆☆☆

بڑے بھائی بہنوں کی دعاؤں میں رخصت ہو کر عارفہ کینیڈا پہنچی تو وہاں موجود بھائی نے اسے، شہریار اور دونوں بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دو دن عارفہ بھائی کے گھر میں رہی پھر اپنے گھر منتقل ہو گئی۔ بھائی کے لیے اس کے روئیں روئیں سے دعا نکلی۔ اتنا چاہنے والا بھائی خدا ہر بہن کو دے۔

"عارفہ! یہاں ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کی نہ کسی کو عادت ہوتی ہے نہ فرصت۔ یہاں حکومت اپنی رعیت کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہمارے اپنے وطن کی طرح حکمرانوں کی کوئی لوٹ مار، کوئی لوٹ کھسوٹ اور عوام کے مسائل سے بے پروائی نہیں۔ عام افراد کی بنیادی ضرورتیں کا حتی پوری ہوتی ہیں۔ تعلیم اور صحت کا نظام عمدہ ہے، انصاف کی حکمرانی ہے، خطا کار امیر ہو یا غریب، یکساں قانون کی گرفت میں آتا ہے۔ تعلیم اور صحت ہر فرد کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی — کوئی کمی محسوس نہیں کرو گی سوائے ایک بات کے — اپنوں کی کمی۔" بھائی نے عارفہ سے کہا۔

"بھائی! آپ ہیں نا یہاں میرے اپنے۔" عارفہ بولی۔

"ہاں، تمہارے آنے سے مجھے بھی اپنوں سے دوری کے احساس میں کمی محسوس ہو رہی ہے۔" بھائی نے کہا۔

"ہم دونوں مل کر کوشش کریں گے اپنے اور لوگوں کو بھی یہاں بلانے کی۔" عارفہ پرجوش لہجے میں بولی۔

"ان شاء اللہ!"

"یہاں آنے کا ایک مضبوط امیدوار تو ہماری بیگم صاحبہ ٹاپ آف دی لسٹ چھوڑ آئی ہیں۔" شہریار جو دونوں بھائی بہن کی باتیں سن رہا تھا، عارفہ کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"کون؟" بھائی نے سوالیہ نظروں سے عارفہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شہزاد..... ان کا چھوٹا بھائی۔"

"آئی سی۔" بھائی نے اپنا ہاتھ شہریار کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "خود کو مضبوط بنانے کے لیے اپنوں کا ہاتھ تھامنا ضروری ہوتا ہے شہریار! دیکھو، پاکستان تو ہمارا وطن ہے، ہماری محبت ہے، ہماری اصل پناہ گاہ ہے۔ وہاں [illegible]

جانے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا لیکن بہتر معاشی حالات اور بہتر معیار زندگی کی تلاش میں ہمیں کبھی کبھی اپنے وطن سے دور جانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ دوسری سرزمین پر پہنچ کر ہم جتنے بھی ہم دوسروں کا ہاتھ بھی تھامنے کی کوشش کریں۔ اس سے ہم خود ہی مضبوط نہیں ہوتے، ہمارا وطن بھی اس زرمبادلہ سے مستحکم ہوتا ہے جو ہم یہاں بچت کر کے وہاں بھیجتے ہیں۔"

"بشرطیکہ لوٹ مار کرنے والوں سے بچ جائے۔" شہریار نے تلخی سے کہا۔

"کب تک؟ کب تک شہریار —! ایک دن یوم حساب بھی تو ہے۔"

شہریار نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"بھائی! آپ نے بہت محنت کی ہے اپنا، اپنے بچوں اور ہمارا بھی مستقبل بنانے کے لیے۔ ایک اور ایک دو نہیں، گیارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ہمارا ہاتھ تھاما ہے — اب شہریار اور میں بھی اوروں کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کریں گے۔ بھائی! آپ بتائیں ہم دونوں کو کہاں کہاں اور کیسے اپنے لیے جاب تلاش کرنا چاہیے۔" عارفہ پردیس میں نئی زندگی کے آغاز کے لیے نہایت پرجوش نظر آ رہی تھی۔

بھائی کی جانب سے کوئی جواب ملنے سے پہلے ہی شہریار نے عارفہ کو محبت اور ممنونیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاب اب صرف [illegible] تم نہیں کرو گی۔"

"کیوں؟" عارفہ نے چونک کر شہریار کو دیکھا۔

"کیونکہ تم اپنی ہمت سے بھی بڑھ کر پاکستان میں کام کر آئی ہو۔ صبح نوکری، شام کو ٹیوشنز، گھرداری، بچوں کی پرورش — تم نے تو اپنے حصے سے بڑھ کر کام کیا ہے۔ اب تم گھر اور بچے سنبھالو گی بس!"

عارفہ ہنسنے لگی۔

"اگر تمہیں کام کرنے کا شوق ہے ہی تو کام تو تم گھر بیٹھ کر بھی کر سکتی ہو۔" بھائی نے عارفہ کو ہنستے دیکھ کر کہا۔

"ورک فرام ہوم!" عارفہ چہکی۔

"ہاں، اب تو یہ ٹرینڈ عام ہو گیا ہے۔"

"سلائی اچھی کر لیتی ہوں میں۔ بوتیک شروع کروں گی۔" عارفہ بولی۔

"ابھی تو تم آئی ہو۔ دیکھنا کتنے آپشنز ملیں گے تمہیں۔" بھائی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

[illegible]

"ہوسکتا ہے پھر ایسا وقت آئے... ہم دونوں ہی گھر میں رہ کر کام کر رہے ہو۔" بھائی نے کہا۔
"پھر تو بہت ہی مزے کی بات ہوگی بھائی!"
"آئی وش یو بوتھ اے ونڈرفل لائف ہیئرز۔" بھائی نے کہا۔
"تھینک یو بھائی... اسو نائس آف یو... آپ ہی کی وجہ سے ہم یہاں پہنچے ہیں۔" عارفہ شدت جذبات سے مغلوب ہوئی۔
"نہیں عارفہ! صرف خدا کی مہربانی ہے۔" بھائی نے نہایت انکساری سے کہا۔
بھائی کے جانے کے بعد عارفہ اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کرکے مڑی تو شہریار کو اپنے روبرو پایا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
"ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" عارفہ اس کے بالکل نزدیک جا رکی۔
شہریار نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یاد ہے ہماری شادی کے بعد تم نے مجھ سے پوچھا تھا... آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟"
عارفہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ "ہاں... مجھے ہے... اور مجھے آپ کا جواب بھی یاد ہے۔"
"آج تمہارے اس سوال کا سچ سچ جواب دے کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔
عارفہ اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگی۔
"سوری! آج پھر اس شخص کا نام اپنی زبان پر لا رہا ہوں۔" شہریار نے توقف کیا اور اپنی نظریں بدستور عارفہ کے چہرے پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ "نعیم تو تھا ہی کمینہ... کچھ بدفطرت میں بھی تھا۔"
عارفہ کی نگاہوں میں حیرت ڈولنے لگی۔
"تمہارے بارے میں نہ صرف تمہارے آس پاس کے گھروں میں بلکہ آگے پیچھے کی گلیوں میں بھی یہ بات اڑی ہوئی تھی کہ فلاں گھر کی لڑکی شادی کے چند دن بعد ہی میکے اس لیے آبیٹھی ہے کہ شادی سے پہلے اس کا تعلق... تھا۔ میں نے کہا نا، کچھ بدفطرت میں بھی تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں تو وہ کون ایسا شخص ہے کہ ایک لڑکی شادی کے چند دن بعد ہی جس کی خاطر اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ کر بدنامی سر پہ لیے اپنے خاندان کو بھی رسوا کر کے اپنے گھر آبیٹھی ہے... تمہیں شاید وہ

ہو... تمہیں آزمانے کے لیے میں کچھ دن تمہیں گمنام نمبر سے میسجز بھی کرتا رہا تھا اور تم نے کبھی ریسپانڈ نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا الٹی چلتی لڑکی ایسے میسجز کے جواب میں بھی تو ریسپانڈ کرتی ہی ہے اور کچھ نہیں تو تنگ کرنے والے کو سخت سست تو کہہ ہی دیتی ہے۔ شریف لڑکی بگھیڑے مردوں کی خباثتوں پر خاموشی اختیار کر لینا بہتر سمجھتی ہے۔"
عارفہ مزید حیران ہوئی۔
"پھر میں اسکول جاتے ہوئے کئی روز تمہارا تعاقب کرتا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کس سے ملتی ہو مگر تم گھر سے نکل کر ناک کی سیدھ میں اپنے اسکول چلی جاتی تھیں۔ تمہارے چہرے کی اداسی اور مرے مرے قدموں نے میرا دل پکڑ لیا۔ اللہ پاک نے میرے دل میں ڈالی کہ مجھے تم سے شادی کرنا چاہیے۔ امی اور بھائی نے بہت مخالفت کی مگر اللہ کی رضا ان کی مخالفت پر غالب رہی۔ شادی کے بعد بھی میں تمہاری لاعلمی میں تمہیں آزماتا رہا۔" عارفہ چونکی۔
"ہاں، میں نے اپنی امی سے سنا تھا کہ شوہر اپنی بیوی کو پیسا دے کر آزماتا ہے، وقت دے کر پرکھتا ہے۔ میں غریب آدمی تھا۔ پیسا تو میرے پاس تھا نہیں۔ میں نے تمہیں وقت دے کر آزمایا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، میں تمہارے کردار کی مضبوطی کا اسیر ہوتا چلا گیا۔"
"آئی ایم رئیلی شاکڈ شہریار...! تو آپ نے اپنے اس ایڈونچر کے لیے کی تھی مجھ سے شادی؟" عارفہ حیرتوں میں غوطہ زن تھی۔
"سوری یار! اپنی کمینگی کی معافی چاہتا ہوں لیکن جانتی ہو اس ایڈونچر کا حاصل کیا ہے؟" اس نے اپنی انگلی سے اس کی ناک کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا۔
وہ اسے ٹکٹکی دیکھے گئی۔
"آج اگر ساری دنیا بھی یہ کہے کہ شہریار تیری بیوی اچھی لڑکی ہے تو میں سینہ تان کر کہوں گا... تم کیا جانو وہ کیسی ہے... وہ میرا مان ہے... میرا ایمان ہے... میری عزت ہے... میری محبت ہے... میری زندگی ہے... میں اس سے سچا پیار کرتا ہوں۔" وہ بولتا ہی گیا۔
"بے ایمان!" عارفہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا اور اپنا سر اعتراف جرم کرنے والے مجرم کے سینے پہ ٹیک دیا... یہ زندگی ہے اور زندگی میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم کا گریبان پکڑنے کے بجائے اس کی بانہوں میں پناہ کا احساس ملتا ہے۔

***

قرشی
توت سیاہ سے
NO کھڑکھڑاہٹ...
ONLY مسکراہٹ!
گلے کی خراش اور درد کے لیے مؤثر
قرشی
شربت توت سیاہ
Enlisted
www.qarshi.com | www.qarshihealthshop.com
QarshiNaturalHealth